محمد عبدہ

اور

پان اسلامزم

مرتبہ

حسن الاعظمی (من علماء الازہر مصر)
سابق پروفیسر مصری یونیورسٹی قاہرہ

فاران لمیٹیڈ - کراچی

سلسلۂ تصانیف رابطۂ تالیف و ترجمہ ع ۲۷

باراول: ــــــــ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۸ء
تعداد: ــــــــ ایک ہزار
مطبوعہ: ــــــــ فیروز سنز۔ کراچی
قیمت: ــــــــ چار روپیہ آٹھ آنہ

اِنتساب

علّامہ طنطاوی جوہری مفسّر قرآن کے نام۔
جنھوں نے تحریکِ اُخوتِ اسلامیّہ مصر
میں نمایاں حصّہ لیا۔
اور مجھے اپنا روحانی فرزند بنانے کا
شرف عطا کیا۔

"حسن الاعظمی"

محتویات

حرف آغاز

عربی اُردو لغت اور چند دیگر عربی درسی کتب کی بہ تعجیل اشاعت کی غرض سے اوائل ۱۹۴۴ء میں مجھے لاہور چھوڑ کر حیدر آباد دکن کا سفر کرنا پڑا کیونکہ اس زمانہ میں لاہور میں کاغذ قریب قریب مفقود ہو چکا تھا۔

حیدر آباد پہنچکر ایک دار النشر بنام "ادارۂ معارفِ اسلامیہ" قائم کر کے نشر و اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا جس کے ابتدائی دور میں دو قسم کی کتابیں خاص طور سے ملحوظ رہیں۔

اول مصر وغیرہ میں مروّجہ جدید اسلوب کی ایسی کتابیں جن کی امداد سے طالب علم کو کم سے کم مدت میں عربی بولنے

لکھنے اور صحیح پڑھنے کی قدرت حاصل ہو جائے۔

دوم ممالک اسلامیہ کے مشہور زعماء کی سیرتوں کو عربی، ترکی اور ایرانی زبان سے اُردو میں ترجمہ کرنا جس کے سلسلے میں علاوہ اور کتب کے "مجاہد مراکش" (امیر عبدالکریم ریفی) اور علامہ مفتی محمد عبدہ اور پان اسلامزم" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ "شرعی پردہ" "آج کا مصر" وغیرہ جیسی کتابیں بھی وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔

اس ادارے نے حیدر آباد میں اپنے ہمہ گیر مقاصد کو سامنے رکھ کر سرگرمی سے کام شروع کیا ہی تھا کہ بدقسمتی سے ہندوستان کی سیاسی بے چینیاں ایک آگ کی طرح ملک کے طول و عرض میں پھیلنی شروع ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادارے کے راہ میں بھی طرح طرح کے موانع پیش آنے لگے اور یہاں کا مستقبل خصوصاً اس ادارے کے حق میں غیر محفوظ تصور کر کے اسے کراچی منتقل کرنا پڑا جس میں ایک

کثیر رقم صرف ہوئی۔ اور یہاں آکر ایک جدید عملے کی تشکیل کرنی پڑی۔ اس پر سے مستزاد یہ کہ مکانات کی کمیابی کے باوجود ادارے کے لئے ایک موزوں مکان کی جستجو تھی۔ لیکن بہرکیف ان مشکلات پر کسی نہ کسی طرح قابو حاصل کر کے ادارے کا قیام پھر عمل میں آگیا اور خدا کا شکر ہے کہ حکومت پاکستان کی اہم ترین ہستیوں نے اس کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے دلچسپی لے کر اس کو چار چاند لگادیا ہے اور ادارہ کئی گنا زیادہ ہمت و حوصلہ سے اپنے مقاصد میں حسب اقتضا اہم ترین اور بیش بہا اضافے کے ساتھ دوبارہ کام کرنے لگا اور ضروری تصنیف و تالیف کے علاوہ اسلامی بین الاقوامی زبان یعنی عربی کی اشاعت کی تحریک نیز تحریک اخوت اسلامیہ کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کر لیا ہے۔

اس ادارے کو عوام سے "فاران لمیٹڈ" کے نام سے روشناس کرایا گیا ہے۔ فاران نے اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب " مقالات مفتی محمد عبدہ" جو پان اسلامزم

کے موضوع پر ہے پیش کی ہے۔ دوسری کتاب "آزاد مصر" بھی
زیر طبع ہے۔ جو انشاء اللہ بہت جلد ناظرین کی اسلامی معلومات
میں دلچسپ اضافے کا موجب بنے گی۔

مقالات مفتی محمد عبدہ کو عربی مصادر سے رابطۂ تالیف
و ترجمہ "حیدر آباد کے ایک سرگرم رکن حکیم عبد الوہاب صاحب
ظہوری سے ترجمہ کرایا گیا ہے جو بہت سی ضروری ترمیمات
کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں علامہ ممدوح کے تبحر علمی کا ایک رخ۔
آپ کا بیباک اجتہاد و استنباط۔ اسلامی رسوم پر بے لوث
اور قیمتی علمی آراء۔ مختلف فیہا مسائل پر آپ کے آزادانہ
اور ناطق فیصلے پیش کئے گئے ہیں۔

مرحوم نے اسلامی مسائل پر جس وسعت نظری اور بیباکی
سے بحث کی ہے اسلامی تاریخ باید و شاید ہی کوئی دوسری ایسی
جرأت آموز نظیر پیش کر سکتی ہے۔

آپ کے آراء و خیالات پر علامہ جمال الدین افغانی کی تعلیمات

کا پورا پورا پرتو نظر آتا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ آپ علامہ
جمال الدین کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ علامہ کی مشہور
تحریک پان اسلامزم یا بالفاظ دیگر اسلام کی اپنے جملہ
ظاہری ومعنوی اوصاف واستحکامات کے ساتھ اپنے
مرکز ثقل کی طرف مراجعت۔ یا ہر قوم ونسل کے فرزندان
اسلام کا اسلام کے اصلی مرکز کی طرف لانے کی جدوجہد
درحقیقت ایک ایسی عظیم الشان جدوجہد ہے جو ملت
کی تخریبی فرقہ بندی کا قلع قمع کر کے افراد کو ایک
ٹھوس مرکز پر جمع کر دیتی ہے جس کے پس پردہ ایک ایسا
خوش گوار انقلاب پوشیدہ ہے جس کے تصور سے
آنحضرت کے آنکھ موند لینے کے بعد سے اب تک امت
مرحومہ کو کبھی محظوظ ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لاریب
یہ تحریک علاج ہے امت کے سب سے خطرناک
مرض تشتت وافتراق کا جس کا لازمی نتیجہ محکومی و
غلامی ہے۔ یہ تحریک پیغام ہے تالیف قلوب۔ اخوت

بین المسلمین اور اخلاص و مودت کا جس کے بغیر انسانیت کبھی اپنے منتہائے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ تحریک تفسیر ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کی جس کی تلقین اللہ جل شانہ اپنے قرآن کی زبان سے مسلسل کرتا چلا آرہا ہے۔

مفتی محمد عبدہ اس تحریک کے بانی علامہ جمال الدین افغانی کے جیسا کہ عرض کیا گیا ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ قابل استاد نے ذہین شاگرد کو اپنی بے مثل تحریک کی روح میں ایسا رنگ دیا کہ اس نے اس کٹھن منزل کے لئے پوری طرح زمین ہموار کر کے ہی دم لیا۔ اور جب تک زندہ رہے خداوندان ملک و قوم کے پیدا کئے ہوئے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے قوم کی ہمہ وقت اصلاح فرماتے رہے اور ہم عصر علماء کو اپنے عندیوں سے روشناس و مانوس کرتے رہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کیا کہ آپ نے اپنے شاگردوں میں سے ایسے ایسے جلیل القدر علماء تیار کئے

جن کا سینہ آپ کی تحریک کے نور سے منور تھا جو باد مخالف کے مقابلہ میں برق کی طرح کوندے اور شمشیر براں کی طرح بے نیام ہوئے۔ نہ اُن کا دِل تنگ نظر علمائے کے انبوہ سے ہی دہلا نہ حکومت کی کج نگاہی سے۔ انھیں نہ تو کوئی لالچ ہی اپنی منزل سے روگرداں کر سکا نہ کسی لومۃ لائم سے ہی افسردہ خاطر ہوئے۔ وہ بے خوف تبلیغ کرتے رہے اور بے دھڑک اپنے ضمیر کی آواز لوگوں کو سُناتے رہے۔ جو دل اس پیغام کے متحمل ہو سکے اُسے اپنے سرد آنکھ سے لگایا اور اپنے میں جذب کر لیا۔ اور جو اس جلوۂ بے محابا کی تاب نہ لاسکے لرز گئے۔ رجعت قہقریہ اختیار کی اور اک عالم دیوانگی میں سر نوچنے لگے۔

ترقی پذیر عرب ممالک کے زعماء کی اکثریت درحقیقت انھیں بزرگوں کی معنوی فرزند ہے۔ اور آج کا جدید مصر بھی جو ایک دلفریب قالب میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے انھیں پُرعظمت ہستیوں کے افکار کا رہین منت ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ سب سے پہلے ہم اس بیش بہا جوہر کو اُردو کا جامہ پہنا کر ممالک اسلامیہ کی سب سے بڑی مملکت میں وسیع سے وسیع پیمانہ پر اشاعت کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

"حسن الاعظمی"

جنرل سکریٹری رابطہ تالیف و ترجمہ پاکستان

و پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن

و ناظم اعلیٰ جماعت الاخوت الاسلامیہ پاکستان
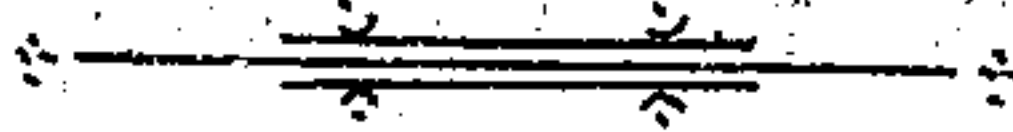
مقدمہ

از صاحب المعالی فضیلۃ الشیخ مصطفیٰ پاشا عبدالرازق
شیخ الجامعۃ الازہریۃ (مصر)

میں گذشتہ جنگ کے زمانے میں جامعہ مصریہ کی ایک محفل میں حاضر ہوا، اس وقت تک یہ جامعہ وزارت معارف میں ضم نہیں ہوا تھا اس محفل میں نوجوانان علم کا ایک بڑا گروہ جمع ہوا تھا جس میں بڑے بڑے ادیبوں اور پروفیسروں نے تقریریں کیں۔

مقررین کی زبانوں پر مصر کے ارتقاء جدید کے اماموں کا ہنگامہ خیز تذکرہ ہوتا تھا اور ان کے سیاسی، اجتماعی اور علمی مختلف شعبوں پر روشنی ڈالی جا رہی تھی، مجمع کی زبان پر تحسین و آفریں کے نعرے رواں تھے اور نوجوانوں کے دلوں میں عجیب جوش اور ولولہ کی روح بیدار ہو جاتی تھی، جب شیخ محمد عبدہ کا تذکرہ ہوا تو نوجوانوں کے یہ نعرے ٹھنڈے پڑ گئے اور ولولۂ تحسین سرد۔

میں اس وقت غمگین و کبیدہ خاطر لوٹا، میں ایسے ملک کو بیوفائی کا الزام دے رہا تھا، جس میں چند سال کے بعد شیخ محمد عبدہ کی قدر و منزلت کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ بے رخی لطف آمیز تھی، کیونکہ یہ محمد عبدہ کی ہستی کے

کسی کارنامہ سے واقف نہیں تھے، جو انھیں ان سے محبت کرنے پر آمادہ کرتا اور وہ کما حقہ ان کی قدر و منزلت کر سکتے؛

اس دور کے طالبان علم کی شاید امام کے کارناموں کے متعلق انتہائی معلومات صرف اس حد تک تھیں، کہ وہ ایک ایسے شخص تھے جن کو اور ان کے آراء کو شیوخ و اساتذہ نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسا کہ یہ شیوخ المنار اور مدیر المنار کو جو امام کے تلمیذ تھے، ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔

یہ خیالات میرے دل و دماغ پر چھا گئے اور انھوں نے مجھے آمادہ کر دیا کہ میں شیخ محمد عبدہ کی سیرت و کردار کو آپ کے زندہ جاوید آثار حیات، اور انقلابی کارناموں کو اور آپ کے سیاسی اور اصلاحی آراء و مساعی کو تقریر و تحریر کے ذریعہ عالم آشکار کروں،

اس زمانے میں جامعہ شعب (Public university) کا قیام عمل میں آیا تھا جس کی تشکیل کی کوشش روسی مندوب کاﻧﭧ دہ برزورنے کی تھی، یہ شخص زندہ دل اور وسیع النظر، وجیہ تھا اور اس کا شمار ارباب علم و ادب میں ہوتا تھا، اس کے حلقہ میں اجنبیوں اور مصریوں کا ایک گروہ جمع ہو گیا تھا ان سبھوں نے ملکر مختلف زبانوں میں شبینہ محاضرات و دراسات کا انتظام کیا اور ان اشخاص کے لئے بلند ثقافت اور فنی ذوق کے اسباب فراہم کئے، جو اپنی زندگی کے مشاغل کیوجہ سے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں باقاعدہ درس حاصل نہیں کر سکتے تھے، نیز ان شبانہ محفلوں نے اجنبیوں اور مصریوں کے مابین فکری و ذوقی رابطہ اتصال پیدا کر دیا۔

اس جامعہ نے اپنے مقاصد میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی، جب کاﻧﭧ دہ برزور مصر سے چلا گیا اور ۱۹۱۹ء کا انقلاب رونما ہوا تو جامعہ شعب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور زمانے نے اس کی یاد بھی دلوں سے فراموش کر دی۔

جامعہ شعب میں جس کی مجلس ادارت کا علی یک بہجت مرحوم کے ساتھ میں بھی ایک رکن تھا، میں نے استاد شیخ محمد عبدہ کی سیرت پر محاضرات (لکچروں) کا ایک سلسلہ پیش کیا، جن میں میں نے محمد عبدہ کے اخلاق، تعلیمات، تصانیف، اصلاحی افکار اور رجحانات کی صحیح تصویر کھینچتے ہوئے اُن عناصر و عوامل کو بیان کرنے میں سعی کی جنھوں نے مذکورہ بالا امور کی تخلیق و تکوین میں اہم حصہ لیا اور آپ کی تعلیم و تربیت اور نشوونما میں اثر انداز رہے۔

میں اپنے محاضرات سے فارغ ہوا ہی تھا۔ کہ جامعہ شعب کو حادثات نے آگھیرا، میں نے ۶ مارچ ۱۹۱۹ء کو اس میں آخری لیکچر دیا، یہ محاضرات میرے پاس ہی تھے، ان کی اشاعت کی نوبت نہ آئی، ان کا تذکرہ ہماری اس کتاب میں، جو جامعہ شعب کے بجائے جامعہ مصریہ کی طرف منسوب ہے، بار بار آچکا ہے۔

ان محاضرات کو میں نے اب تک شائع نہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے اس کے چند ابواب مختلف جرائد و رسائل میں شائع کئے جو استاد محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کے اصلاحی خیالات و آراء سے متعلق تھے، مسیو برنارمیشل کے ساتھ رسالۃ التوحید کا فرانسیسی ترجمہ نشر کیا، نیز میں نے سید جمال الدین کی تاریخ اور آپ کے زمانے کے متعلق چند مباحث نشر کئے،

مجھے اپنے جوش شباب سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ میں نے محمد عبدہ کے ذکر اور آپ کے علوم و آثار کو اپنے امکان بھر اجاگر کر دیا ہے، ممکن ہے کہ میری اس جد و جہد کے باوجود اُن آثار کو اوجھل کر دیا ہو، جن کو زمانے نے تاریخ کے عرفانی صفحات پر نقش کر دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ محمد عبدہ نے ازہر اور ازہر کے علاوہ دیگر مقامات میں جو روحانی چنگاریاں فروزاں کی تھیں، وہ رفتہ رفتہ شعلہ کی شکل اختیار کر رہی ہیں

آپ کے دونوں ہاتھوں نے فکری حریت اور اصلاح کی جو تخم ریزیاں کی تھیں وہ ہر طرف نشو ونما پا رہی اور پھل پھول رہی ہیں، یہ وہی تخم ریزیاں ہیں جن کی طرف قاسم بک امین نے اپنے ایک تعزیت نامہ میں اشارہ کیا ہے،

"آپ کو اپنی امت کی اصلاح میں جو آرزو تھی، اس کو کوئی چیز متزلزل نہیں کرسکتی تھی، آپ کو پختہ یقین تھا، کہ ہماری شاداب و زرخیز سرزمین میں جب صالح اور پاک تخم بویا جائے گا تو وہ نشو ونما پائے گا، بار آور ہوگا بالکل اسی طرح جیسا کہ اس میں فساد کی تخم ریزی نے نشو ونما پائی اور ناخوشگوار پھل پھول لائے، اسی لئے آپ اپنے دونوں بھرپور ہاتھوں سے صالح افکار، نیک جذبات وخیالات اور مفید تعلیمات کا وہ تمام ذخیرہ لٹاتے رہے جن کو آپ نے اپنی زندگی میں جمع کر رکھا تھا"

اب جبکہ محمد عبدہ کی وفات پر تیس سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے تو لوگ یہ محسوس کرنے اور جاننے لگے ہیں، کہ مصر کی تعمیر جدید میں آپ کا زبردست ہاتھ ہے آپ کی یہ یادگار زندہ جاوید رہے گی، جس کا درس دیا جائیگا، اس پر تنقیدیں کی جائیں گی، تبصرے کئے جائیں گے مختلف مصنفین اور مفکرین آپ کے کارناموں پر توجہ کریں گے کسی نے اسی کے متعلق لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے" محمد عبدہ موجودہ زمانے کے طرز کی ایک ہستی نہیں شمار کئے جاتے ہیں آپ کی جدت طرازی اور باریک بینی میں ایک مرعوب کن پیرایہ پایا جاتا ہے.....

محمد عبدہ نے علم وحکمت اور دین کے بارے میں جس قدر آرا ونظریات پیش کئے ہیں وہ تمام کے تمام زمانے کے بہت بعد کی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں، اسکی وجہ یہ نہیں کہ ان کو دیرینہ عہد میں پیش کیا گیا بلکہ یہ تمام مشرقیوں کے حال سے ان کی بلند آہنگ آزادی کی جدوجہد میں ہم آہنگ نہیں بنیں"

③ کوئی کہتا ہے:

"مسلمانوں کے علماء و مفکرین نے مختلف حالات و ادوار میں اہل یورپ کے تعصب زدہ اشخاص کے خیالات کی تردید کی کوشش کی شیخ محمد عبدہ کا نام ان علماء کے صفحات میں سرورق پر لکھے جانے کے قابل ہے۔ لیکن ان علماء نے اپنے فریق مخالف کے مقابلہ میں اپنی حجت و دلیل کو قوی کرنے کے لئے وہ علمی طریقہ اختیار نہیں کیا، جس کو اختیار کرنے کا دعوی مغربی مورخین اور مصنفین کو ہے، اس کے علاوہ ان مسلمان علماء پر جن کے پیش رو شیخ محمد عبدہ ہیں، الحاد کفر اور زندقہ کے الزامات عائد کئے گئے، جنھوں نے دشمنان اسلام کے رد پر ان کی دلیل و حجت کو کمزور کر دکھایا۔"[1]

علامہ سید رشید رضا مرحوم سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے متعلق فرماتے ہیں:

④ "ان میں سے ہر ایک دانا و عاقل تھا، سید جمال الدین کی شخصیت سراپا دینی تھی اگرچہ آپ پر سیاسی رنگ غالب تھا، شیخ محمد عبدہ سیاسی شخص تھے، اگرچہ آپ پر دینی اثر کا غلبہ تھا، بلکہ آپ اپنے استاد کی بہ نسبت دینی و دنیوی ترقی پذیر اشخاص کے مابین اوسط مقام کی طرف زیادہ قریب تھے"[2]

استاد اکبر محمد مصطفے المراغی فرماتے ہیں:

⑤ "میرا خیال ہے کہ جب ہم نیکوکار اسلاف کے دور پر عبوری نظر

---

[1] کتاب حیاۃ محمد صفحہ ۱۵ [2] تاریخ الاستاد الامام جلد ا۔

ڈالتے ہیں، تو ان میں ست سوائے امام محمد عبدہ کے کوئی ایسا شخص
نظر نہیں آتا، جس کو قرآن کی رہنمائی میں فہم و بصیرت عطا ہوئی ہو
اور اجتماعی و عمرانی مطالب کی باریکیوں کے لئے اس کا سینہ کشادہ ہو
قدرت نے محمد عبدہ کو جس طرح دنیوی امور میں عقل و دانائی اور فہم و
ادراک عطا فرمایا تھا، اسی طرح آپ کے اندر دینی امامت کے
شروط بھی ودیعت فرمائے تھے[1]"

آدمس یوں رقمطراز ہے:۔

" اگر ہم یہ دعویٰ کریں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جدید مکتب خیال کی پیداوار
اور اس کا ذاتی وجود استاذ الامام کا رہین منت ہے نیز یہ کہ جدید
اسکول نے اپنے اکثر و بیشتر جوہری امور میں آپ ہی سے کسب فیض
کیا ہے اور آپ ہی کے سرچشمۂ اثر سے سیرابی حاصل کی ہے[2]"

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کے یہ وہ قابل یادگار مظاہر ہیں جن پر ہمیں رشک
ہوتا ہے کیونکہ یہ اس امر کی دلیل و برہان ہیں کہ ایسی بلند و بالاتر ہستی کو سمجھنے
اور آپ کے آراء و خیالات کی تحقیق و تفتیش کے لئے ارباب فہم و بصیرت کو دعوت
دیتے ہیں یہ امر مسلمہ ہے کہ تمام کے ادراکات اور فہم و بصیرت کے مراکز یکساں
نہیں ہیں، مفکرین کے زاویۂ نظر میں اختلاف ناگزیر ہے، جو شخص ہمارے استاد
کے آراء و نظریات پر صحیح تنقیدی نگاہ ڈالے گا تو وہ ہمارے نزدیک ایسے ہی
شکریہ کا مستحق ہے، جیسا کہ کوئی صدق دل سے ان کی تائید کرتا ہے، یہ دونوں کے
دونوں اس حریت فکر اور اصلاحی دعوت کی خدمت کرتے ہیں جس کو شیخ محمد عبدہ

---

[1] تاریخ الاستاذ الامام ج ا صفحہ ۳۰۲
[2] الاسلام والتجدید فی مصر صفحہ ۲۶۲

نے پیش کیا اور اس کے لئے نہایت مخلصانہ جد و جہد کی، اسی کا احیاء و ارتقاء ہمارا فرض ہے۔

شیخ محمد عبدہ کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے آخری تالیف وہ ہے جس کو ڈاکٹر چارلس آدمس نے "الاسلام والتجدید فی مصر" کے نام سے (انگریزی میں) لکھی ہے، یہ کتاب مصنف کے الفاظ میں:

"مصر میں جدید اصلاحی تحریکات کی نشو و نما اور ان کی تدریجی تبدیلیاں کو پیش کرتی ہے ان کے اثرات کے پھیلاؤ کا اندازہ کرتی اور ان تعلقات و روابط کو ظاہر کرتی ہے جو شیخ محمد عبدہ کے آراء و نظریات اور "کتاب الاسلام و اصول الحکم" کے مصنف جس کی کتاب کو ہم نے انگریزی میں منتقل کیا ہے، اور مصر کے ان جدید مصنفین کے معتقدات و خیالات کے مابین تھے جو آپ کے معاصر تھے"

مولف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ جو "کتاب الاسلام واصول الحکم کا انگریزی ترجمہ ہے جو متعدد اسباب کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا خوش قسمتی سے ان متعدد اسباب نے پہلے حصہ کو نشر کرکے قارئین کو مستفید ہونے سے محروم نہ رکھا۔

مصنف خود اپنی کتاب کا حال اس طرح بیان کرتا ہے :-

"ہم یہ دعوٰی نہیں کرتے، کہ یہ کتاب محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کے ان حقائق کو پیش کرتی ہے، جن کا انکشاف اس سے پہلے نہیں کیا

گیا، تاہم اگر ہم یہ تسلیم کریں، تو حق بجانب ہوگا کہ یہ کتاب
اپنے مکمل نقش و نگار اور اپنی نمایاں تصویریں پیش کرتی ہے۔
نیز اس نے آخری انقلابات اور تحریکات کو جس نوعیت سے
بیان کیا ہے، وہ ایک مستقل اور منفرد چیز ہے"۔

پروفیسر چارلس آدمس کی کتاب کی یہ صحیح تعریف ہے اگرچہ اس میں
تواضع پسندی ہے، جو ان مشقتوں اور کوششوں کی پردہ داری کرتی ہے
جنھیں مصنف نے شیخ محمد عبدہ کی تاریخ اور آپ کے آراء و معتقدات کی
تشریح کے لئے معروف ماخذوں کی طرف رجوع کرنے میں برداشت کی اور
ان کو علمی سلامت روی کے ساتھ تنقید و تبصرہ کیا ہے،

بعض قارئین ایسے ہوں گے، جو بعض احکام و شواہد کو اپنے آراء کے
مخالف پائیں گے، گاہے ان کو تاریخی اور غیر تاریخی من گھڑت چیزیں نظر آئیں
گی، لیکن اس کتاب کو پڑھنے والا شخص محسوس کرے گا، کہ اس کتاب کے
مصنف نے وسیع تحقیق و تفتیش کی ہے اور مباحثہ و فیصلہ میں انصاف و رواداری
کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب کو پیش لفظ اور دیباچہ سے شروع کیا ہے
پیش لفظ کتاب کی ترتیب کی اور اس کے فکری آغاز کی تاریخ ہے

مقدمہ ان وجوہ و اعتبارات کا آئینہ دار ہے، جنھیں مصنف نے
مضامین کی تقسیم و ترتیب میں ملحوظ رکھا ہے۔

اس کے بعد کتاب دس ابواب پر منقسم ہے

پہلا باب سید جمال الدین افغانی اور آپ کے اخلاقی آراء و نظریات
کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد شیخ محمد عبدہ کی تاریخ میں چھ تفصیلی ابواب ہیں۔
کتاب کے بقیہ ابواب کا تعلق شیخ محمد عبدہ کے اثر آپ کے تلامذہ پر اور آپ کی وفات کے زمانے سے اب تک کی اصلاحی تحریکات کی رفتار سے ہے۔

جب عباس آفندی محمود نے مجھے اطلاع دی کہ انہوں نے اس کتاب کو اصل انگریزی زبان سے عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے، اور میں نے ان کے اس ترجمہ پر قابل رشک اقدام کا مشاہدہ کیا، تو مجھے گذشتہ سالوں کی یاد آگئی، جس دن کہ ہمارے مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان شیخ محمد عبدہ کے کسی کارنامہ سے بھی ناواقف تھے اور آپ کی سیرت اور آپ کے کارناموں کو عربی زبان میں لکھنے والوں کی طرف بھی دھیان نہ دیتے تھے، عباس آفندی کی گفتگو سے مجھے جو مسرت وشادمانی محسوس ہوئی وہ میری اس دن کی حسرت وغم کی تلافی کرنے کے لئے کافی تھی، جب کہ میں جامعہ مصریہ کے جلسہ میں شریک ہوا تھا، جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔

میرے لئے یہ امر موجب مسرت ہوگا، کہ ہمارے جامعہ مصریہ سے نکلے ہوئے نوجوان اور ہونہار شیخ محمد عبدہ کی یاد کو زندہ رکھنے کیلئے ایسی سبقت کریں گے، جو اہل علم وارباب فہم کے سزاوار ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی اور آپ کے علمی آثار کا درس دیں اور لوگوں کے سامنے آپ کی زندگی اور آپ کی سرگرمیوں کو پیش کریں،

چونکہ میں مترجم سے اس زمانے سے واقف ہوں، جب سے کہ وہ کلیہ آداب میں شعبۂ فلسفہ کا طالب علم تھا، ایک محنتی اور ذہین طالب علم میں جو صفات درکار ہیں، وہ تمام اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، حقائق کی گہرائی میں پہنچنے والی ذہانت، علمی بحث میں سنجیدگی اور دیانتداری، اور دقیقہ رس نگاہ یہ تمام خصوصیات اس کے

اندر پائی جاتی تھیں، اس لئے مجھے پورا اعتماد تھا کہ عباس آفندی محمود پروفیسر چارلس آدمس کی کتاب کی صحیح تصویر عربی زبان میں کھینچ سکیں گے،

چنانچہ عباس نے میری امید آرزو کو پورا کر دکھایا، انھوں نے "کتاب الاسلام والتجدید فی مصر" کا ایسا بہترین شستہ ترجمہ پیش کیا کہ اس کے پڑھنے والے کو ذرا بھی عجمی اثر کا احساس نہ ہوگا جس سے وہ یہ تصور بھی کر سکے کہ کتاب اجنبی زبان سے ترجمہ کی گئی ہے

مترجم نے ان اصل عبارتوں اور ماخذوں کی طرف بھی رجوع کیا، جن سے مولف نے خوشہ چینی کی ہے، یا ان کا اقتباس پیش کیا ہے، نیز ان اکثر و بیشتر ماخذوں کا بھی مطالعہ کیا، جن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا تھا، تاکہ ضبط و دیانت داری میں کچھ بھی فرق نہ آئے!

جن اشخاص کو مغربی زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کی مشق و مہارت ہے، وہ بخوبی اس امر کا ادراک کر سکتے ہیں، کہ "الاسلام والتجدید" جیسی کتاب کو عربی میں منتقل کرنے کے لئے کس قدر مہارت اور جدوجہد صرف کرنیکی ضرورت ہے

استاد محمود نے اس کتاب کو جس سلاست اور کامیابی کے ساتھ عربی میں منتقل کیا ہے، وہ ان کی فن ترجمہ کی قوی استعداد و صلاحیت کا بہترین ثبوت ہے، ترجمہ کا یہ فن ایسا ہے، جس کے ہم اپنی اس فکری ترقی کے دور میں سخت محتاج ہیں اس فن میں استعداد رکھنے والے اور اس کے اسباب و وسائل کو پائے تکمیل تک پہنچانے والے ہم میں معدودے چند ہیں استاد عباس اس قابل ہیں کہ وہ ہماری علمی سرگرمیوں میں سے اس فنی پہلو پر اپنی پیہم جدوجہد کو جاری رکھیں

عباس محمود، جب سے کہ میں نے انھیں پہچانا ہے، میرے گہرے دوست ہیں، جب ہمارے ہی شاگردوں میں سے ہمارے دوست نہ ہوں، تو یہ توقع کسطرح

کہا جا سکتی ہے کہ دوسرے لوگ ہماری دوستی کا دم بھریں،

لیکن اللہ بہتر جانتا ہے کہ میرا ارادہ اس جملہ سے یہ نہیں کہ میں کسی دوست پر تنقید کروں یا کسی شاگرد کو خلیق و بامروت ٹھہراؤں۔ البتہ یہ ایک موقع تھا جس کا اظہار میں نے اس لئے کیا کہ ہمارے نوجوانوں کی نظر کو نیک کام کی طرف پھیروں اور صالح نوجوان کی مثال پیش کرنے کی ترغیب دوں

ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ
مارچ ۱۹۳۵ء

مصطفیٰ عبدالرازق

پیش لفظ

مصنف

یہ اُس کتاب کا پہلا حصہ ہے، جس کو میں نے ۱۹۲۸ء میں جامعہ شیکاغو ولایات متحدہ امریکہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے عہد قدیم سے متعلق خصوصی شعبۂ تحقیقات میں پیش کیا، یہ کتاب جامعہ امریکہ کے مدرسۂ دراسات شرقیہ کی بدولت مصر میں ظہور پذیر ہوئی، جس سے چند سال تک میرا تعلق رہا ہے کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کتاب ان مشرقی مباحث وتحقیقات کا ایک سلسلہ شمار کی جائے، جو اس مدرسہ سے جاری ہوا کرتے ہیں،

اس کتاب کا دوسرا حصہ خلافت سے متعلق کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے، جس کو علی عبد الرازق نے تالیف کیا تھا ان کا شمار مصر کے ان چند مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے اور اُن کی بہ نسبت حریتِ فکر اور روشن خیالی سے زیادہ حصہ حاصل کیا یہ حصہ چند اسباب کی بنا پر شائع نہ ہوا، علی عبد الرازق نے ۱۹۲۵ء میں اپنی کتاب "الاسلام واصول الحکم" شائع کی اس میں انھوں نے اسلامی خلافت وحکومت پر بحث کی، جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو مصر میں اس کے خلاف سخت ہنگامہ برپا ہوگیا کیونکہ اس میں آزادانہ خیالات کا اظہار کیا گیا تھا،

ان خارجی آراء وافکار کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟ کیا ان کا تعلق اُس جدید اصلاحی تحریک سے ہے جس کو مرحوم شیخ محمد عبدہ مفتی دیار مصریہ المتوفی ۱۹۰۵ء نے رونما کیا تھا؟ یا یہ در اصل اسی تحریک کی طرف لوٹتے ہیں، جیسا کہ پہلی ہی نظر میں ذہن اس کی طرف منتقل ہوتا ہے؟ یا ان کا زیادہ تر تعلق مغربی

علمار کی کتابوں سے ہے ؟

یہ اور اس قسم کے سوالات ایسے ہیں، جو علی عبد الرازق کی کتاب کیطرح ایک اور کتاب کی تصنیف سے متعلق ہیں جو اس کتاب کے ترجمہ کے لئے ایک تمہیدی بحث کا موجب ہیں، تاکہ اس میں مصر کی جدید اصلاحی تحریک کی پیداوار کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے دوررس اثرات کا اندازہ کیا جائے اور ان تعلقات و روابط کو ظاہر کیا جائے جو شیخ محمد عبدہ کے آراء و نظریات اور مولف کے افکار و آرار کے درمیان جس کی کتاب کا ہم نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس مولف کے مصر کے جدید معاصر مصنفین کے افکار وخیالات کے مابین پائے جاتے ہیں.

اس تمہیدی بحث نے اپنی اور اپنے مشتملات کی تصویر کو اور مترجمہ کتاب کے تعلق کو عام طور سے اجاگر کر دیا ہے اس سیر حاصل بحث نے ہمیں اس کا موقع دیا کہ ہم نے اس کو ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر دیا، اب ہم قارئین کے روبرو اس کے خط و خال کو پیش کرتے ہیں، شائد کہ وہ علما، و مصنفین جنھیں اس قسم کے درس تحقیق سے دلچسپی اور شغف ہے، اس کتاب کی قدر و قیمت پہچانیں، اگرچہ ہم سے بیشتر مغربی زبانوں میں محمد عبدہ پر چند کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مثلاً مغربی علماء میں سے گولڈزیہر (Gold-ZiHER) ہورتن (HORTEN) اور ہارٹمان (HORTHMAN) نے اور مصریوں میں سے مثلاً استاذ المصطفیٰ عبد الرازق نے جو رسالۂ توحید کے فرانسیسی ترجمہ کے لئے مسیو برنار میشیل (B.MICHEL) کے ساتھ شریک تھے اور آپ نے اس کا مقدمہ لکھا۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ کتاب محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کے ان حقائق کو پیش کرتی ہے جن کا انکشاف اس سے پہلے نہیں کیا گیا، تاہم اگر ہم یہ تسلیم کریں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب اپنے مکمل نقش و نگار اور اپنی نمایاں

تصویریں پیش کرتی ہے، نیز اس نے آخری انقلابات اور تحریکات کو جس رنگ اور جس نوعیت سے بیان کیا ہے وہ ایک مستقل اور منفرد چیز ہے، بہرحال یہ کتاب اس موضوع میں انگریزی زبان میں ایک محقق کی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے کافی ہے مجھے توقع ہے کہ جو لوگ ان انقلابات و تغیرات کی تلاش و جستجو کرنا چاہتے ہیں جو دور جدید میں اسلام اور عالم اسلامی کی فکری زندگی میں رونما ہوئے تو ان کے لئے اس کتاب میں بہت سا مواد ہاتھ آئے گا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب بعینہ یہی ہو جس کو ہم نے جامعہ کیلئے پیش کیا اس میں جو تغیرات اور تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں، وہ اس کے اس موضوع کے مباحث سے متعلق ہیں، جو اس کی تالیف کے بعد نشر کئے گئے، خاص طور سے ہم ان گرانقدر تحقیقات کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جن کو پروفیسر ایچ۔ آئی رجب نے جامعہ لندن کے مدرسۂ لغات شرقیہ کے مجلہ میں شائع کیا، پھر اس کو ایک کتاب کی شکل میں طبع کردیا اور اس کا نام "جدید عربی ادب کی تحقیقات" رکھا۔ اسی طرح ہم ان بیش قیمت ترجموں کو بھی بیان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، جو ہم کو "جدید عربی ادب کے پیشوا" نامی کتاب میں دستیاب ہوئے جس کو طاہر خمیری اور پروفیسر ڈاکٹر جی کامبغایہ نے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا اس سے پہلے انھوں نے جرمن رسالہ "مجلۂ عالم اسلامی" میں نشر کیا تھا، مجھے ان کتابوں میں بعض ایسی چیزیں دیکھ کر خوشی ہوئی، جو میرے بعض آراء و افکار کی تائید کرتی تھیں، میں نے بعض اوقات ان سے قابل رشک اعانت لی ہے جس کا میں فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں۔

آخر میں محمد عبدہ پر ایک اہم تصنیف شائع کی گئی وہ تاریخ استاذ الامام کی پہلی جلد ہے جس کو محمد رشید رضا نے لکھا اور ۱۹۳۱ء کے آخر میں شائع

کیا، یہ کتاب، جس کا ہمیں مدت دراز سے انتظار تھا جس کو شیخ کے مایہ ناز شاگرد اور آپ کی تعلیمات کو پھیلانیوالوں میں سب سے بڑے سرگرم کارکن نے طبع کیا، لامحالہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے مصر کے اس عظیم ترین مصلح کی زندگی اور اس کے کارناموں کے لئے ہماری معلومات سیراب ہوتی ہیں، اسی کتاب کی دوسری جلد شیخ محمد عبدہ کے مقالات اور آپ کے خطوط پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں آپ کی وفات سے متعلق تعزیتی خطوط اور آپ کی زندگی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، آخری دو حصے پہلے حصہ کے شائع ہونے سے پہلے ہی نکل گئے۔

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کی تفصیلی تاریخ محمد رشید رضا نے کتاب "تاریخ الاستاذ الامام" کے شائع ہونے سے پہلے ہی لکھی اور اس کو المنار شمارہ ۸ ۱۹۰۵ء میں نشر کیا، یہ ایک ایسا مجلہ ہے جو شیخ محمد عبدہ کی جماعت کی نگرانی میں نکلتا تھا جس میں واقعات و اشخاص کے متعلق بہت سے حالات و تفصیلات بیان کئے جاتے تھے، یہ رسالہ مصر کی جدید تاریخ پر اپنی روشنی ڈالتا اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتا اور ان سیاسی و غیر سیاسی شاطرانہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کے پردوں کو چاک کرتا ہے جو شیخ محمد عبدہ کے بارے میں روا رکھی گئیں۔ آپ کی زندگی کی تاریخ اپنی موجودہ صورت میں بہت دیر میں شائع ہوئی کیونکہ اس سے پیشتر اس کا طبع ہونا ناممکن تھا، یہ کتاب جو ہزار صفحات سے متجاوز ہے، اس موضوع پر بڑی اور مکمل ہے؛

اگر ہم آخری مفصل کتاب کا مقابلہ محمد رشید رضا کی اس پہلی کتاب سے کریں، جس کو انھوں نے ابتداءً بہ انداز اختصار کے ساتھ لکھا ہے، تو ہمیں امام کی زندگی کے اہم تفصیلی حالات کے بنیادی نقاط دونوں کتابوں میں نظر آئیں گے، چنانچہ آخری تفصیلی کتاب کے ظہور پذیر ہونے نے ہماری اس بحث کو تشنہ

نہیں چھوڑا، حالانکہ ہم نے اکثر اقتباسات رشید رضا کی پہلی تحریروں پر ہی اکتفا کیا ہے اور ان حاشیوں کو پیش کر دیا ہے جو کسی رائے کی تائید یا اس کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ جس کا جی چاہے وہ ہمارے بیانات کی تصدیق کرے یا ہمارے ان احکام کی جنھیں ہم پیش کر رہے ہیں تصحیح کے درپے ہو، باقی رہے معمولی پڑھے لکھے لوگ جنھیں ماخذات اور اصل سرچشموں تک پہنچنے کی زحمت گوارا نہیں ہو سکتی یا وہ جن کا ذہن و قلب منتشر یا پراگندہ ہو جائے تو وہ اطمینان کے ساتھ حوالوں سے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔

میں اپنے جلیل القدر استاد پروفیسر مارٹن سپرنگلنگ پی۔ایچ۔ ڈی استاد لغات و آداب سامیہ جامعہ شکاگو کا تہ دل سے شکر گزار ہوں، جن کے علم وفضل اور رہنمائی نے مجھے اس موضوع کی تیاری کے وقت بیش بہا امداد کی، عربی زبان اور اسلامی حقائق و حالات پر آپ کی وسعت معلومات اس قسم کے موضوع کے شایان شان دقیق اور نازک مسائل میں آپ کا درک، مدتِ دراز تک میری اعانت کے سلسلہ میں آپ کی کدوکاوش اور آپ کی لطف و عنایت سے ڈوبی ہوئی رہنمائی غرض کہ آپ کی ان تمام مساعی جمیلہ نے آپ کو ایک حیرت انگیز رہنما و خیرخواہ ثابت کر دیا اور آپ کے آراء و نظریات اور آپ کی رہنمائی کو باوقار اور گراں قدر کر دیا، میں آپ کے علم وفضل اور آپ کی برتری کا اعتراف کرتا ہوں اور اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ نقص اور خامی رہ گئی ہے اس کا بوجھ محض میرے کندھوں پر ہے اور میرے استاد پر ذرہ برابر اسکی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی!

اسی طرح میں مدرسۂ دراساتِ شرقیہ میں آپ کے دونوں رفقاء کا جناب آئی۔ آئی الدر فلسفہ و لاہوت کے ڈاکٹر اور جناب آئی جعفری ادب و فلسفہ کے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی

تیاری اور نشر و اشاعت میں وقتاً فوقتاً مفید مشورے دیے اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

چارلس آدمس

قاہرہ: اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

دیباچہ

(مصنف)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصر میں اسلامی تجدید نے ــــ گذشتہ آخری ربع صدی کے دوران میں شیخ محمد عبدہ مفتی مصر متوفی ۱۹۰۵ء کے زیر قیادت ــــ ایک خاص معین تحریک کی شکل وصورت اختیار کر لی، جس نے دین کو جمود و خمود کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور مذہب اور زندگی کے عصری پیچیدہ وسائل و مطالب کے مابین موافقت پیدا کرانے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔

یہ تحریک اس اعتبار سے اس اصلاحی تحریک سے مختلف ہے، جس کو ہندوستان کے اس عقلیت پرست مصلحین کے گروہ نے اٹھائی، جن کا اولین مقصد ثقافتی تحریک تھی اور جن کا مطمح نظر اسلام اور جدید مغربی تمدن کے مقاصد و ضروریات کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، بہر حال یہ دونوں تحریکیں اس امر کے موافق تھیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتا اور ہر دور اور ہر تہذیب و ثقافت کے ساتھ ملاپ رکھ سکتا ہے۔

(مصری اصلاحی تحریک کا پہلا جذبہ خود بخود مصر سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ یہ سید جمال الدین افغانی کی تعلیمات اور آپ کے اثرات کا نتیجہ تھا، جمال الدین جامعۂ اسلامیہ اور اتحاد عالم اسلامی کے جذبہ کے آئینہ دار اور اسلامی عام اصلاح کے عظیم الشان علمبردار تھے، مصر میں آپ نے ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۹ء تک زندگی گذاری۔

محمد عبدہ ان بیشتر نوجوان طلبار میں سے ایک تھے، جنھوں نے جاذب قلب

و نظر حکیم افغانی کے آراء و افکار سے عمیق اثر قبول کیا، لیکن آپ کو تمام طلباء کی بہ نسبت اس جلیل القدر استاد سے روحانی و عقلی قریبی تعلق تھا، آپ نے اپنے ملک کی سیاسی، اجتماعی اور دینی زندگی میں حصہ لے کر اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے استاد کی روح کو زندۂ جاوید اور بلند و برتر نمونہ بنا دیا اس سے بڑھکر ان کی روح کو اپنے زبردست علمی اصلاحات کے ذریعہ لافانی کر دیا، اس طرح محمد عبدہ مصر اور اسلام کی نسبت عہد جدید کے معمار بن گئے، عصر جدید کے مورخین کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ "آپ مصر جدید کے ایک بانی ہیں" اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ آپ "اسلامی بنیادوں کے نئے معمار ہیں" تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ آپ نے اسلامی اصول اور یورپ کے جدید علمی آراء و نظریات کے مابین موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے جو مساعی جمیلہ مبذول کیں ان کو تمام عالم اسلامی میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

(تحریک اصلاح کا وہ جذبہ، جو آپ کے ہاتھوں مصر میں پروان چڑھا اور پھلا، پھولا، اب تک برابر جاری ہے اور اکثر و بیشتر گوشوں میں اپنا اثر ظاہر کر رہا ہے اس کو بروئے کار لانے میں ان بیشتر اشخاص نے بھی امداد بہم پہنچائی، جو آپ کی اصلاحی تحریک کی طرف مائل تھے، انھوں نے آپ کی موت کے بعد بھی آپ کی تعلیمات و تحریکات کی مدافعت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا)

بادی النظر میں آپ کی دوستی کا کھلم کھلا دم بھرنے والے زیادہ تعداد میں نہ تھے، جو ایک مکتب خیال یا ایک اصلاحی جماعت کی تشکیل پذیر ہو سکیں، اسکے باوجود مصر اور اس کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک کے روشن ضمیر طبقہ نے آپ کی تعلیمات کو کان دھر کر سنا اور وسیع توجہ کی، ان کا اثر و نفوذ اکثر خاندانوں میں زور پکڑ گیا یہاں تک کہ وہ ادارے بھی آپ کی موثر تعلیمات سے اثر پذیر ہوئے

بغیر نہ رہ سکے جو آپ کے ہمنوا و آشنا نہ تھے،

آپ کے آراء و افکار سرسبز و شاداب تھے، ان کی افزائش کا سلسلہ روز افزوں ترقی پر تھا، آپ کی روح میں زبردست تاثیر تھی،

مصر میں بیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران میں یا اس سے کچھ عرصہ پیشتر حقیقی بیداری کی لہر دوڑنا شروع ہوئی جو عقلی و ادبی ارتقاء کے روپ میں اجتماعی و اصلاحی تحریکات کی شکل اور سیاسی انقلابات کی صورت میں جلوہ گر ہوئی جس نے وطنیت کی روح کو اجاگر کر دیا،

(درحقیقت یہ ارتقاء مجموعی طور پر محض محمد عبدہ کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ دیگر موثرات نے اس تصویر میں حصہ لیا تھا، اس کے باوجود شیخ محمد عبدہ کی طرف اشارہ کئے بغیر اس ارتقائی شان کی علت کا سمجھانا یا اس کے صحیح خط و خال کو نمایاں کرنا ہمارے لئے دشوار ہے، لامحالہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس ارتقائی تحریک کی تخلیق اور اس کے انقلابی حرکات میں آپ کا گراں قدر حصہ رہا ہے۔

اس کے علاوہ دینی عام اصلاح کے بارے میں آپ کی جو امیدیں اور تمنائیں تھیں، وہ اس مدت میں پوری نہ ہوئیں، جن کی آپ تمنا و آرزو کرتے تھے اگرچہ آپ کے اصلاحی رجحانات اور آزادی کے جذبات نے اطراف و اکناف کے ممالک میں اپنا گہرا اثر کیا، آپ کے بیشتر مقاصد کی تکمیل کی جنہیں ہم درحقیقت آپ کے مقاصد کا ایک حصہ شمار کر سکتے ہیں، اسی لئے ہم پر یہ ضروری ہو گیا کہ ہم مصر کے موجودہ پیشوایانِ فکر و نظر کے مقام کو واضح کر دیں اور اس امر کا کھوج لگائیں کہ ان کے آراء و افکار کا آپ کی ان تعلیمات سے کس قدر تعلق ہے جس کو آپ نے پہلے ہی پھیلایا تھا۔

الہام ہم نے ان ہی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اپنی بحث میں روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ آپ کی تحریک یا اس تحریک کی غرض و غایت کو پہنچنے کے لئے کوئی صحیح راستہ نہیں مل سکتا تاوقتیکہ ہم آپ کی شخصیت اور آپ کے کارناموں سے واقف نہ ہوجائیں۔ کیونکہ آپ کی سرگرمیاں ہی آپ کے آراء و نظریات کی بہترین تفسیریں ہیں۔

ساتھ ساتھ آپ کے آراء و افکار کو سمجھنے کے لئے اس ہستی کا جاننا بھی ضروری ہے، جس نے ان بنیادی افکار کا آپ کو الہام کیا (وہ ہستی سید جمال الدین افغانی کی ہے اس لحاظ سے ہم نے استاد و شاگرد کی زندگی بیان کرنے میں پیش قدمی کی ہے، اس کے بعد محمد عبدہ کے ان اہم آراء و تعلیمات پر مختصر بحث کی ہے جو مصر کی تجدید و تعمیر کے لئے اساسی و بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

حسب اقتضائے حال ہم نے آپ کے ممتاز جانشینوں اور مشہور رفقاء کار کے آثار کو پیش کیا ہے، ان کے علاوہ مصر کے ان مفکرین و زعماء پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے آراء و افکار کا سرچشمہ ممکن ہے کہ محمد عبدہ کی ذات ہو، اسطرح ہم جدید اسلامی فکر کی طرف آپ کو جو نسبت دی گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کی سعی کریں گے،

جدید مفکرین جن کی تصنیفات پر ہم نے توجہ کی ان میں زیادہ اہم وہ کتاب ہے جس کو علی عبدالرازق نے اسلامی خلافت کے بارے میں تصنیف کی ہے اور اس کا نام "الاسلام و اصول الحکم" رکھا ہے اور اس کو ۱۹۲۵ء میں شائع کیا ہے

اگر ہمارا ارادہ جدید عربی ادب کے تمام میدانوں کا احاطہ کرنا ہوتا تو لامحالہ ہمیں مصر کے مفکرین اور دیگر مصنفین کی کتابوں کو بھی پیش کرنا پڑتا یہ بیان

کرنے کی حاجت نہیں کہ اس قسم کے عظیم الشان کام کے لئے اس کتاب میں گنجائش کہاں، اسی طرح یہ امر بھی آسان نہیں ہے کہ ہم وہ تمام معلومات بہم پہنچائیں، جو مصر کی تجدید کے جھنڈے تلے جمع ہیں

اسی لئے ہمارے اصل مدعا و مقصد کو پورا کرنے کے لئے جس کا ہم نے اوپر اظہار کیا ہے ـــــ ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ مصر جدید میں اسلامی فکر پر مختصر طور پر روشنی ڈالیں، ہم نے اس موضوع میں جس قدر بسط تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، وہ ایک وسیع میدان کا مختصر سا خاکہ ہے، اس کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کے لئے مکمل تحقیق اور وسیع و عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے،

Marfat.com

ذکرِ جمال

1839

(1)

سید جمال الدین افغانی، جو مصر کی جدید تحریک کو زندہ کرنے میں پہلے جوہری عنصر ہیں، حدود افغانستان میں کابل کے قریب اسعد آباد میں ۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے[1]

---

[1] ایرانی روایت یہ ہے کہ آپ اسی نام کے ایک قریہ میں جو ہمدان کے قرب وجوار میں ایران میں واقع ہے پیدا ہوئے اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود آپکو افغانستان کی طرف منسوب کرنے کا سبب ایک تو ان معلومات کی کمی ہے، جو آپ کی اولین نشوونما کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں، دوم یہ کہ خود جمال الدین نے اس نسبت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، خوش قسمتی سے آپ کی زندگی کے آخری حالات، جو آپ کے مصر میں آنے کے بعد سے حاصل ہوئی ہیں، آپ کی زندگی پر روشنی ڈالنے کیلئے کافی ہیں، ای۔ جی۔ براؤن (انقلاب ایران صفحہ ۴۲۳) کا اندازہ ہے کہ جمال الدین کے اپنے آپ کو افغانی سے معروف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا شمار مسلمان سنیوں کے زمرہ میں ہو اور اس ایرانی حمایت سے کنارہ کش ہو جائیں جن کی قدر و قیمت میں آپ کو شک تھا۔

آپ کے مقام پیدائش میں واقعہ درحقیقت کچھ بھی ہو آپ افغانی ہی سے مشہور ہیں بلنٹ اپنے ایک روزنامچہ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۸۳ء (انقلاب ایران صفحہ ۴۰۲ حاشیہ) میں کہتا ہے "جمال الدین کا خاندان عربی ہے، جس نے اپنی زبان کی ہمیشہ حفاظت کی، آپ عربی زبان میں بہترین گفتگو فرماتے تھے" یہ بیان محمد رشید رضا کے اس قول کے خلاف ہے، جو آپ نے المنار ج ۸ ۱۹۰۵ء صفحہ ۳۸۹ پر ذکر کیا ہے کہ جمال الدین باوجود آپ کی طاقت لسانی کے اپنے موروثی ایرانی اثرات سے اپنے عربی کلام میں محفوظ نہ رہ سکے۔"

آپ کے والد سید صفدر ان پڑھ اور فقیر منش تھے باوجود اس کے آپ کا سلسلۂ نسب مشہور محدث سید علی ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ مطابق ۸۹۲ء) تک پہونچکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسین بن علی بن ابو طالبؑ تک پہنچتا ہے،

جمال الدین کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی، تو آپ نے اپنے محلہ کے ایک مدرسہ میں تعلیم پانی شروع کر دی اور دس سال تک اسی مدرسہ میں رہے اس کے بعد ایران و افغانستان کے مختلف و متعدد مقامات میں مسلسل علم حاصل کرتے رہے، اٹھارہ سال کی عمر میں تمام مشہور و معروف اسلامی علوم مثلاً نحو، علم اللغۃ علم مابعد الطبیعۃ، ریاضیات، علم ہیئت، طب، تشریح وغیرہ مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

اس وقت آپ کو ہندوستان کا سفر درپیش ہوا، جہاں آپ ڈیڑھ سال تک مقیم رہے اس مدت کے دوران میں آپ نے بعض مزید علوم، یورپ کے طریقے اور کچھ انگریزی سیکھ لی، آپ افغانی، فارسی، ترکی اور عربی زبان اچھی طرح بولتے تھے ہندوستان سے مکہ معظمہ کی طرف سفر کیا، طویل سفر کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں آپ مکہ پہنچ گئے، فرائض حج ادا کرنے کے بعد افغانستان پہنچ گئے اور امیر دوست محمد خاں کی خدمت میں داخل ہو گئے، اس کے لشکر میں روانہ ہوئے اور محاصرہ کے وقت بھی اس کے ساتھ رہے، ہراۃ فتح کر لیا، جس پر امیر کا چچیرا بھائی اور اس کے خسر سلطان احمد شاہ نے قبضہ جما لیا تھا،

۱۸۶۴ء میں جب محمد خاں وفات پا گیا، تو اس نے اپنے بیٹے شیر علی کو اپنا جانشین بنایا، اس کے اور اس کے تینوں بھائیوں کے درمیان جنگ

چھڑ گئی، جس کے شعلے دونوں طرف سے زور سے بھڑکنے لگے، جمال الدین ان بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ، جس کا نام محمد اعظم تھا، شریک ہو گئے، اس کو کئی بار فتح و ظفر کی شیرینی اور شکست کی تلخی چکھنی پڑی، آخر کار فتح و نصرت و کامرانی اسی کو نصیب ہوئی، چنانچہ اس نے جمال الدین کو اپنا معتمد علیہ وزیر بنا لیا۔

جمال الدین کی عمر اس وقت ستائیس برس کی تھی تھوڑا ہی عرصہ نہ گزرا تھا کہ پھر جنگ دوبارہ شروع ہو گئی، انگریزوں نے امیر شیر علی کی مدد کی اور بہت سا مال خرچ کیا، شیر علی اپنے بھائی پر فتحیاب ہو گیا، اس کو ملک چھوڑ کر فرار ہو جانے پر مجبور کر دیا، تھوڑے ہی عرصہ میں قضا کے پنجہ نے اُسے آکر دبوچ لیا؛

نئے امیر نے جمال الدین کی دشمنی کو بروئے کار ہونے نہ دیا اور نہ آپ کے ساتھ بری طرح سے پیش آیا، اس کی وجہ یہ تھی، کہ آپ خاندان سادات سے تھے، عوام پر آپ کا کافی اثر و نفوذ تھا، لیکن امیر نے دل کے اندر آپ کی دشمنی کو چھپا رکھا جمال الدین نے ملک چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا، اس لئے آپ نے امیر سے دوبارہ حج کی اجازت مانگی، اس نے آپ کو اجازت دے دی، چنانچہ آپ نے ۱۸۶۹ء کو افغانستان سے سفر کیا اور ہندوستان کا رخ کیا، یہاں کی حکومت نے آپ کا احترام کیا، لیکن آپ کو سیاسی مشاغل میں الجھنے یا مسلمان زعماء و مفکرین کے ساتھ تبادل خیالات کرنے کی اجازت نہ دی، اس لئے آپ یہاں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے، پھر حکومت کی ایک دخانی کشتی میں بیٹھ کر سویز کی طرف روانہ ہو گئے اور یہاں سے قاہرہ پہنچ گئے تاکہ چالیس دن یہاں بسر کریں، دوران قیام میں جامعہ ازہر میں آمد و رفت رہی، اکثر و بیشتر اساتذہ و طلباء آپ سے ملتے جلتے رہے ان میں سے بعض آپ کی قیام گاہ

پر بھی حاضر ہوتے رہے۔

اس وقت آپ نے اپنا ارادہ حجاز کی طرف جانے سے ملتوی کر دیا اور بہت جلد آستانہ روانہ ہو گئے، سلطان عبدالحمید نے آپ کا شاندار خیر مقدم کیا اور آپ کی بڑی تعظیم کی، علماء اور بلند پایہ عہدہ داروں نے آپ کو دلی خوش آمدید کہا، آپ نے اپنی عادت کے مطابق اپنے آراء و خیالات کو ظاہر کرنے اور اپنی تعلیمات کو پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، تھوڑی ہی مدت میں آپ کی شہرت اطراف و اکناف ملکوں میں پھیل گئی اور آپ کا اثر و نفوذ بڑھ گیا،

لیکن شیخ الاسلام نے آپ پر نگرانی کی اور اس کے سینہ میں حسد اور غیرت کی چنگاریاں فروزاں ہو گئیں۔

۱۸۷۰ء کے آخر میں مہتمم دارالفنون یا مدیر جامعہ ترکیہ نے آپ کو دعوت دی کہ طلباء کو ترغیب دینے کے لئے صناعات پر تقریر کریں[1] باوجودیکہ جمال الدین نے نہایت احتیاط کے ساتھ تقریر کی، آپ نے اپنی تقریر سے پیشتر بہت سے عہدہ داروں

---

[1] دیکھو مشاہیر الشرق جلد ۲ صفحہ ۵۵، نیز دیکھو "انقلاب ایران" میں براون کی تقریر کا خلاصہ صفحہ ۷ جس میں لکھا ہے، کہ جمال الدین نے انسانی معیشت کو ایک زندہ جسم سے تشبیہ دی ہے اور ہر صناعت کو اس بدن کے عضو کے قائم مقام ٹھرایا ہے فرماتے ہیں اس جسم کی روح یا نبوت ہے یا حکمت ہے، شیخ الاسلام نے ان جملوں کو گرفت کیا، اور جمال الدین کو یہ الزام لگایا کہ آپ کا خیال ہے کہ نبوت ایک اکتسابی شئے ہے اور آنحضرت صلعم ایک پیشہ ور تھے نیز یہ بھی الزام لگایا کہ آپ نے اپنے اس قول سے نبی اکرمؐ کی ذات کو اس امتیازی خصوصیت کی حد سے نکال دیا، جس پر آپ اللہ کے رسول اور اس کی وحی و الہام کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے برقرار ہیں، ان الزامات کو تحریک میں لانے کا اصل سبب بلاشک و شبہ جمال الدین کے نفوذ کی وجہ سے حسد و غیرت تھی کیوں کہ آپ کی آزادانہ آراء بقیہ صفحہ ۴۴ پر

کی رضامندی کا اعتماد حاصل کرلیا، لیکن شیخ الاسلام نے آپ کی تقریر کے بعض جملوں کو گرفت کرلیا اور الزام دھرنا شروع کیا کہ آپ نے ایسی عبارتیں استعمال کیں، جو دین کی حرمت کے خلاف ہیں، اخباروں نے بھی اس کو خوب اچھالا اور اسی کو اپنا موضوع بحث ونظر بنا ڈالا، جمال الدین نے ان غلط افواہوں کی سختی کے ساتھ تردید کی، لیکن حکومت ترکیہ نے لوگوں کی عام بےچینی کو کم کرنے اور ملک کی اضطراب انگیز فضا کو ساکن کرنے کے لئے ملک چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا، چنانچہ آپ یہاں سے مصر کی طرف روانہ ہوگئے اور ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو قاہرہ پہنچ گئے، یہاں آپ کا ارادہ زیادہ عرصہ ٹھہرنے کا نہ تھا، لیکن ریاض پاشا نے، جو اپنے عہد کا وزیر اعظم تھا، تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ آپ کے فضل واحترام اور جلالت شان کے مدنظر حکومت مصریہ کی طرف سے مقرر کردیئے۔ اس نے آپ کو مصر میں ٹھہرنے پر مائل کردیا۔

جب آپ کے مصر آنے کی خبر چاروں طرف پہنچی، تو ذہین طالب علموں کا ایک گروہ کثیر آپ کے گرد جمع ہوگیا، آپ نے کلام، فلسفہ، اصول فقہ، ہیئت اور تصوف کی بعض اونچی کتابوں کا درس ان کو دیا، پھر آپ نے نئے مصنفین کی ایک جماعت اس مقصد کے لئے تیار کرنے کی طرف توجہ کی، تاکہ وہ جدید آراء وخیالات کو لوگوں میں پھیلائیں، چنانچہ آپ نے اپنے شاگردوں کو مضمون نگاری، انشاء پردازی اور اخبار نویسی کے لئے آمادہ کردیا، اس کے بعد آپ نے مصری سیاست کی طرف رخ کیا، یہاں کے ممالک کو اپنے امور ومعاملات میں غیروں کے نفوذ اور اجنبی دخل اندازی سے آگاہ کرانے میں اپنی بےنظیر جدوجہد صرف کی اور اجنبیوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) بنگراں کا رعلماء کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی، رینان کہتا ہے کہ جمال الدینؒ علوم و معارف کو عام کرنے کی طرف، جو اشارہ کیا تو شیخ الاسلام کو بڑا معلوم ہوا کیوں کہ آپ کے بعض آزار شیخ کی روزی میں رکاوٹ ڈالنے کا پیش خیمہ تھے

رسوخ اور ان کے غلبہ و اقتدار کے بُرے نتائج پر سے پردہ ہٹا دیا نیز آپ کے اُن مقالوں اور تحریروں نے، جو اخباروں اور رسالوں میں نشر کی جاتی تھیں، انگریز دشمنی کو پوشیدہ نہ رکھا، اس طرح آپ مسلسل آٹھ سال تک مصر میں پورے نشاط فکر اور جوش عمل کے ساتھ اپنے خیالات پھیلاتے رہے،

آپ نے جو موقف اختیار کر رکھا تھا اس سے اوروں کا تصادم ہو جانا ناگزیر تھا، چنانچہ آپ کے نگران کار عالموں نے آپ کے عجیب و غریب نظریات و آراء کی مزاحمت کی، ان کو انھوں نے آپ کے لئے طعن و تشنیع کا ذریعہ بنا لیا، آپ کے فلسفہ میں فکر و نظر کرنے کو ان نگران کار حلقوں نے حرام قرار دیا اور آپ کی صحبت میں بیٹھنے والوں اور آپ کی تحریک کا مطالعہ کرنے والوں کو انھوں نے صحیح دین کا دشمن گردانا۔[1]

آپ کے سیاسی کارناموں نے حکومت کے دل میں شکوک و شبہات کو بیدار کر دیا، خاص طور سے برطانوی کارندوں کو بدگمانی کا موقعہ پیدا کر دیا، اس وقت مصر کی مالی حالت تیزی کے ساتھ گرتی جا رہی تھی اور افلاس کی آخری سرحد تک قدم دھر چکی تھی، مالیہ کی اس ناگفتہ بہ حالت نے یورپی دخل اندازی کو زرین موقع فراہم کر دیا پھر اس نے خدیو اسماعیل کو معزول کرنے پر مجبور کر دیا، جس نے اپنے ملک

---

[1] محمد رشید رضا نے (المنار جلد ۲ (۱۸۹۹) صفحہ ۲۴۵) ذکر کیا ہے کہ تنگ نظر علماء و مشائخ نے جمال الدین کو تین بنیادی امور کی وجہ سے قابل گرفت قرار دیا (۱) آپ کا علم فلسفہ (۲) بعض اُن دینی رسوم و عادات کی پابندیوں سے آزادی جو عوام کی نگاہوں میں دین کا جزو ہو گئی ہیں (۳) آپ کے اکثر و بیشتر تلامذہ غیر متدین ہیں۔ رشید رضا اس آخری الزام کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کے اکثر شاگرد غیر متدین تھے تو اس کی وجہ جمال الدین کا میل جول نہیں بلکہ یہ صرف ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔

کو یورپی ممالک کے رنگ میں رنگنے کے لئے فضول روپیہ خرچ کر دیا تھا آخر کار اس کو اپنی ناکام کوششوں کا یہ برا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا توفیق مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۷۹ء کو اس کا جانشین ہوا۔

آزادی کے وہ عناصر جن کو جمال الدین نے ہر طرف منتشر کیا تھا، اور جن کے غلبہ و تسلط کو ملکوں میں قوی کر دیا تھا، اب توفیق کے ہاتھوں پر عظیم الشان اصلاحات کے نفاذ کا پیش خیمہ بننے والے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توفیق نے اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے جمال الدین اور آپ کے خاص حلقہ نشینوں سے معاہدہ کیا تھا، کہ جب حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں آجائے گی، تو ان کی اصلاحی کوششوں میں مدد دے گا، لیکن تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ہی اس نے ستمبر ۱۸۷۹ء کو حکم صادر کیا، کہ جمال الدین اور آپ کے مخلص پیرو کار ابو تراب مصر سے نکل جائیں۔[1] اس

[1] اس طرز عمل کے لئے جس کے واقع ہونے کا توفیق کی طرف سے احتمال نہ تھا دو سبب بیان کئے جاتے ہیں، جن کو محمد رشید رضا نے (المنار جلد ۸ صفحہ ۴۰۴) میں بیان کیا ہے کہ توفیق بادشاہ جوں ہی تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا جمال الدین اور آپ کے رفقاء کار نے بادشاہ سے اپنے دیرینہ وعدوں کو پائے تکمیل تک پہنچانے پر اصرار کرنا شروع کیا، خاص کر نیابتی حکومت ( ) کے قائم کرنے کا مطالبہ کیا، جو ان تمام اصلاحات کے لئے سنگ بنیاد تھا جن کو بروئے کار لانے کی ان کو تمنا تھی

اس کے علاوہ حکومت ملنے سے پیشتر وعدوں اور معاہدوں کو تجویز کر لینا بہت آسان ہے لیکن حکومت ہاتھ میں آجانے کے بعد ان کا پورا کرنا بعید و دشوار معلوم ہوتا ہے کہ توفیق بادشاہ نے محسوس کیا کہ ایفاء عہد کی نسبت اصلاح اور انقلاب کی چیخ و پکار کرنے والے ہی سے نجات پا لینا کہیں زیادہ بہتر ہے،

لیکن براؤن (انقلاب ایران صفحہ ۰) کے نزدیک حکومت برطانیہ کے دل میں جمال الدین

فرمان کے بعد آپ نے مصر کو خیرباد کہکر ہندوستان کا سفر کیا، اور حیدرآباد دکن میں مقیم رہے، یہاں پر آپ نے فارسی زبان میں اپنی کتاب "ردمذہب نیچریہ" تصنیف کی آپ کی دیگر تمام بسیط کتابوں میں سے صرف یہی ایک کتاب باقی رہ گئی ہے، اس کے اندر آپ نے اسلام کے خلاف جس قدر شکوک و اعتراضات تھے، ان تمام کا ازالہ کیا ہے اور مخالفین کی پرزور تردید بھی کی ہے،

۱۸۸۲ء میں مصری نوجوانوں کی وہ تحریک، جس کی تخم ریزی جمال الدین نے کی تھی اعرابی انقلاب کی صورت میں نمودار ہوئی اس کے بعد مصر میں برطانیہ کا قبضہ ہوگیا، جس وقت یہ فتنہ و انقلاب مصر میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا، تو حکومت ہند نے جمال الدین کو حیدرآباد سے بلوایا اور کلکتہ میں نظر بند کر دیا، آپ پر نگران کاروں کو مقرر کردیا، جب مصری وطنیت کی تحریک کچھ دھیمی پڑی تو حکومت نے آپ کو ہندوستان چھوڑ دینے کی اجازت دیدی، آپ لندن روانہ ہو گئے، چند دن یہاں مقیم رہے، اس کے بعد پیرس چلے گئے اور یہاں تین سال تک سکونت پذیر رہے۔

کی سیاسی تحریکات سے بدگمانی پیدا ہوگئی، تو اس نے خدیوی نوجوان کو آمادہ کیا کہ وہ اس خطرناک انقلاب سے اپنے ملک کو نجات دلادے،

غالباً یہی دو اسباب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، دیکھو مقدمہ رسالۃ التوحید صفحہ ۲۹ اور مصر کی پراسرار تاریخ مطبوعہ ۱۹۲۲ صفحہ ۲۹۵ - ۲۹۶-

رشید رضا نے جس وقت ۱۹۳۱ء میں محمد عبدہ کی تاریخ حیات لکھی، تو ان کا قلم ۱۹۰۵ء کی آزادانہ تحریکات سے بے حد مستفید ہو رہا تھا چنانچہ آپ نے دوسرے سبب کی تائید کی (تاریخ الاستاد جلد ۱ صفحہ ۷۶) بلکہ آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ فرانس اور انگلستان کے دو وکیلوں نے بالاتفاق خدیو کو یقین دلایا کہ حکومت میں اسوقت ہر قسم کی اصلاح مضرت رساں ہے

جب آپ پیرس پہنچے تو آپ نے اپنی دعوت وتحریک کے لئے ایک نیا دور پایا، آپ نے فرانسیسی اخبارات میں اپنے سیاسی خیالات کی نشرواشاعت کی اس وقت آپ نے فرانسیسی زبان میں مہارت پیدا کرلی تھی، قارئین نے آپ کی تحریروں اور آپ کے مقالات کو توجہ سے پڑھنا شروع کیا اور ممالک اسلامیہ میں مغربی حکومتوں اور بالخصوص برطانوی حکومت کی خودغرضیوں سے آگاہی حاصل کی،

۱۸۸۳ء میں آپ کے اور ارنسٹ رینان کے درمیان جریدہ "دیبا" میں "اسلام اور سائنس" کے موضوع پر سخت نزاع و اختلاف برپا ہا، ان کے مابین اصل مناقشہ یہ تھا، کہ کیا اسلام میں اصلاح اور جدید تمدن کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد ہے؟

آنے والے سال میں آپ نے اپنے رفیق اور تلمیذ شیخ محمد عبدہ کو اپنے پاس دعوت دی، اس وقت محمد عبدہ فتنۂ عرابی میں حصہ لینے کی وجہ سے مصر سے جلاوطن کردیئے گئے تھے، چنانچہ آپ پیرس روانہ ہوگئے اور اپنے استاد سے جاملے، دونوں نے مل کر ایک عربی رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کرنا شروع کردیا، جس کی غرض وغایت یہ تھی کہ مسلمانوں کو مغربی ظلم و استبداد کے مقابلہ اور استعماری بیخ کنی کرنے کے لئے اپنی توانائیوں اور کوششوں کو متحد کرنے کی دعوت دی جائے،

جمال الدین رسالہ کے مدیر تھے، آپ اس کے سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے، جو انگریزوں کے مخالف تھے، محمد عبدہ ان تمام مقالات کو تحریر کیا کرتے تھے، جو اس رسالہ میں شائع ہوتے تھے، اس کا پہلا نمبر ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا، اس کے مجموعی نمبر اٹھارہ

نکلے، اس کا آخری نمبر ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں نکلا تھا۔

برطانیہ نے اس رسالہ کو ہندوستان اور مصر میں ممنوع قرار دے دیا، یہی وہ ملک تھے، جن میں دعوت و تحریک کو پھیلانا رسالہ کی اولین غرض تھی، حکومت برطانیہ نے ان لوگوں پر کڑی سختی اور نگرانی کی، جن کے پاس اس رسالے کے نسخے پہنچا کرتے تھے،

باوجودیکہ یہ رسالہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اس نے تمام عالم اسلامی میں اپنی زبردست تاثیر چھوڑی، آنے والی مسلمان نسلوں میں وطنیت و اتحاد کی روح کو بیدار کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوا[1]۔

اس تحریک کے موقوف ہو جانے کے بعد، جمال الدین لندن روانہ ہو گئے۔ یہاں زیادہ مدت تک آپ نہ ٹھہرے، مہدی سوڈانی کے انقلاب

---

[1] محمد رشید رضا کا خیال ہے (المنار جلد ۸ صفحہ ۵۵۴) کہ اگر یہ رسالہ ہمیشہ جاری رہتا، تو تمام عالم اسلامی میں عظیم الشان انقلاب برپا کر دیتا، ایک جماعت نے اس بلند مقصد کو پورا کرنا شروع کیا، جس کو جمال الدین نے ہندوستان، مصر، شمالی افریقہ اور شام کے مسلمانوں میں سے تشکیل دی تھی اس جماعت کی غرض و غایت مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرانا، ان کو ان خطرات سے آگاہ اور بیدار کرانا جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور ان کو ان کا مقابلہ کرنے کے راستوں کی طرف رہنمائی تھی، اس کا فوری مقصد یہ تھا کہ مصر اور سوڈان کو برطانوی قبضہ سے آزاد کرایا جائے، جمال الدین نے مکہ میں بھی ایک انجمن ام القریٰ کی تشکیل دی تھی جس کا مقصد یہ تھا، کہ ایک خلیفہ کے جھنڈے تلے، تمام عالم اسلامی یکجا ہو، سلطان عبدالحمید نے اس جمعیت کی تاسیس کے ایک سال بعد اسکا خاتمہ کر دیا (انقلاب ایران صفحہ ۱۵) (جدید تحریکات صفحہ ۷۲)

میں بمقام سوڈان میں برپا تھا[۱] برطانوی ارباب سیاست سے تبادل خیالات کیا، پھر لندن سے ماسکو اور پیٹرسبرگ کی طرف کوچ کیا، ان دونوں شہروں میں آپ کا پرتپاک خیرمقدم کیا گیا، آپ نے افغانستان، ایران، ترکی اور برطانیہ کے متعلق جو سیاسی مقالات تحریر کئے تھے، ان کا سیاسی حلقوں میں گہرا اثر تھا روس میں آپ چار سال تک مقیم رہے۔

۱۸۸۹ء میں جب کہ جمال الدین میونخ میں شاہ ایران کے لئے پیر اسرار ہم میں مشغول تھے، تو شاہ ناصرالدین سے آپ کی ملاقات ہوئی، جو اس وقت یورپ کی سیر وسیاحت کے لئے آیا ہوا تھا، بادشاہ نے آپ کو اپنے ساتھ ایران آنے کی دعوت دی، تاکہ آپ کو وزیر اعظم بنا دیا جائے۔

ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسری ملاقات تھی، جس میں

---

[۱] یہ واقعہ ۱۸۸۵ء کا تھا (انقلاب ایران صفحہ ۴۰۲ و مشاہیر الشرق جلد ۲ صفحہ ۵، المنار جلد ۸ صفحہ ۴) المنار کی روایت یہ ہے، کہ برطانوی وزیر خارجہ نے سوڈان کی فتح کو دوبارہ حاصل کرنے سے عدول کرنے کا تصفیہ کیا، اس کی کوشش کا سہرا جمال الدین و محمد عبدہ کے سر ہے،

لیکن ۔ ای ۔ جی ۔ براؤن (انقلاب ایران صفحہ ۴۰۳) کا بیان ہے کہ جمال الدین انگلستان اس غرض سے آئے کہ مہدی سوڈانی کے ساتھ صلح کرنے کے متعلق تبادل خیال کریں، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جمال الدین نے برطانوی وفد کے ساتھ آستانہ کی طرف جانے اور عبدالحمید پر اپنا اثر ڈالنے کا ارادہ کیا، تاکہ ان سے ایک معاہدہ کیا جائے، جو مصر سے برطانیہ کے تخلیہ اور روس کے خلاف ترکی، ایران اور افغانستان کے ساتھ مصر کے حلف نامہ پر مشتمل ہو، لیکن آپ کو سفر کا پاسپورٹ نہ ملا جس کی وجہ سے آپ وہاں تک نہ جا سکے، آپ کا غیظ وغضب بڑھ گیا، آپ ماسکو روانہ ہو گئے اور ان لوگوں کی آغوش سے جا ملے، جو انگلستان کے خلاف ترکی روسی معاہدۂ اتحاد کے دعویدار تھے۔

جمال الدین سے شاہ منزل میں وزارت کا وعدہ کیا گیا تھا، پہلی ملاقات ۱۸۸۶ء میں ہوئی، جب کہ بادشاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی تھی، آپ نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، بادشاہ نے آپ کا نہایت احترام کیا اور آپ کو وزیر جنگ مقرر کردیا، آپ کے مددگاروں کی کثرت ہوگئی، آپ کے علمی تبحر، جادو بیانی، زبان کی فصاحت اور ملکوں کی اصلاح کے بارے میں شدید ترین غیرت وحمیت کی وجہ سے آپ کے ماننے والے بکثرت ہوگئے، آپ کا نفوذ و اقتدار نہ صرف آپ سے فیض حاصل کرنے والوں اور اونچے عہدہ داروں پر رہا، بلکہ عوام الناس کے دلوں پر بھی چھاگیا، بادشاہ کے دل میں آپ کی بڑھتی ہوئی قوت وشوکت سے شک و شبہ پیدا ہوگیا، اس کو یہ خوف دامنگیر ہوا، کہ مبادا پس پردہ کوئی ایسی قوت ہو جو اس کی سلطنت پر قابض ہوجائے، بادشاہ کے تیور بدل گئے جمال الدین نے اس تبدیلی کو محسوس کرلیا، تبدیل آب وہوا کے لئے بادشاہ سے اجازت مانگی چنانچہ اس نے اجازت دے دی اور آپ روس کی طرف روانہ ہوگئے،

جب آپ بادشاہ سے ملاقات کرنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں ایران کی طرف دوبارہ واپس ہوئے تو لوگوں نے آپ کا اس حیثیت سے خیر مقدم کیا، کہ آپ ان کے درد وکرب کو دور کرنے میں ان کی آرزوؤں کے ترجمان اور ان کے معتمد علیہ زعیم ہیں، پھر بادشاہ کے دل میں دیرینہ شبہات پلٹ آئے، اس کے نفسانی جذبات نے اس پر قابو پالیا، جمال الدین نے حقیقت حال کو محسوس کرلیا اور ملک چھوڑ دینے کی اجازت چاہی، بادشاہ نے اجازت دینے سے انکار کردیا، آپ شاہ عبدالعظیم کے مکان میں پناہ گزیں ہوگئے، جہاں سات مہینے تک مقیم رہے، بادشاہ اور آپ کے مابین تعلقات نہایت کشیدہ ہوگئے، آپ نے علی الاعلان بادشاہ کو معزول کرنے کی طرف دعوت دینی شروع کردی، آپ کا نفوذ واثر تمام جماعتوں میں ترقی پاگیا،

اندرونی انقلاب میں، جو ایران میں بعد میں برپا ہوا، جمال الدین کے بارہ شاگردوں کا کافی حصہ تھا، ان میں سے ایک شاگرد نے ۱۸۹۶ء میں بادشاہ کو ہلاک کر دیا[1]

آخر کار بادشاہ نے عبدالعظیم کے مقام پر حملہ کر دیا اور اس کو بے حرمت کیا، جمال الدین کو جو بستر پر بیمار پڑے ہوئے تھے، گرفتار کر کے سلطنت عثمانیہ کے حدود سے دور کر دیا،

تحقیقی طور پر آپ کی جلاوطنی کی تاریخ سے ہم واقف نہیں ہیں، تاہم گمان غالب یہ ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۹۰ء کے اواخر یا ۱۸۹۱ء کے اوائل میں پیش آیا۔

جمال الدین بصرہ میں ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ آپ تندرست ہو گئے اس کے بعد لندن کا سفر کیا یہاں سے ۱۸۹۳ء میں آستانہ پہنچ گئے زیادہ مدت تک یہاں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ آپ کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے گرفتار کر لیا، باوجودیکہ آپ سلطان عبدالحمید کی زیر حمایت تکریم و تعظیم کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے، مگر درحقیقت آپ ایک سنہری قفس میں اسیر تھے، آپ کو ایک مہلک مرض سرطان نے آگھیرا۔ جو ابتداءً آپ کے جبڑے پر نمودار ہوا اس کے بعد آپ کی گردن تک دراز ہو گیا[2] آخر کار اسی مرض مہلک کی وجہ سے آپ نے ۹ مارچ ۱۸۹۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ

---

[1] قاتل مرزا رضا کرمانی سے جب جواب طلب کیا گیا، تو اس نے اعتراف کیا کہ اس کے قتل کے ارادہ کے راز سے صرف جمال الدین ہی واقف تھے (انقلاب ایران صفحہ ۶۷) جب بادشاہ کو قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے جمال الدین اور دیگر تین اشخاص کو جن پر شبہ تھا، حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا، لیکن سلطان عبدالحمید نے جمال الدین کو سپرد کر دینے سے انکار کر دیا، اور باقی تینوں کو حوالہ کر دیا، ان کو پوشیدہ طور پر طبریز میں قتل کر دیا گیا (انقلاب ایران صفحہ ۱۱)

[2] جمال الدین کے اکثر ایرانی رفقاء کا یہ خیال ہے کہ جو مرض آپ کی موت کا سبب بنا، اگرچہ

کی تجہیز وتکفین آستانہ میں مقبرہ مشائخ میں ہوئی۔

اس یگانۂ روزگار ہستی کے اثرات نے تمام اسلامی اور یورپی ممالک کو گھیر لیا، افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان نے جمال الدین اور ان کی تحریکات کے ساتھ گہرا ربط ضبط پیدا کر لیا، ان سبھوں نے آپ کے اس قوی اثر کا احساس کیا، جس نے نہایت سختی کے ساتھ ان کو خواب غفلت سے جھنجوڑا تھا، آپ ہی نے انقلاب ایران کی تخم ریزی کی تھی، جو ۱۸۹۱ء میں تمباکو کی اجارہ داری کے خلاف میں برپا ہوا تھا، آخر کار ۱۹۰۶ء کو ایک دستور کی صورت میں ختم ہوا[1]

جب آپ آستانہ میں مقیم تھے، تو آپ نے اپنی مسلسل ہیجان انگیزی کے ذریعہ ترکی کی اس تحریک کے لئے زمین تیار کی، جو ۱۹۰۸ء میں برپا ہوئی۔

آپ مصری وطنیت کی تحریک کے پہلے علمبردار ہیں، جس کا انجام فتنۂ اعرابی کی ناکامی کی وجہ سے افسوسناک ہوا، آپ کا یہ اثر عقلی و دینی ترقی میں جو محمد عبدہ کی ذات میں جلوہ گر ہوئی، جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے، پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہو گیا۔

میشیل محمد عبدہ کے سوانح حیات میں لکھتا ہے:

"آپ نے اپنے بعد انقلاب کی ایسی چنگاریاں چھوڑیں جو دہکتے ہوئے شعلوں میں نمایاں ہوتی رہیں، بلا مبالغہ ہم کہہ سکتے ہیں، کہ آزاد وطنیت کی وہ تمام تحریکات اور یورپی حکومتوں پر تنقیدی کوششیں، جن کو

(بقیہ صفحہ ۵۲) وہ سرطان کے ساتھ سطحی مشابہت رکھتا ہے، لیکن درحقیقت ایک پیدا ابرار زہر کا نتیجہ تھا، جو زہر خوردہ مسواک کے ذریعہ آپ کے ہونٹ سے پہنچا، اس واقعہ کا اکثر ترک انکار کرتے ہیں (انقلاب ایران صفحہ ۱۲ - ۹۶) رسالہ "قضا و قدر" کے مقدمہ میں جمال الدین کی زندگی کے حالات میں علاج کی مشکلات کا تذکرہ آیا ہے۔

[1] جمال الدین کے ایک خط نے الحاج مرزا حسن شیرازی کو جو ایران کے ایک زبردست مجتہد

ہم بیس سال سے مشرق میں مشاہدہ کر رہے ہیں، ان کے ڈانڈے
آپ ہی کی دعوت سے ملتے جلتے ہیں"

جمال الدین نے عوام کے دلوں میں مسلسل ہیجان پیدا کرنے اور خواص کے نفوس میں انقلابی لہر دوڑانے کے لئے جوان تھک کوششیں صرف کیں، ان کا اولین مقصد یہ تھا، کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام مسلمانوں کو متحد اور ان کی بکھری ہوئی توانائیوں کو یکجا کر کے، ایک ہی حکومت کے قبضہ میں جو ایک بہت بڑے خلیفہ کے زیر سایہ ہو، جس کی حکومت میں کوئی شریک نہ ہو، کر دیا جائے، جیسا کہ اسلام کے بابرکت زمانے اور اس کے زرین دور کا حال تھا، جب کہ وحدت ملت اسلامیہ پھوٹ اور اختلاف سے کمزور نہ ہوئی تھی، اس کے بعد ایک ایسا دور آیا، جس میں ممالک اسلامیہ جہالت اور ناامیدی کے عالم میں گھر گئے اور یورپ کے ظلم و استبداد کا شکار بن گئے۔

آپ جب یہ دیکھتے تھے، کہ امم اسلامیہ کی سرگرمیاں سرد، ان کے قوی مضمحل اور ان کی توانائیاں کمزور پڑ گئی ہیں، تو آپ کو سخت کوفت اور تکلیف ہوتی تھی، آپ کا اعتقاد یہ تھا، کہ اگر امت اسلامیہ اجنبی تسلط کا جوا اپنے کندھوں سے نکال پھینکے، اپنے معاملات میں اجنبی حکومتوں کی دخل اندازی سے آزاد ہو جائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) تھے تحریک دلائی جس کی وجہ سے انہوں نے تمباکو کی کاشت کی حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ تمام گردنیں اس فتویٰ کے سامنے جھک گئیں اور تمباکو نوشی کا بائیکاٹ کر دیا آخر کار حکومت مجبور ہو گئی کہ اس ناپسندیدہ ذخیرہ بندی کو باطل قرار دے، اس کے نتیجہ میں بادشاہ اور اس کے بڑے بڑے وزرار کو قتل کر دینے کے لئے علمار اور عوام میں دوستی اور معاہدہ کے نتائج برآمد ہوئے اور دستور مقرر کیا گیا (انقلاب ایران صفحہ ۱۵)

اسلام کی حالت سدھر جائے، اور عصرِ حاضر کی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ سازگار ہو جائے۔ تو مسلمانوں کے اندر اس قدر قوت و طاقت فراہم ہو جائے گی، کہ وہ یورپی قوموں پر اعتماد کئے بغیر یا ان کے وسائل کو استعمال کئے بغیر اپنے امور کی آپ دیکھ بھال کر لیں اور اپنے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھائیں،

آپ کا نظریہ یہ تھا، کہ اسلام تمام جوہری مسائل میں سارے عالمِ اسلامی کے لئے ایک عالمگیر دین ہے، جو اپنی روحانی قوت کے ذریعہ پوری طرح قدرت رکھتا ہے، کہ ہر صدی اور ہر دور کے بدلنے والے حالات کا ساتھ دے

آپ کے مزاج کا خاصہ یہ تھا کہ، آپ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جن وسائل کو اختیار کیا، وہ سیاسی انقلاب کے وسائل تھے، آپ کے ذہن میں یہ تصور جاگزیں ہو گیا تھا، کہ اسلامی جماعتوں کو آزاد کرانے اور ان کے معاملات کی تنظیم کے واسطے ضروری آزادی میں نشو و نما پانے کے لئے یہی انقلابی طریقہ کار زیادہ محکم اور سبک رفتار ہے، اصلاح اور تعلیم کے تدریجی وسائل کے متعلق آپ کی رائے یہ تھی، کہ یہ سب سست رفتار ہیں، ان کا انجام نامعلوم ہے،

آپ کی تمنا تھی، کہ مرنے سے پیشتر ہی اپنے نتائج اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں، اس لئے آپ نے موجودہ نظام کو تہ و بالا کر دینے کے لئے جد و جہد کی، آپ مسلمانوں کے ان امیروں اور حکمرانوں کو قتل کرنا اور ان کو معزول کر دینا جائز سمجھتے تھے، جو مغربی استبداد کی بنیادوں کو مضبوط کرتے یا ان سے رضامندی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے اس منافقانہ رویہ سے لوگوں کی آزادی اور ان کی نجات کے درمیان روڑے اٹکاتے ہیں[1]

---

[1] ایک مرتبہ جمال الدین نے پروفیسر براؤن کے ساتھ ایک گفتگو میں فرمایا "چھ یا سات سروں کو تہ تیغ کئے بغیر اصلاح کی کوئی امید نہیں" آپ نے شاہ ایران اور اس کے وزیر اعظم کا نام لیا،

اس کے باوجود آپ کے ان تمام اغراض و مقاصد اور ان وسائل کے لئے جنھیں آپ اختیار کیا کرتے تھے، ایک تخلیقی صورت تھی، جو آپ کی سرگرمیوں میں پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی جس کو کسی صورت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں آپ کو یقین محکم اور اس کی حالت کے سنورنے کے امکان میں آپ کو قوی امید تھی، یہی وہ جذبہ صادق تھا، جو ہمتوں کو بھڑکاتا تھا، اور یہی وہ امید کی کرن تھی، جو تمام کے دلوں کے تاریک گوشوں میں چمکتی تھی،

آپ نے شیعی و سنی جماعتوں کے مابین اتحاد و یگانگت کے تعلقات پیدا کرانے کے لئے جو کوششیں صرف کیں، وہ باہمی محبت اور رواداری پر مبنی تھیں، اسی لئے آپ کا یہ سیاسی خیال دینی رواداری کی روح پر دلالت کرتا ہے، جس کو آپ فرقہ ورانہ اختلافات کو، جو قدیم زمانے سے عالم اسلامی میں چلے آتے ہیں، ختم کرنے اور ملت کی منتشر توانائیوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے ناگزیر اور ضروری خیال کرتے تھے؛

تمام اسلامی علوم و معارف میں آپ کے علمی تبحر و واقفیت کی وجہ سے

(بقیہ صفحہ ۵۵ کا) یہ دونوں بعد میں قتل کر دیئے گئے (انقلاب ایران صفحہ ۵، ۴ و ۲۸۵) بلنٹ اپنی کتاب مصر کی پر اسرار تاریخ (صفحہ ۹۵ - ۱۰۱) میں کہتا ہے کہ ۱۸۷۹ء میں جمال الدین کے مددگاروں کے درمیان ان وسائل میں مناقشہ برپا ہوا جن کے ذریعہ خدیو اسماعیل کو تخت سلطنت سے معزول کرنے کا امکان ہو۔ یا اگر اس کی معزولی دشوار ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے، کرومر کا ایک بیان ہے (جدید مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۱ - حاشیہ) کہ محمد عبدہ نے کہا اسماعیل کو قتل کرنے کے بارے میں ایک معینہ روش اختیار کرنے کے لئے گفتگو اور بحث ہوئی، لیکن اس کا نفاذ کسی ایسے شخص کے نہ ملنے سے نہ ہو سکا جو اس کا کفیل بن سکے۔

ممالک اسلامیہ کے تمام علماء آپ کا دل سے احترام کیا کرتے تھے' آپ کی محفل کی طرف تشنگان علم و ادب اپنی پیاس بجھانے اور علم کی تحصیل کے لئے کشاں کشاں چلے آئے' آپ نے ان کو اسلامی و دینی فلسفہ کے تاریخی حالات اور جدید علم کے فکری نتائج کے مابین موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرانے کے طریقے سکھائے'

مصر کے اساتذہ و علماء اور آپ کے درمیان سمجھوتہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی' ان کے اس طرز عمل نے جیسا کہ محمد رشید رضا نے ملاحظہ کیا ہے۔ علوم دینیہ حاصل کرنے والے شاگردوں کی تعداد کم کر دی اور ادبی ارتقا کے مظاہر افرنگ زدہ طبقہ میں نمایاں ہو گئے۔

باوجودیکہ جمال الدین نے تعلیمی و دینی اصلاح کے لئے اپنی تمام تر توجہ صرف کی' لیکن مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے ایسے اشخاص کی تعداد تھوڑی رہی جن کے نفوس میں ان اصلاحات کی تکمیل کے لئے کوئی انقلابی کوشش پیدا ہوئی ہو۔

ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہے' کہ کس طرح آپ کی سیاسی انقلابی دعوت نے ایک شاداب سرزمین اور مستعد نفوس پائے' تاکہ ان اہل وطن نوخیز نونہال نوجوانوں کو اس کے لئے آمادہ کیا جائے' جن کے لئے سیاسی ہنگامہ انگیز میدان نے نہ صرف قومی آزادی و استقلال کو پائے تکمیل تک پہنچانے کیلئے کوئی آسان ذریعہ فراہم کیا' بلکہ اس سے بڑھکر ان کو اپنے صحیح جذبات ادا کرنے اور گہرا غور و فکر کرنے کا موقعہ عطا کر دیا' اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں' کہ ان بنیادی اصلاحات کے علمبردار اور اساسی تحریکات کے مددگار بہت کم رہے' جن کی دعوت جمال الدین نے دی تھی' جن کو سرسبز کرنے اور منکر عام

پر لانے کیلئے زیادہ سے زیادہ حصہ لینا چاہیئے تھا،

اس کے علاوہ آپ کے وہ تخلیقی آراء و افکار جو آپ کی تعلیمات کا سنگ بنیاد تھے پوری آب و تاب کے ساتھ محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کے کردار میں اپنے اثرات کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگے، محمد عبدہ آپ کے ایک مایۂ ناز شاگرد تھے آپ نے اپنے استاد کی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر آپ کے فیوض و برکات کے سرچشمہ سے سیرابی حاصل کی تھی،

جمال الدین نے اپنی کتاب "دہریوں کی تردید" کے خاتمہ میں اپنے ایک عنوان وہ امور جن پر "قوموں کی خوشحالی وسعادت کا انحصار ہے" کے تحت جن حقایق کا اظہار کیا ہے، وہ آپ کی بنیادی تعلیمات کے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں، یہ مختصر باب آپ کے ان اساسی آراء اور بنیادی نظریات پر مشتمل ہے، جن کو محمد عبدہ نے بعد میں عالم آشکار کیا، ہم یہاں اسی باب کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو استاد اور شاگرد کے باہمی فکری ربط وضبط کے بعض پہلوؤں کو واضح کر رہا ہے،

جمال الدین کہتے ہیں: قوموں کی سعادت و خوشحالی کا دار و مدار چند امور پر ہے جن کے بغیر وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتیں:

(۱) خرافات کی آمیزش اور اوہام کے لوثوں سے عقول و اذہان کی پاکیزگی اسلامی تعلیمات کا ایک ناگزیر جزو ہے، کیونکہ وہ اولین رکن، جس پر دین اسلامی کی بنیاد قائم ہے، یہ ہے کہ توحید کے صیقل سے زنگ آلود عقول کو صیقل اور ان کو اوہام و خرافات کی آمیزش سے پاک صاف کیا جائے، اس عقیدے کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے، کہ اللہ عزوجل کسی بشر یا ذی روح کے بھیس میں جلوہ گر ہو یا آئندہ ہوگا، یا اس مقدس ذات نے اپنے بعض ادوار حیات میں مخلوق

کی کسی ہستی کی مصلحت و بہتری کی خاطر شدید مصائب و آلام اور دردناک امراض برداشت کئے۔

(۳) قوموں کے نفوس میں برتری و شرف کی سمت ترقی کرنے کی تڑپ پائی جائے اور وہ اس بلندترین مقصد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں، اس طرح پر کہ ان کا ہر شخص یہ سمجھے کہ وہ کمال انسانی کے ہر مرتبہ و مقام پر، سوائے درجۂ نبوت کے، پہنچنے کے لئے سزاوار ہے، مرتبۂ نبوت تو صرف مشیتِ ایزدی سے اللہ کے خاص بندوں کو عطا ہوا کرتا ہے، جب انسانی نفوس اس کیفیت سے آراستہ ہونے لگیں یعنی مقامات شرف پر فائز ہونے لگیں، تو وہ فضائل و اخلاق کی جولان گاہوں میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے اور بہترین کردار و اصاف کے حدود پر پہنچ جائیں گے،

دین اسلام نے تمام لوگوں کے روبرو شرف و بلندی کے دروازوں کو کھول دیا ہے اور ان کے اندر داخل ہونے کے تمام راستے روشن کر دیئے اور ہر انسان کو حق و صداقت کے راستہ پر چلنے اور ہر فضل و کمال سے آراستہ ہونے کا حق عطا کیا،

اسلام برہمنوں کا مذہب نہیں، جنھوں نے لوگوں کو چار طبقات میں منقسم کر رکھا ہے اور ہر ایک کے لئے کمال فطرت کا ایک درجہ مقرر کر دیا، جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا، اسلام نہ تو یہودیت کی طرح ہے، جو محض اسرائیلی گروہ کو قابل اجلال و احترام شمار کرتا اور دوسروں کو حقارت اور توہین کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اسلام نہ مسیحی مذہب ہے، جس کا مسلک یہ ہے، کہ دین کے ٹھیکہ دار اور رہبان ہی تمام انسانوں کی بہ نسبت اللہ سے قریب ہیں، ہر وہ شخص، خواہ وہ درجۂ کمال تک ہی پہنچ جائے، اس قابل نہیں ہے، کہ دینی ٹھیکہ دار اور راہب کے بغیر اللہ کا تقرب حاصل کر سکے،

(۳) امت کے عقائد جو اس کے افراد کے اذہان ونفوس میں اولین نقش ونگار کی حیثیت رکھتے ہیں، راست براہون اور صحیح دلیلوں پر مبنی ہونا چاہئے، نیز یہ کہ امت کے افراد کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی عقلوں کو اپنے معتقدات وخیالات میں اوہام وخرافات کی وادیوں میں بھٹکنے سے محفوظ رکھیں اور ان میں اپنے آباو اجداد کی کورانہ تقلید کے پردوں کو چاک کرڈالیں، یہی کینز وفرانسیسی تاریخ تمدن کا مصنف کہتا ہے کہ

"یورپ کے تمدن کی ترقی پر جن اسباب نے اپنا گہرا اثر ڈالا ان میں سے زبردست سبب یہ تھا کہ ان ممالک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے ببانگِ دہل یہ کہنا شروع کیا کہ ہمارے عقائد کے اصول میں بحث کرنے اور ان پر دلیل وبرہان کا مطالبہ کرنے کا ہم کو حق حاصل ہے"

دین اسلامی تمام ادیان میں اس اعتبار سے اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ وہ کورانہ تقلید کرنے والوں اور بلا دلیل عقیدہ رکھنے والوں پر کاری ضرب لگاتا ہے اور اٹکل سے پیروی کرنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے، یہ دین دینداروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دینی اصول کو برہان کے ساتھ حاصل کریں، جب کبھی دین اسلام نے خطاب کیا تو عقل ہی کو اپنا مرکز خطابت ٹھرایا اور جب کبھی محاکمہ کیا تو عقل ہی کی طرف رجوع ہوکر،

بہت کم دین ایسے پائے جاتے ہیں جو اسلام کی اس امتیازی شان اور خصوصی طرز فکر کے درجہ کے برابر یا اس کے قریب ہوں، بعض ظاہری ادیان کے اکثر وبیشتر بڑے بڑے ارکان کی بنیاد کثرت کو وحدت یا وحدت کو کثرت میں ضم کردینے کے اصول پر رکھی گئی ہے، نیز یہ کہ ایک ہستی میں کثیر ہستیوں کا جمع ہوجانا یا کثیر افراد ملکر ایک ذات بن جانا یہ ایسے خرافات ہیں، جن کا عقل وبصیرت کھلم کھلا انکار کرتی

ہے، جب عقل نے اس اصول کی تردید کر دی، تو ارباب دین نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ یہ اصول نظریہ عقل کے ماوراء ہے، ہمارا فکر و ذہن نہ تو پوری طرح اس کی گہرائی تک پہنچ سکتا ہے، اور نہ اس کے بعض پہلوؤں کو معلوم کر سکتا ہے اور نہ ہی اس پر کسی دلیل کو نشان راہ بنایا جا سکتا ہے،

(۴) ہر قوم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہیئے جس کے خصوصی فرائض میں یہ داخل ہو کہ وہ تمام قوم کو تعلیم دے، اس کے علاوہ ایک اور گروہ کا ہونا بھی ناگزیر ہے، جو لوگوں کے نفوس کی اصلاح کرے ان میں تہذیب و شائستگی کے جوہر کو رونما کرے، پہلا گروہ جہالت کے عناصر کو زائل کرے اور عقلوں اور ذہنوں میں حقیقی علوم و معارف کی روشنی پھیلائے۔ دوسرے گروہ کا فریضہ ہے کہ وہ اخلاق فاضلہ کا انکشاف کرے اور ان کے حدود مقرر کرے، کیونکہ نفسانی شہوتوں کے لئے بذات خود کوئی حد نہیں، جہاں پر وہ آکر رک جائیں، نہ تو نفس کی خواہشوں کے لئے کوئی انتہا ہے جہاں تک پہنچ کر وہ اپنا رشتہ منقطع کر لیں اگر لوگوں کے درمیان اس قسم کی زیادتیوں کو روکنے والا، اخلاق کو درجۂ اعتدال پر قائم رکھنے والا اور نفوس کی تہذیب و اصلاح پر قابو پانے والا کوئی نہ رہے، تو شہوت کا فرمان روا سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا اور ظلم و استبداد اور خرابی و فتنہ پیدا کر دے گا، دین اسلامی میں یہی دو فرض اہم دینی ارکان میں شمار ہوتے ہیں،

(۱) معلم کا قیام تعلیمی فرائض انجام دینے کے لئے

(۲) مصلح و مودب کا انتخاب جو نیک کاموں کا حکم کرنے والا اور برائیوں سے روکنے والا ہو،

اسلام ہی ایک تنہا دین ہے، جس کے ذریعہ سے قوموں کی سعادت و خوشی

کی تکمیل وابستہ ہے،

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر اسلامی دیانت کی حقیقت وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی، تو کیا وجہ ہے کہ آج ہم مسلمانوں کو ابتر حال اور افسوسناک اور مالوس کن دور میں دیکھ رہے ہیں؟ اس کا جواب قرآن مجید کا یہ اٹل قانون ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ سورہ ۱۳۔ آیت ۱۲	اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا، تا قتیکہ وہ خود نہ بدل جائے

جمال الدین کی عالمگیر شخصیت کی تصویر اور آپ کے ہرجہتی اثر کا خاکہ مجمل طور پر دو مورخوں نے کھینچا ہے، ان میں سے ایک مغربی عالم اور دوسرا مشرقی مصنف ہے،

اول الذکر پروفیسر ای۔جی۔ براؤن ہے جو جمال الدین کی شان میں کہتا ہے:

"یہ ایک شخص تھا قوی اخلاق اور مضبوط کردار والا، علم کا بحرِ ذخار، اس کا دامن عمل وفور نشاط سے مالا مال، جس میں ضعف و اضمحلال کا نام و نشان ناپید، جری، بہادر، فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ، جس کا مقابلہ نہ خطیب کر سکے اور نہ مصنف، اس کے بشرہ سے دلوں میں ہیبت، عظمت اور جلال کے آثار پیدا ہو جاتے۔

فلسفی، مصنف، خطیب، صحیفہ نگار، اس سے بڑھکر وہ ماہر سیاستدان تھا، اس کی شخصیت پر اظہار تعجب و حیرت کرنے والوں کی نظر میں بہت بڑا وطن پرست تھا، لیکن اس کے مخالفین اور دشمن اس کو خطرناک

فتنہ پرداز اور آشوب انگیز شمار کرتے تھے"

دوسرے سوانح نگار جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تراجم مشاہیر الشرق" میں جمال الدین کا تذکرہ لکھا ہے، یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ "جمال الدین کی علمی سرگرمیوں اور مجاہدانہ کوششوں کی غرض و غایت اور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا محور اتحاد عالم اسلامی تھا" مصنف مذکور لکھتا ہے:

"جمال الدین نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری جدوجہد صرف کر دی اور اسی راستہ کو اختیار کرکے دنیا سے قطع تعلق کر لیا، نہ تو شادی کی اور نہ کوئی پیشہ اختیار کیا، لیکن اس کے باوجود آپ کے اس ارادہ کی تکمیل اپنی زندگی میں نہ ہو سکی، آپ اسی حالت میں وفات پا گئے کہ اپنے فرزندان افکار میں سے سوائے ایک رسالہ "دہریوں کی تردید" اور مختلف مقامات میں لکھے ہوئے مختلف و متفرق رسائل کے، جن کا تذکرہ اوپر ہوا ہے، اور کوئی شہکار نہ چھوڑا مگر آپ نے اپنے دوستوں اور مریدوں کے دلوں میں ایک زندہ و تابندہ روح دوڑائی جس نے ان کی ہمتوں کو جوش زن اور ان کے قلم کو تیز رو بنا دیا، مشرق نے ان کے کارناموں سے نفع اور فیوض سے سیرابی حاصل کی اور کرتا رہے گا۔"

دوسرا باب

محمد عبدہ کے حالات زندگی

(۱) ابتدائی دور

(۱۸۷۷ —— ۱۸۴۹)

جب آخری مرتبہ جمال الدین نے اپنے مصری دوستوں اور شاگردوں سے مصر سے کوچ کر جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے ۱۸۷۹ء کو نہر سویز میں رخصت ہوتے وقت فرمایا

"میں نے تمہارے لئے شیخ محمد عبدہ کو چھوڑا ہے، مصر کے لئے اس قسم کا ایک عالم کافی ہے"

محمد عبدہ کی عمر اس وقت تیس برس کی تھی، آپ تقریباً آٹھ سال تک جمال الدین کی صحبت میں رہے اور شرف تلمذ حاصل کیا، تعلیمی مشق شروع کر چکے تھے، اپنی دونوں اولین کتابیں نشر کی تھیں، مقالات تک لکھنے میں اکثر حصہ لیا جن کے ذریعہ اخباروں اور رسالوں میں عام امور و مسائل کی پیچیدہ گتھیاں سلجھایا کرتے تھے، آپ کی ممتاز شخصیت، آپ کا علم و ادب سے شغف اور ان تمام چیزوں سے جن کا تعلق سوسائٹی کی اصلاح اور اس کے نظام کی درستگی سے ہے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے،

آپ جمال الدین کے شاگردوں میں سے قریب ترین شاگرد اور اپنے استاد کے آراء و افکار کے بہت زیادہ آئینہ دار تھے، یہ امر فطری تھا، کہ جمال الدین اپنی نظر التفات محمد عبدہ پر مرکوز کر دیں تاکہ آپ کے فطری جوہر کو نمایاں اور آپ

کی استعداد کو چمکا دیں، حالانکہ اس سے پیشتر جمال الدین قاہرہ کے حالات کے مدنظر اپنے اس کام سے ہٹ جانے پر مجبور ہو گئے تھے، جس کو آپ نے مصر میں شروع کیا تھا، اب حسن اتفاق سے آپ کو ایک ایسا مایہ ناز شاگرد مل گیا، جو آپ کی دعوت و تحریک کے پھیلانے میں صحیح معنوں میں ممد و معاون ثابت ہونے والا تھا۔

جب مصر میں آپ نے محمد عبدہ کو اپنا جانشین بنایا، تو انھوں نے مصر اور اسلام کے لئے ایسی میراث چھوڑی، اور ایسی نمایاں علمی یادگاریں چھوڑیں جو اوروں سے حتیٰ کہ خود جمال الدین سے بھی ناممکن تھیں،

مصری اصلاح کا وہ سرچشمہ، جو اگرچہ مختلف سرچشموں سے جو ملکوں کے حدود سے متجاوز ہو چکے تھے، پھوٹ نکلا تھا، اب اس کی تقدیر کے دھارے بہنے والے تھے، اور اس کا فیضان کامل مصر کے گلی کوچوں میں اپنے پورے شباب سے جاری ہونے والا تھا، محمد عبدہ خالص مصری تھے، آپ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا، جو بحری سمت میں کسانوں کے طبقہ کیطرف منسوب تھا، ۱۸

سلسلہ نسب - درحقیقت آپ کے باپ عبدہ بن حسن خیر اللہ، ترکی نژاد خاندان کیطرف منسوب تھے، جو ایک زمانے سے صوبہ بحیرہ میں آباد ہو چکا تھا، آپ کی ماں مغربی صوبہ میں طنطا کے قریب کے ایک دیہات میں رہتی تھیں۔ جن کا تعلق ایک بہت بڑے مشہور خاندان سے تھا، جس کا سلسلہ نسب قبیلۂ بنی عدی تک پہنچتا ہے، جس کی طرف عمر بن خطاب خلیفۂ دوم منسوب ہیں، لیکن یہ دونوں قبیلے سرزمین مصر میں اترے اور یہیں عرصۂ دراز تک سکونت پذیر ہو گئے، یہ مصری کسانوں کے رنگ میں رنگے گئے اور ان کی خصوصیات سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کی،

مقامِ ولادت اور عہدِ طفولیت

۱۸۴۹ - ۱۸۶۵ء

تحقیقی طور پر ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کہاں پیدا ہوئے اور نہ ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کس سن میں پیدا ہوئے؛ اگرچہ اکثر لوگوں نے آپ کا سن ولادت ۱۸۴۹ء (۱۲۶۶ھ) تسلیم کیا ہے، خود محمد عبدہ نے اپنے مکتوب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، آپ نے ۱۲۶۵ھ بھی ذکر کیا ہے، آپ کی تاریخ ولادت میں بیشمار روایات ہیں، حتیٰ کہ بعضوں نے بیان کیا ہے کہ آپ ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے،

محمد علی پاشا (۱۸۰۵ - ۱۸۴۹) کی حکومت کے خاتمہ پر آپ کے باپ اپنے دیہات سے وہاں کے صوبہ کے حاکموں کے ظلم و جور کے خوف سے گھبرا کر بھاگ نکلے اور مغربی صوبہ کی طرف رُخ کیا، جہاں انھوں نے چند سال کے عرصہ ہی میں متعدد دیہاتوں میں نقل مکان کیا، اس اضطراب انگیز دور میں یہ اپنی بیوی سے جا ملے اس اثناء میں محمد عبدہ کتم عدم سے عالم وجود میں قدم دھر چکے تھے، چند سال کے بعد، جب کہ ان کے صاحبزادہ ابھی تک گود میں تھے، اپنے خاندان کے ساتھ محلہ نصر واپس آئے اور ایک جاگیر خریدی؛

یہاں محمد عبدہ نے چھوٹے دیہاتی بچوں کی طرح پرورش پائی؛ پیرا کی، اسپ رانی، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں مہارت حاصل کی، دیہاتی زندگی آپ کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی، بڑھاپے تک آپ نے اس کو پسند کیا،

آپ کی جوانی کا بیشتر حصہ وقار و شرف کی جن صفات سے ممتاز تھا، ان میں دیہاتی عادات اور زندگی کے بہترین مظاہر کا عکس جھلکتا ہے، آپ کا

دل قومی ضروریات کے احساس اور اُمت کی ترقی کے جذبات سے جو معمور تھا، وہ آپ کی ابتدائی دیہاتی زندگی کا نتیجہ ہے، جب کہ آپ لوگوں کی زبانی وہ حالات و واقعات سنا کرتے تھے، جو محمد علی کے زمانے سے ہوتے آرہے تھے، مصر میں جو سن رسیدہ اشخاص تھے، ان کے ذہنوں میں محمد علی کی تصویر کے نقوش نہایت گہرے ہو چکے تھے وہ عرصہ دراز سے حکومت کے ظاہر فریب شان و شوکت کے مظاہر سے مرعوب ہو چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے، کہ محمد عبدہ کے باپ اخلاق و مروت کے آئینہ دار تھے، اگرچہ وہ علم و ادب سے بہرہ ور نہیں تھے جیسا کہ آج تک مصر کے عام اور اوسط طبقہ کی شان ہے، محمد عبدہ نے اپنی جو خود نوشت سرگذشت لکھی ہے، جس کو بدقسمتی سے مکمل نہ کر سکے، اس میں آپ اپنے والد کا تذکرہ نہایت احترام اور عزت سے کرتے ہیں، آپ بیان کرتے ہیں کہ تمام دیہات والے آپ کے والد کا نہایت احترام کیا کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ آپ کے والد اس وقت خوشحال تھے، یہاں تک کہ ان میں اتنی استطاعت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے اپنے گھر میں ایک معلم رکھا اس طرح محمد عبدہ کے لئے تعلیم کا ایک ایسا اچھا موقع فراہم ہو گیا، جس سے آپ کے دوسرے بھائی محروم رہے حالانکہ بظاہر آپ کے والد کی جائیداد اور ان کا اجتماعی مرکز دیگر چھوٹے کسانوں کے مرکز سے کوئی بلند درجہ کا نہ تھا،

جب محمد عبدہ کی عمر دس برس کی ہوئی اور اس عمر میں آپ کی نوشت و خواند کی حالت بہت درست ہو چکی تھی، تو آپ کے والد نے ایک حافظ قرآن کے پاس بھیجا آپ نے اس سے دو سال کی مدت میں سطح قلب سے قرآن حفظ کر لیا، لوگ خیال کرنے لگے کہ اس قلیل مدت میں کامیابی کے ساتھ آپ نے

جو قرآن حفظ کیا، یہ سب حافظ کے حسن اہتمام اور لطف التفات کا نتیجہ تھا، یہ تعلیم کا وہ اولین درجہ تھا، جو محمد عبدہ جیسے خاندان کے بچوں کے لئے اس وقت اپنے اجتماعی مرکز میں بہت سہل اور آسان تھا۔ جب کوئی بچہ اس نہج کی تعلیم چند عرصہ تک جاری رکھے اور اس میں تحصیل کر لے، تو اس میں اتنی قدرت پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ اسلامی علوم کے شعبوں میں عالم یا فقیہ ہو جائے، جہاں وہ بے شمار شرعی احکام سے وافر حصہ حاصل کر سکتا تھا، اس وقت وہ ان کو بخوبی سمجھ سکتا اور ان کے مابین تطبیق دے سکتا تھا لیکن حکومت نے اس زمانے میں مغربی طرز پر جن مدارس کی تشکیل کی تھی، وہ ملازم پیشہ اشخاص کے بچوں پر موقوف تھے۔

جب اس نہج پر محمد عبدہ کی بنیادی تعلیم ہوئی، تو آپ تیرہ سال کی عمر میں طنطا کے جامعہ احمدی میں ۱۸۶۲ء میں شریک ہو گئے، تاکہ یہاں فنون تجوید کے مطابق، جو دینی تعلیم کا ایک رکن تھے، حفظ قرآن اور تجوید کو درست کریں آپ کے ایک بھائی اس وقت اسی جامعہ میں مدرس تھے، جو قرأۃ اور تجوید میں مشہور تھے،

دو سال تک اس نہج پر درس حاصل کرنے کے بعد آپ نے عربی قواعد حاصل کرنا اور اس کے رموز و نکات سمجھنا شروع کیا، علم لغت کی ضخیم اور بسیط کتابوں کے پڑھنے سے آپ کی کمسنی نے جواب دے دیا، اس دور کے نظام تعلیم کی رو سے آپ پر یہ فرض کر دیا گیا تھا، کہ سطح قلب سے اجرومیہ کا متن اور اس کی شرح کو حفظ کر لیں،

محمد عبدہ اپنی خود نوشت سوانح میں، جہاں اپنی طالب علمی کا تذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں "مجھے اس مدرسہ میں آئے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا لیکن یہاں کے طریقۂ تعلیم کی خرابی کی وجہ سے میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا کیوں کہ

مدرسین ہمارے روبرو نحوی یا فقہی اصطلاحات بیان کیا کرتے تھے، جو ہماری عقل وفہم سے بالاتر تھیں، ناواقف طلبار کو ان اصطلاحات کے معنیٰ سمجھانے اور ان کی تشریح کی طرف ان کو پرواہ ہی نہیں ہوتی تھی"

جب آپ کامیابی سے ناامید ہو گئے، تو جامعہ احمدی سے بھاگ نکلے اور اپنے ماموؤں کے پاس تین مہینے تک روپوش رہے، پھر آپ کے بھائی کو اطلاع ملی تو پھر طنطا واپس بلالیا، محمد عبدہ کو یقین ہو چکا تھا، کہ آپ کو اس علم میں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی، چنانچہ آپ نے اپنا مال ومتاع باندھ لیا اور یہ ارادہ کرکے اپنے گاؤں کی طرف لوٹ گئے، کہ یہاں زراعت کے کاروبار میں مصروف ہو جائیں، جیسا کہ یہاں آپ کے اکثر رشتہ دار یہ پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے، آپ نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ پھر علم حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ کریں گے، پھر آپ نے سولہ سال کی عمر میں ۱۸۶۵ء میں شادی کرلی،

اسی واقعہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے:

"پہلا اثر تھا، جو طنطا کے طریقہ تعلیم نے میرے دل میں گھر کرلیا، جو یہی طریقہ ازہر میں بھی ہے، یہی اثر ۹۹ فیصد اشخاص میں پایا جاتا ہے جن کو ان کی قسمت ساتھ نہیں دیتی، کہ وہ تعلیم کے اس طریقہ کو صبر واستقلال کے ساتھ حاصل کرسکیں، یعنی استاد طالب العلم کی سمجھ اور استعداد کو پیش نظر رکھے بغیر ضروری وغیر ضروری چیزیں اس کے ذہن ودماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اس کے باوجود اکثر طلبار ایسے ہیں جو سمجھتے تو کچھ نہیں، لیکن خودغرضی سے یہ گمان کرتے ہیں کہ انھوں نے کچھ سمجھ لیا ہے، وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مردوں کی عمر تک پہنچ جاتے ہیں. لیکن

خود خواب طفلی میں بدمست رہتے ہیں، پھر لوگ ان کے ذریعہ عجیب بلاؤں میں گھر جاتے اور قوم گوناگوں مصائب سے دوچار ہو جاتی ہے اور پیچیدگیاں اور دشواریاں بڑھ جاتی ہیں"

جس وقت محمد عبدہ نے تونس کے علماء کے ایک گروہ سے ملاقات کی تو ان کے روبرو مروجہ نظام تعلیم کے فاسد طریقوں اور ان کے برے اثرات کو بیان کرتے وقت اپنے اسی ناخوشگوار آغاز کی طرف اشارہ کیا، طرز تعلیم کے بارے میں ان سے گفتگو کی اور تعلیمی مسائل کے دوران میں عربی قواعد کی تعلیم کے لئے صالح طریقوں کو اختیار کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالی

آپ کا درس و تعلیم سے گریز آپ کو اپنے تقدیری فریضہ سے نجات دلانے والا نہ تھا، ابھی آپ کی شادی کو ہوئے چالیس دن نہ گزرے تھے کہ آپ کے والد نے آپ کو مشیت ایزدی کو پورا کرنے کے لئے طنطا واپس لوٹنے پر مجبور کیا، لیکن آپ راستہ میں بھاگ نکلے اور اپنے بعض رشتہ داروں کے پاس روپوش ہو گئے۔

محمد عبدہ کہتے ہیں "یہاں میں نے ایک ایسے استاد کو پایا، جس نے مجھے سکھلایا کہ میں علم کو اس کے قریب سے کس طرح حاصل کر سکتا ہوں میں نے اس کی غیر فانی لذت محسوس کی اور طلب علم میں پیہم کوشش کی"
یہی وہ شخص تھا، جس نے محمد عبدہ کی خلوص دل سے خیر خواہی کی، اس نوجوان کے دل میں، جو تعلیم سے روگرداں ہو چکا تھا، علمی محبت کے جذبہ کو بیدار کیا اور اس کے سینہ میں دینی زندگی کے لئے جوش و حمیت کے شعلے بھڑکا دیئے اس طرح اس نے آپ کی زندگی کے سارے اوراق الٹ کر رکھ دیئے، یہ شخص آپ کے والد کا ایک ماموں تھا، جس کا ... الشیخ درویش خضر

تھا، اس سے پیشتر وہ صحرا لیبیا کا سفر کر چکا تھا، جہاں وہ طرابلس الغرب تک پہنچا تھا، یہاں اس نے سید محمد مدنی کی صحبت اختیار کی اور ان سے بعض علوم اسلامیہ حاصل کئے، انہی سے بعض صوفیانہ طریقے سیکھے، اسے فقہ و حدیث کی بعض کتابیں اچھی طرح یاد تھیں، ایک خاص طریقہ پر قرآن حفظ کیا تھا اور اس کو سمجھے ہوئے تھا، اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے گاؤں کی طرف واپس آیا اور زراعت کے کاروبار میں مشغول ہو گیا، جیسا کہ وہاں کے کسانوں اور باشندوں کی گذر معاش کا یہی ذریعہ تھا،

محمد عبدہ بیان کرتے ہیں، کہ جس وقت آپ گاؤں میں آئے، تو اس کے دوسرے دن صبح میں آپ کے پاس شیخ درویش آئے، آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جس میں اخلاقی تعلیمات اور کچھ صوفیانہ معارف تھے، نیز اس میں صوفیاء کی وہ باتیں درج تھیں، جو نفس کو مکارم اخلاق سے آراستہ کرنے اور ان کا خوگر بنالنے کے متعلق تھیں، درویش نے محمد عبدہ کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا کہ اس میں سے ان کے لئے کچھ پڑھ کر سنائیں۔ آپ نے انکار کر دیا، کیونکہ آپ پڑھنے اور پڑھنے والوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے، آپ نے کتاب دور پھینک دی، شیخ آپ سے لطافت آمیز گفتگو کرتے رہے اور گہری سنجیدگی کا اظہار کرتے رہے، چنانچہ آپ نے کتاب اٹھالی اور ان کو چند سطریں پڑھ کر سنائیں، شیخ پڑھی ہوئی عبارت کی تشریح نہایت دلنشیں اور واضح انداز میں سمجھاتے رہے، جس سے آپ کی وحشت کم ہوئی اور ان کا انداز دل میں اترتا گیا،

تھوڑی دیر کے بعد دیہاتی لڑکے اپنی حسب عادت ورزش کے لئے محمد عبدہ کو بلاتے ہوئے آئے، آپ نے کتاب پھینک دی اور ان کے ساتھ ہو گئے، شیخ

عصر کے بعد وہی اپنی کتاب ساتھ لئے ہوئے آئے اور آپ سے اصرار کیا کہ اسی میں سے کچھ پڑھ کر سنائے، دوسرے دن بھی ایسا ہی کیا، تیسرے دن تو زیادہ دیر تک پڑھکر سناتے رہے، اب کتاب سے دلچسپی ہوگئی، خود بخود پڑھنے لگے، جب کبھی کسی مشکل عبارت پر سے گذرتے، تو اس پر نشان لگا دیتے تاکہ شیخ سے اس کو دریافت کریں، پانچواں دن جب آیا، تو آپ کے اندر کچھ تاب وہمت پیدا ہوچکی تھی اور کتاب پڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، یا تو یہ حال تھا کہ پڑھنے سے نفرت کیا کرتے تھے، یا یہ عالم ہے کہ وہی چیزیں مرغوب نظر اور پسند خاطر ہو گئی ہیں، شیخ نے آپ کو صوفیانہ تعلیمات اور ان کے اذکار سکھلائے، قرآن فہمی کے لئے چند ابتدائی اسباق سمجھائے، آپ کے دل میں ایک ایسی ناقابل انکار اور عرفانی حقیقت کی شمع روشن کردی، جس کو آپ وحی کے قائم مقام سمجھنے لگے وہ حقیقت یہ تھی کہ "جو مسلمان عدل وانصاف نہیں کرتا اور سچ نہیں بولتا وہ سچا مسلمان نہیں"

محمد عبدہ پندرہ دن تک شیخ کی صحبت میں رہے، اس کے بعد طنطا کے مدرسہ میں اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے واپس لوٹ گئے، مگر کون سے دل کے ساتھ؟ آپ کے نفس میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوچکی تھی، آپ کا نظریۂ حیات بدل چکا تھا، اس قلیل وقفہ میں آپ کی دینی زندگی پر جذبات تصوف غالب ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے آٹھواں دن گذر رہا تھا، کہ آپ نے اللہ کا ذکر ایک خاص طریقہ پر کرنا شروع کردیا، جس کو شیخ درویش نے بیان کیا تھا۔ اسی طرف محمد عبدہ فرماتے ہیں:

"شیخ کے ارشاد پر میں نے آٹھویں دن سے عمل شروع کردیا، چند ہی دن گزرے تھے کہ میں نے کیا دیکھا کہ میں خود بخود ایک اور

عالم کی طرف پرواز کر رہا ہوں، جو موجودہ عالم کے ماسوا ہے۔ فضا جو اب تک تنگ اور محدود تھی۔ میرے لئے وسیع ہو گئی، دنیا جو میری آنکھوں میں بہت بڑی تھی، اب چھوٹی ہو گئی، بارگاہ قدس کی طرف دلی کشش اور عرفان ربانی کی رغبت جو میری نظر میں ہیچ تھی، اب بیدار ہو گئی اور اس کی شان و عظمت دو بالا ہو گئی، میرے سامنے سے غم و تردد کے سارے بادل چھٹ گئے، صرف ایک جذبہ پیش نظر رہا وہ یہ کہ میں زاہد کامل (ادب[1] نفس میں پختہ کار) ہو جاؤں میرے روبرو کوئی ایسا امام اور رہبر نہیں تھا، جو میرے اس دلی میلان کی طرف رہبری کرے، مگر حسن اتفاق سے مجھے ایک رہبر کامل یعنی وہی شیخ مل گیا، جس نے مجھے چند ہی دن کے اندر زندان جہالت سے نکال کر معرفت کی وسیع فضا میں پہنچا دیا اور تقلید کی زنجیروں کو توڑ کر توحید کی منزل پر کھڑا کر دیا .... وہی میری سعادت و خوش بختی کی کلید ہے اور اس دینوی زندگی میں سعادت کا موجب تھا تو وہ ہی، اسی نے میرے فطری جوہر کو نمایاں کیا اور میری آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے۔"

یہ تجربہ و مشاہدہ محمد عبدہ کی زندگی میں ایک عہد جدید کا پیش خیمہ تھا شیخ درویش نے آپ کے دل میں تصوف کا جذبہ پیدا کر دیا، یہی جذبہ رفتہ

---

[1] یہاں صوفیانہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، معرفت سے مراد وہ نور قدسی ہے جو دل میں ڈالا جاتا ہے، آداب نفس کے معنی زہد اور تقشف کے ہیں، نیز ریاضت اور عبادت کے ذریعہ نفس کا مجاہدہ اسطرح کیا جائے کہ نفس کے ادنیٰ درجوں سے اعلیٰ مراتب تک یعنی نفس کاملہ تک پہنچنے کے لئے مرید اپنے شیخ کے قدم بقدم چلے ۱۲۔

رفتہ رفتہ نشوونما پانے لگا، یہاں تک کہ یہ آپ کی زندگی میں ایک اہم موثر ہوگیا۔
اسی زمانے میں شیخ ایک نوجوان طالب علم کے لئے رہبر امین اور ناصح حکیم بن گئے، لیکن آپ کے دوسرے معلم اور استاد اعظم جمال الدین کو یہ فضل و شرف حاصل ہے کہ آپ نے محمد عبدہ کو تصوف کے سمندر میں ڈوب جانے سے نجات دلائی اور آپ کی توجہ کو علم کے وسیع میدانوں اور نتیجہ خیز علمی کوششوں کی طرف پھیر دیا۔

(۲)

محمد عبدہ بحیثیت طالب علم وصوفی کے

(۱۸۶۵ ——— ۱۸۷۷)

محمد عبدہ شیخ درویش کی صحبت میں دو ہفتہ تک رہنے اور ان کے ارشادات ونصائح کو سننے کے بعد اکتوبر ۱۸۶۵ء میں طنطا کے کالج کی طرف واپس ہو گئے اور دو استادوں سے علم سیکھنا شروع کیا، جن سے اس سے پہلے بھی درس حاصل کر چکے تھے، یہ دیکھ کر آپ کو رشک ہونے لگا، کہ آپ کا نفس خمار عقلی سے ہوش میں آچکا اور علمی شوق و ذوق سے ہمکنار ہو چکا ہے، نیز آپ کو خوشی ہونے لگی کہ آپ جو کچھ پڑھتے یا سنتے ہیں اس کو سمجھ لیتے ہیں جب دوسرے طالب علموں نے آپ کا یہ حال دیکھا، تو آپ کے اردگرد جمع ہونے لگے، تاکہ کتاب کے سمجھنے اور پڑھنے میں آپ ان کی امداد کریں، چند ماہ بعد آپ کو جامعہ ازہر میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، یہ درس گاہ اسلامی علوم کے لئے قاہرہ میں بہت شہرت رکھتی تھی، اس کو اکثر جامعۂ ازہریہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس جامعہ کی ابتدا ۹۷۰ء سے ہوتی ہے۔ جس کو خلیفہ فاطمی ابو تمیم معد (جو معز لدین اللہ سے مشہور ہے ۹۵۲ء - ۹۷۵ء) کے قائد جوہر صقلی نے مصر فتح کرنے کے ایک سال بعد بنایا تھا، اپنے ملک کا جدید پائے تخت قاہرہ بنانے اور اس میں اپنے لشکر کو اتارنے کے بعد ان کے لئے ایک مسجد تعمیر کی۔ اس کے بعد خلفائے فاطمین نے اس میں اضافہ کیا، جب کہ انھوں نے اپنے ملک کا دارالسلطنت قاہرہ کو قرار دیا، اس کے لئے بہت سے اوقاف مقرر کر دیئے، اس کے صحن میں

ایک شاندار مدرسہ کی تاسیس کی، بہت سے حکام نے یکے بعد دیگرے صدیوں کے درمیان مسجد کی عمارتوں میں اضافہ کیا اور اس کے لئے اوقاف مقرر کئے اس مدرسہ کی شہرت دینی و علمی اعتبار سے تمام عالم اسلامی میں پھیل گئی، وہ علمی درسگاہیں جو ازہر کے مقابلہ میں زیادہ قدیم اور جو کسی وقت علم عرفان کا گہوارہ تھیں، مشرق میں مغلوں کی جنگ اور ان کی فتنہ انگیزیوں کے اثر اور مغرب میں مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت اور عظمت و وقار کو زوال آگیا تھا،

اس وقت ازہر نے مجد و کمال کی بلند چوٹی تک پہنچنے کے لئے جد و جہد کی اپنے مقام کی حفاظت کی اور متعدد صدیوں تک اسلامی علوم کی عظیم الشان درس گاہ میں شمار ہوتا رہا، تمام عالم اسلامی کے اکناف و اطراف سے طالبان علم اپنی تشنگی بجھانے کے لئے اس سرچشمہ کیطرف کشاں کشاں آنے لگے۔

مدرسۂ ازہر جامعۂ ازہریہ سے مشہور ہے، کیونکہ اس میں بلند پایہ اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن درحقیقت یہ جامعہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے مغربی اصطلاح یعنی یونیورسٹی کے معنی میں مستعمل نہیں، ازہر کے علوم دینی ہیں، جن میں طلباء اپنے علمی رجحانات کے مطابق کوئی خصوصی شعبہ اختیار کرتے ہیں، جس میں وہ قانون داں وکیل بن کر نکلتے ہیں یا مختلف قانونی و شرعی عدالتوں کے منصف و قاضی یا عربی زبان یا اس کے علاوہ ان علوم کے مدرس بنتے ہیں، جن کی تعلیم ازہر میں دی جاتی ہے، یا مسجدوں کے امام یا خطیب ہوتے ہیں، یا فقہا و جو عام و خاص محفلوں میں قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے والے ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ عوام کی نظر میں ان کے امام اور دینی معلم کہلاتے ہیں، ان تحقیقی علوم میں قرآن کی صحیح تفسیر، علم کلام اور دیگر اسلامی

احکام شامل ہوتے ہیں،

کئی صدیوں سے ازہر میں تعلیم کی روح ایک نقالی اور تقلیدی حیثیت اختیار کر چکی تھی، اس کی اولین غرض و غایت علمی تحقیقات میں پیش قدمی کرنے کی رغبت کے لئے بحث و تفتیش نہ تھی، بلکہ اس کا بیشتر مقصد یہ تھا کہ اسلاف نے جو علمی ذخیرہ چھوڑا ہے اس کو بغیر تحریف و تغیر کے آنے والی نسلوں کے سپرد کیا جائے

اس طرح تیسری صدی ہجری کے وسط سے دینی ماخذوں اور کسی نظر و رائے کی پیداوار کے لئے مستقل بحث و نظر کے دروازوں کو بند کر دیا گیا اس عہد پارینہ کے ان باقیماندہ آثار کو دین کا سرچشمہ اور اس کا ماخذ قرار دے دیا گیا، آنے والی نسلوں کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ اسلاف کے ان مقررہ علوم و مسائل اور ان کے بیان کئے ہوئے معانی و مطالب کے دائرہ سے ایک قدم بھی تجاوز نہ کریں۔

یہ تقلیدی روح مختلف علوم و فنون میں اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی، ان میں زیادہ اہم علوم نقلیہ تھے مثلاً علم کلام یا علم توحید، تفسیر، حدیث فقہ اور اصول فقہ ان تمام کو وحی الٰہی سمجھ لیا گیا تھا، اسی لئے ان میں بحث و نظر اور تنقید و تبصرہ کو ناقابل معافی جرم تصور کر لیا گیا، بلکہ اسلاف نے جیسا کچھ ان کو مرتب کیا تھا بعینہ سنبھال رکھا ، یہ علوم اور اسی طرح علم تصوف اور علم اخلاق علوم مقاصد کا درجہ رکھتے تھے یعنی یہ ایسے علوم تھے جو نظری طور پر بذات خود ان کی تعلیم دی جاتی تھی، اس درجہ کے قریب علوم عقلیہ تھے مثلاً نحو، صرف، عروض، بلاغت جس میں تینوں شعبے (معانی، بیان، بدیع) شامل تھے، منطق، علم مصطلح الحدیث اور علم ہیئت، جو غالباً علمی اغراض کے لئے

سکھلایا جاتا تھا یعنی جنتریوں اور نماز کی میقات کی تحدید کے لئے یہ تمام علوم علوم وسائل سے موسوم تھے یعنی یہ ایسے علوم تھے جو علوم عقلیہ کے سمجھنے کا وسیلہ تھے۔

قرون وسطیٰ سے بعض دوسرے علوم مثلاً ادب، تاریخ، جغرافیہ، علوم طبیعیہ اور ریاضیات کی طرف بے توجہی برتی جارہی تھی، اگر ازہر میں ان کی تعلیم دی جاتی تھی، تو یہ ثانوی حیثیت رکھتی تھی،

اساتذہ طلبہ کو جو ان کے ارد گرد حلقہ باندھ کر بیٹھا کرتے تھے، کتاب پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے، ان کا اعتماد زیادہ تر کسی ایسے مؤلف کے متن پر ہوتا تھا، جو اس موضوع کا استاد یا چوٹی کا مصنف سمجھا جاتا تھا لیکن شاذ و نادر ہی طلبا، کتاب کی عبارت کو سمجھ سکتے تھے، بلکہ طالب علم کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ اس متن پر کسی مابعد شارح کی شرح کو، یا اس شرح کے حاشیہ کو، جسے کسی جدید مولف نے لکھا ہے، یا تعلیقات کے حاشیہ کی تقریر کو زبانی یاد کرلے، درس کی نوعیت یہ تھی کہ مصنف نے جن اصطلاحات کو استعمال کیا ہے، ان کی توضیح اور ان کی باریکیاں بیان کردی جاتی تھیں، جب طالب علم ان شرحوں یا حاشیوں کو اپنے دل سے حفظ کرلیتا، تو سمجھ لیا جاتا کہ اس نے موضوع کو سمجھ لیا ہے،

ازہر میں طریقۂ تدریس اور نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے وقتاً فوقتاً بہت سی کوششیں ہوتی رہیں لیکن ان سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہ ہوا، باوجودیکہ محمد علی پاشا ان پڑھ تھا مگر وہ مغربی علوم و فنون کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھا، اس نے ان علوم کو ازہر میں ترکیب کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ ۱۸۲۶ء کو اس نے ایک پہلا علمی وفد پیرس کی طرف روانہ

کیا، تاکہ مغربی علوم کو ازہر میں ان اشخاص کے ذریعہ شامل کیا جائے۔ جنھوں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی، اس نے مختلف اکثر بیشتر مغربی اور فرانسیسی تصانیف کو عربی میں ایک خاص طور سے منتقل کیا، لیکن اس اصلاح کے لوگ مخالف ہو گئے اور انھوں نے ایسی قدیم درسگاہ میں ایک جدید درج کو داخل کرنے سے انکار کر دیا،

تقریباً اسی دور (۱۸۲۷ء) میں ازہر میں شیخ طنطاوی جوہری نے، جو بعد میں ادب عربی کی تدریس کے لئے سان پطرسبرگ میں روانہ ہوئے، مقامات حریری کا درس آغاز کر دیا تھا، یہ مقالات کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس نے کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے اس نے بارھویں صدی عیسوی میں سجع و قافیہ کی بنا ڈالی، یہ اپنے مشکل اسلوب، اپنے کثیر مفردات اور بعض افکار و جذبات کی آزادانہ تعبیر کی رو سے بہت مشہور رہے، اس سے پیشتر ازہر میں اس قسم کی تعلیم کا کوئی وقعہ نہ آیا تھا۔

ازہر میں محمد عبدہ کے شریک ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر خدیو اسماعیل اپنے ملک کو یورپی ممالک کے سانچہ میں ڈھالنے میں مصروف تھا، نیز اس نے ازہر کی نئے سرے سے اصلاح کا ارادہ کیا، اس زمانے کے شیخ ازہر شیخ محمد عباسی مہدی نے بھی اس کی تائید کی[1] تعلیم کے طریقوں اور ادارہ کی تنظیم میں بے شمار اصلاحات نافذ ہو گئے، منجملہ ان کے چند ارکان کی

---

[1] شیخ عباسی ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۲ء تک شیخ الازہر رہے اس کے بعد شیخ انبابی جانشین ہو گئے، یہ اصلاح کے سخت مخالف تھے اس کے علاوہ شیخ محمد عبدہ جس وقت ازہر کے طالب علم تھے، اس وقت شیخ عباس شیخ الازہر تھے، دیکھو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (مادہ ازہر) مشاہیر الشرق جلد ۴ صفحہ ۱۸۶ - ۱۸۹ -

مجلس کے روبرو نظام امتحان مقرر کیا گیا، ازہر میں یہ جدید مرحلہ تھا، اکثر حضرات نے اس کی مخالفت کی، شیخ علیش نے، جو متبحر عالم اور عجیب رجعت پسند اور قدامت پرست تھا علم احتجاج بلند کیا، جس وقت محمد عبدہ جامعہ ازہر میں ۱۸۶۶ء میں داخل ہوئے، اصلاح کی تحریک ملتوی ہو گئی، تاہم شیخ حسن طویل منطق اور فلسفہ کا درس برابر دیتے رہے،

گو محمد عبدہ کی نوجوان شخصیت میں کوئی ایسی امتیازی خصوصیت نہ تھی، جو آپ کے اساتذہ کی نظر میں آپ کے ان سینکڑوں ساتھیوں سے ممتاز کرتی، جو دیہاتوں سے ازہر میں شریک ہوئے تھے، لیکن آپ کی جولانی طبع تیزی فہم و ذکا، علمی ذوق و شوق، اور آپ کے استقلالِ فکر وغیرہ ان تمام خصوصیات نے بہت جلد آپ کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز کر دیا، آپ ازہر میں چار سال تک مقررہ نصاب کی تعلیم پاتے رہے اور مسلسل درس میں شریک ہوتے رہے، لیکن آپ ان اساتذہ کے حلقہ، درس میں پابندی سے بیٹھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے، جن کی تفہیم ناقص تھی یا آپ ان کے درس سے استفادہ کی قدرت نہیں رکھتے تھے، کبھی تو آپ درس میں غیر حاضر رہتے اور کبھی موجود کوئی اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جاتے جس کو اپنے ساتھ لے آتے تھے، اس کے باوجود ازہر کی کتابوں میں ان اشیاء سے ہمیشہ بحث کیا کرتے تھے، جن کا درس نہیں دیا جاتا تھا۔

آپ کے دیرینہ رفیق اور ناصح مشفق شیخ درویش وقتاً فوقتاً آپ سے ملتے اور آپ کو منطق، ریاضیات اور ہندسہ کی تعلیم پا لینے کی ترغیب دیا کرتے حالانکہ یہ علوم ازہر میں نہیں پڑھائے جاتے تھے، ان کی تحصیل کے لئے اس دور کے عالم شیخ محمد بسیونی نے آپ کی امداد کی، قلیل عرصہ میں آپ نے شیخ حسن طویل سے، جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی لیکن شیخ حسن اس

نامعلوم شے کی تحقیل کے قوی جذبہ کو سیراب نہ کر سکے، جس کی چنگاریاں محمد عبدہ کے دل میں بھڑک رہی تھیں۔

نوجوان طالب علم نے بھی محسوس کر لیا کہ شیخ حسن کی تعلیم محکم اور یقینی نہیں بلکہ وہ ظن و تخمین سے مخلوط ہے، آپ کسی موضوع کو نظر انداز کرنے کے لئے رضامند نہ ہوتے، تاوقتیکہ آپ پوری طرح اس کو نہ سمجھ لیتے جب آپ کو اپنے فہم کا اعتبار ہو جاتا تو اس وقت تک اس پر قانع نہ ہوتے جب تک کہ دلائل و براہین آپ کی تائید نہ کر دیں۔

بعد میں محمد عبدہ نے بیشتر مقامات پر تصریح کی ہے، کہ ازہر میں عربی کتابوں کے درس کا جو طریقہ رائج تھا، اس نے آپ کی فکر و بصیرت پر نہایت ہی مضر اثرات چھوڑے، نیز آپ نے کئی سال تک اس امر کی کوشش کی، کہ ان طریقے کے اثرات کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دیں لیکن آپ کو اس میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ازہر میں ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں آپ تصوف سے متاثر تھے آپ بالکلیہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے، دن بھر روزہ رکھتے، رات بھر نماز، تلاوت اور ذکر میں مشغول ہو جاتے، اپنے بدن پر ایک کھردری قمیض پہنتے، نفس کا مجاہدہ زہد و تقشف کے ذریعہ کرتے، سر جھکائے ہوئے چلا کرتے، مدرسین اور طلباء سے ضروری گفتگو کے علاوہ کسی اور سے بات چیت نہ کرتے، علم و بصیرت، فکر و نظر اور مجاہدۂ نفس میں حد درجہ انہماک کی وجہ سے اپنے دائرہ حس سے باہر ہو جاتے اور عالم خیال میں غوطہ زن ہو جاتے، یہاں تک کہ لوگوں کو گمان ہونے لگتا کہ آپ دیرینہ بزرگوں کی روحوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں، یہ انہماک اس درجہ بڑھ گیا کہ آپ لوگوں کے میل جول سے بھی دور رہنے لگے،

جب شیخ درویش ۱۸۷۱ء میں مصر آئے، تو انھوں نے دیکھا کہ محمد عبدہ کو اسی فطری زندگی کی طرف لوٹانا ناگزیر ہے، اس میں ان کو اس طرح کامیابی ہوئی، کہ انھوں نے آپ کو آگاہ کرایا، کہ آپ کا یہ علم کچھ بھی نفع بخش نہیں، جبکہ وہ آپ کا اور دوسرے لوگوں کا رہبر نہ ہو، نیز انھوں نے آپ کو جتلایا کہ اپنے دینی بھائیوں کو کچھ فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، تو آپ پر ضروری ہے کہ ان سے ربط وضبط رکھیں، پھر شیخ آپ کو اپنے ساتھ عام مجلسوں میں لے جاتے رہے، زندگی کے مختلف شعبوں میں گفتگو کے دروازے کھولدئیے اور آپ کو توجہ دلائی کہ تمام علمی مباحث میں گفتگو کریں، اس طرح رفتہ رفتہ انھوں نے آپ کو عالم خیال سے دنیائے واقعات کی طرف لوٹا دیا،

اس کے علاوہ آپ کی علمی تربیت وعقلی انکشاف کا سہرا جمال الدین افغانی کے سر ہے، انھوں نے ہی آپ کو تصوف کی بھول بھلیّوں سے نجات دلائی اس کے باوجود محمد عبدہ کی پہلی تصنیف رسالہ دار دات میں، جو ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی آپ کی علمی تحقیقات کے آثار اور آپ کے صوفیانہ تجربات نہایت واضح طور پر پائے جاتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس میں آپ کے اُن فلسفیانہ تحقیقات کا عکس بھی جھلکتا ہے، جنھیں آپ نے جمال الدین سے سیکھا تھا،

محمد عبدہ پر زندگی بھر تصوف کا رنگ چھایا رہا، آپ خود اپنے ایک رسالہ کے مقدمہ میں، جس کا بیان ہم اوپر کر چکے ہیں، ذکر کرتے ہیں۔ کہ جمال الدین کے مصر پہنچنے سے پیشتر کس طرح آپ کو علم وفن سے گہرا شغف تھا اور کیونکر آپ کی تعلیم نے آپ کو بے مقصد وبے غرض بنادیا تھا، محمد عبدہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ایک ایسے مقام تک پہنچ چکے تھے جس کا آپ نے "علوم حقیقی" نام رکھا تھا لیکن آپ کو کوئی ایسا مرشد کامل نہ ملا، جو اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا، جب

کبھی کسی سے آپ امداد طلب کرتے تو یہی جواب ملتا کہ اس قسم کے امور سے دلچسپی رکھنا شریعت کے مخالف ہے یا ارباب دین نے ایسی چیزوں کے تعلق رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔

محمد عبدہ فرماتے ہیں " جب میں نے اس کے سبب پر غور و فکر کیا، تو مجھے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں سے ناواقف رہتا ہے، ان کو وہ ناپسند کرتا ہے " آپ اسی وادیٔ حیرت میں سرگرداں تھے، کہ " حقیقت کا آفتاب درخشاں ہو جاتا ہے" اس سے آپ جمال الدین کی آمد کی طرف اشارہ کرتے ہیں، آپ کے نفس کو اطمینان ہو گیا کہ آفتاب حقیقت کی کرنوں سے اکتساب نور کرنے کا موقعہ مل گیا' آپ نے محسوس کیا کہ آپ ایک نئے عالم میں پہنچ گئے ہیں آپ کی نظر میں تصوف کا شغف و انہماک رفتہ رفتہ گھٹنے لگا،

جمال الدین صوفی تھے' صوفیوں کے حالات کا مطالعہ اور ان کے آثار کا مشاہدہ کر چکے تھے' اہل طریقت (سالکین) کے راستہ میں ایک لمبی مسافت طے کر چکے تھے، اور محمد عبدہ سے زیادہ اُن صوفیاء کی بابت جو بہت کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے اور تصوف میں بحث و گفتگو کو روا نہیں رکھتے تھے' بہت سی چیزوں کو جانتے تھے' آپ کو اتنا قابو حاصل ہو گیا کہ اپنے نوخیز شاگرد کو جس طرح علمی میدان میں اپنے علم کا کمال دکھلایا اسی طرح اس پر اپنے علم تصوف کی دھاک بٹھا دی ' اس طرح آپ نے محمد عبدہ کو ہلاکت خیز گرد ابوں سے نجات دلائی' جس میں ایک مرتبہ کوئی گھر جائے تو اس سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

جب پہلی مرتبہ محمد عبدہ نے جمال الدین سے ملاقات کی' تو گفتگو کا موضوع تصوف تھا' اس سے پہلے جب جمال الدین پہلی مرتبہ ۱۸۶۹ء میں قاہرہ آئے

تھے، تو محمد عبدہ نے شیخ حسن طویل کے ساتھ آپ سے ملاقات کی تھی، جب یہ دونوں آئے تھے، تو اس وقت جمال الدین رات کا کھانا کھا رہے تھے، کھانے کے بعد آپ نے ان دونوں سے تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کی، آپ نے بعض آیتوں کی تفسیر اہل سنت کے نقطۂ نظر سے کی اور اس کو صوفیاء کی تفسیر کے ساتھ موازنہ کیا،

تصوف اور تفسیر

یہ دونوں موضوع اس وقت محمد عبدہ کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور آپ ان میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے، جمال الدین معلم اکبر ہونے کی حیثیت سے اپنی بالغ نظری کی وجہ سے نوخیز طالب علم کے جذبات و رجحانات کی گہرائی تک پہنچ چکے تھے، چنانچہ آپ نے محمد عبدہ کو اپنے اندر جذب کر لینے کا قصد کر لیا،

جب جمال الدین ڈیڑھ سال بعد (۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء[1]) آستانہ سے قاہرہ

---

[1] مورخین اس تاریخ پر اتفاق نہیں رکھتے جیسا کہ محمد عبدہ کی زندگی سے متعلق اکثر تاریخوں میں ان کی روایات باہم دیگر مختلف ہیں، جن تاریخوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، ان کو براؤن اور مصنف مشاہیر الشرق نے بیان کیا ہے، کہ جمال الدین مصر دو مرتبہ آئے ان دونوں کے درمیان کچھ مدت آستانہ میں ٹھہرے، پہلی مرتبہ ۱۲۸۵ھ۔ ۱۸۶۹ء کو پہنچے، آستانہ میں تقریر کی، جو یہاں سے آپ کی جلا وطنی کا سبب بنی (رمضان ۱۲۷۷ھ۔ ۱۸۸۰ء)

دوسری مرتبہ مصر میں یکم محرم (۱۲۸۸ھ ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو تشریف لائے، یہ تاریخیں گذشتہ حالات کے ساتھ بیشتر متفق ہیں لیکن محمد عبدہ (المنار جلد ۸ صفحہ ۳۸۷) میں فرماتے ہیں کہ آپ نے یکم محرم ۱۲۸۷ھ کی ابتداء میں جمال الدین کی صحبت اختیار کی، نیز آپ رسالہ

لوٹے۔ تو محمد عبدہ نے آپ سے باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا اور سایہ کی طرح آپ کے پیچھے پیچھے رہنے لگے، نہایت جرأت و جوش کے ساتھ اپنے ساتھی طالب علموں اور دوسرے اشخاص کو جمال الدین کے گھر کی طرف جانے کی دعوت دینے لگے، جہاں جمال الدین اپنے شاگردوں کو بعض اسلامی کتابیں پڑھایا کرتے تھے جو اب تک طاق لنسیاں کی زینت بنی ہوئی تھیں، آپ اپنی ٹھوس علمی معلومات اپنے طرز گفتگو، انداز بیان اور مختلف موضوعوں پر لطف اندوز تبصرہ آرائی سے سننے والوں پر جادو کا سا اثر کرتے تھے،

آپ کی مجلس میں جو بھی حاضر ہوا کرتا خواہ وہ "مریدان حکمت" میں سے ہوتا آپ کے دائرہ تلمذ سے بیرون، آپ ہمیشہ ہر ایک کے سامنے اپنی حکمت کے بیدریغ خزانے لٹایا کرتے، آپ کا عربی قدیم کتابوں کو پڑھانے کا طریقہ ازہر کے طریقۂ تعلیم سے بالکلیہ مختلف اور جداگانہ تھا،

آپ کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ پہلے اصل مسئلہ کی اس طرح تشریح کرتے، کہ جس سے ذہن کے گوشے روشن ہو جاتے، پھر کتاب کی عبارت پڑھتے اور اپنی بیان کردہ تقریر پر اس کو مطابق کرتے، اگر متن اور شرح میں ہم آہنگی ہوتی تو آگے بڑھتے، اگر دونوں میں تعارض واقع ہوتا، تو متن میں جن مقامات میں نقص

(بقیہ ص۸۵ کا) الواردات کے مقدمہ میں (تاریخ الاستاد الامام جلد ۲ صفحہ ۲-۹) میں بیان کرتے ہیں، کہ جمال الدین جب مصر پہنچے تو دونوں کی صحبت ۱۲۹۰ھ۔ ۱۸۷۳ء میں ہوئی اس روایت کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس تاریخ میں جمال الدین سے ایک خاص طرز مثلاً فلسفہ کا درس لینا شروع کیا، مقدمہ رسالہ صفحہ ۴ ۲ سے پتہ چلتا ہے کہ جمال الدین ۱۸۷۲ء میں مصر آئے۔ لیسا اوقات اس اضطراب کا مرجع ہجری و میلادی تاریخوں کا استعمال ہے

یا کمزوری ہوتی اس کو بیان کرتے، عبارت پڑھا کرتے اور اس کی دلیل وبرہان پر بحث کرتے، اگر وہ درست ہوتی تو اس کو باقی رکھتے یا اس کو حذف کر کے اس کے علاوہ کوئی اور پختہ دلیل پیش کرتے، پھر اس موضوع میں اپنی رائے پیش کرتے، لیکن آپ صرف کتاب کے سمجھنے اور مصنف کے آرار کی موافقت پر ہی اکتفا نہ کرتے،

جب اس طریقہ سے جمال الدین نے عربی اہم کتابوں کا درس دیا اور ان میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک دی، تو اس کے بعد اپنے شاگردوں کو چند نئی کتابیں پڑھائیں، جن کا عربی ترجمہ مختلف علوم میں ہو چکا تھا شاگردوں کے روبرو ایک "جہان نو" آشکار ہو گیا، جس کے وسیع آفاق کی محمد عبدہ نے سیر وسیاحت کی، یہ مغربی طرز فکر کا جہان تھا، جس میں جدید علم کا دور دورہ تھا اس "جہان نو" نے محمد عبدہ کی زندگی پر عنصری اثر ڈالا، آپ نے قدیم تصنیفات کی تحقیق وتدقیق، ان پر نقد ونظر اور آزادی رائے کے اظہار میں جو نہج اختیار کیا، وہ جمال الدین کے طرز فکر سے کسی طرح کم نہ تھا۔

جمال الدین اپنے شاگردوں کو اخبارات وجرائد میں ادبی، اجتماعی اور سیاسی مقالات کی انشا پردازی کی مشق دیا کرتے تھے، محمد عبدہ کچھ ہی عرصہ بعد بے پایاں ادیب اور فصیح وبلیغ مقرر ہو گئے، اس میں اپنے استاد سے بھی آگے نکل گئے، کیوں کہ جمال الدین کو اگرچہ طلاقتِ لسانی اور قوت خطابت حاصل تھی، لیکن عربی زبان اپنے شاگرد کی نسبت آپ کی مادری وطنی زبان نہ تھی، آپ کبھی ان آثار سے نہ بچ سکے، جو آپ کی عجمیت پر دلالت کرتے تھے

محمد عبدہ نے اپنے استاد کے دو اسباق قلمبند کئے ہیں، اور ان کا خلاصہ اخباروں میں نشر کیا ہے، ان میں سے پہلا درس "فلسفۂ تربیت" میں ہے،

جس میں آپ نے خلقی زندگی کی سلامتی کے درمیان اور نباتات و حیوان کی زندگی میں جسمانی ترکیب و نظام کی درستگی کے مابین موازنہ کیا ہے، جس طرح بدنی ترکیب کی روح کا مستقر وہی مقام ہوتا ہے، جہاں متشابہ و ہم جنس جڑیں اکٹھا ہوتی ہیں اور ان کے باہمی غلبہ و اثر سے ایک کامل معتدل مزاج پیدا ہوتا ہے، اگر ایک دوسرے پر غالب ہو جائے تو ترکیب و نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ اور روح حیوانی جہاں سے آئی تھی، وہاں واپس چلی جاتی ہے اسی طرح کمال انسانی کی روح وہیں جلوہ گر ہوتی ہے. جہاں متضاد اخلاق اور مخالف فضائل کا اجتماع ہوتا ہے، ان کے تضاد و مخالفت سے ایک معتدل حقیقی فضیلت قائم ہوتی ہے، اس کی مثال شجاعت ہے، جو جرأت اور بزدلی کے درمیان ایک معتدل کیفیت کا نام ہے، اسی طرح سخاوت فضول خرچی اور بخالت کے مابین ایک اوسط درجہ کا نام ہے ......

" اسی طرح تمام انسانی اخلاق و فضائل دو متضاد سرحدوں کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے اثر کے رونما ہونے کے لئے ایک معتدل نسبت کا پایا جانا ضروری ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر غلبہ ہو گیا، تو نظام فضیلت درہم برہم ہو جاتا ہے ......"

" اسی لئے تربیت و تہذیب کے علوم مقرر کئے گئے ہیں، تاکہ نفس کے اخلاق و فضائل کی حفاظت کی جائے اور اگر اس کے اندر نقص و کجی کا میلان پایا جاتا ہے، تو اس کو دور کر دیا جائے، جو لوگ تربیت، رہنمائی اور اخلاقی کمزوریوں اور ان کی خوبیوں کو بیان کرنے کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ نفوس و ارواح کے اطباء کہلاتے ہیں، جس طرح طبیب کے لئے یہ ضروری ہے، کہ اس کو صحت ابدان کا علم حاصل ہو، اسی طرح حکیم روحانی کے لئے ناگزیر ہے، کہ وہ نفسوں

اور روحوں کو خوشگوار بنانے اور ان کی اصلاح و تندرستی کے طریقوں سے واقف ہو، اپنی قوم اور اس کے علاوہ دیگر قوموں کی تاریخ کے معلومات پر عبور رکھتا ہو، قوم کے ہر دور کے ارتقائی درجات اور اس کی دینی حاصلات سے آگاہ ہو، اس کے اخلاق وعادات کو حکمت کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھے، تاکہ اس کے نفسیاتی امراض کے اسباب کو معلوم کرے اور اس کے گوناگوں علاجوں سے واقف ہو ـــــ لیکن اس قسم کے روحانی اطبا رکی جہالت بغیر کسی شک وشبہ کے امت کے اخلاق پر نمایاں اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے جاہل مرشدوں اور ناداں رہنماؤں کا معدوم ہو جانا ہی ان کے موجود ہونے سے بدرجہا بہتر ہے ......

"جو لوگ قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، وہ دو گروہ میں منقسم ہیں:-

(۱) مقررین وواعظین کا گروہ ـــــــ (۲) انشا پرد ازوں اور مصنفین کا گروہ، اسی میں صحیفہ نگار اور مدیران جرائد شامل ہیں"

اپنے دوسرے مقالہ "صناعت" میں انسان کے عقلی وفکری ادوار اور اس کی اجتماعی تبدیلیوں پر بحث کرنے اور جماعت کے لئے مختلف صنعتوں کی قدر و قیمت اور انسان کی عہد بعہد تبدیلی میں ان کی اثر اندازی کو بیان کرنے کے بعد افراد وجماعت کے لئے صنعتوں کی ضرورت اور ان کی منفعت کو مدلل طور پر پیش کیا ہے،

"چنانچہ فنون وصناعات ایک دوسرے پر موقوف ہیں اور انسان اپنی زندگی کی مادی ضرورتوں کے لئے ان میں سے اکثر وبیشتر کا محتاج ہے، پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان جماعت سے علیحدہ ومنفرد ہو کر زندگی بسر کرے حالانکہ وہ ہر دن بلکہ ہر لمحہ تمام قسم کی صنعتوں کے منافع کا محتاج ہے، لہذا ایک دوسرے

کے کاموں میں تعاون لازمی ہے' تاکہ ہر ایک دوسرے کے کام سے فائدہ اٹھائیں
اس طرح انسانی سوسائٹی ایک اعضاء و جوارح والے جسم کی طرح ہو جائے
گی جس کا ہر عضو بدن کے لئے کام کرے گا"

"جب انسان ان تمام سے واقف ہو جائے گا' تو اپنے آپ کو جماعت
کا ایک حقیقی عضو اور رکن شمار کرے گا' جو اپنا فریضہ نہایت تن دہی و مستعدی
سے ادا کرے گا' اس عمل کا مبداء وہی ہے جس کو ہم صناعت سے نامزد کرتے
ہیں' اس لحاظ سے جو شخص حقیقی طور پہ کام کرنے والا نہ ہو' جو انسانی سوسائٹی کو
فائدہ پہنچائے اور نظام جماعت کی تشکیل کے لئے امداد نہ کرے تو وہ عضو
معطل کی طرح ہے' جس کا بدن پر باقی رہنا سوائے بوجھ کی تکلیف برداشت
کرنے کے اور کوئی فائدہ نہیں"۔

اس کے علاوہ جمال الدین نے اپنے شاگردوں کو علم سے بڑھ کر
ایک اور چیز عطا کی' اگرچہ آپ کا علم بذات خود بے حساب نفع بخش تھا
جرجی زیدان' اس ادبی نشأۃ ثانیہ پر' جس کو جمال الدین کے ارشادات و
تعلیمات نے عالم آشکار کیا' بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں'

"گویا اس شخص نے اپنی روح ان کے اندر پھونک دی' جب انھوں نے
اپنی آنکھیں کھولیں' تو مشاہدہ کیا کہ پہلے وہ جہل و ظلمت میں تھے' اب ان کے
پاس ایک نور آگیا جس سے انھوں نے علم و فلسفہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسی
زندہ روح حاصل کی' جس نے ان کو اپنی پہلی حالت پر لوٹا دیا' کیونکہ اس نے
ان اوہام کے پردوں کو چاک کر دیا' جو ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے تھے' انھوں
نے وفور نشاط و جوش انبساط کے ساتھ انشاء پردازی میں جد و جہد کی' ادبی
ملکی' علمی اور دینی معلومات بہم پہنچانے کے لئے نئے ابواب کی تخلیق کی"۔

جس وقت جمال الدین کی انقلابی تحریکات ظاہر ہوئیں، وہ وقت اسی قسم کی کوششوں کے لئے بالکلیہ مناسب تھا، جن کو آپ نوجوان مصریوں کو میدان ارتقا میں گامزن کرنے کے لئے صرف کیا کرتے تھے، ادھر خدیوی اسماعیل مصر میں نہایت تیزی کے ساتھ یورپی افکار و خیالات کو داخل کرنے میں مصروف تھا لیکن اس کی ان کوششوں کا محض سطحی نتیجہ نمودار ہوا، وہ یہ کہ ملک کا بیشتر تہذیب یافتہ طبقہ ملک کو وطنی پیش قدمی کے میدان میں آگے بڑھنے کی توقع کرنے لگا، وہ یہ گمان کرنے لگا، کہ اس نے اس میں گہرا حصہ لینے کی تیاری کرلی ہے۔

دوسری طرف اسماعیل کا یہ ناعاقبت اندیش رویہ بلا شک و شبہ اجنبی مداخلت اور اس کے نفوذ و اثر کو اپنی سلطنت میں بحال رکھنے کا موجب ہوا، جس کا جمال الدین کو اندیشہ رہتا تھا، آنے والے روز حساب کی پرچھائیاں نزدیک سے اپنے جلوے دکھانے لگی تھیں، گویہ دن اسی وقت آیا، جب کہ مصر سے جمال الدین کی جلاوطنی عمل میں آئی۔

اس قسم کی پیشگوئی محمد عبدہ کے ایک مضمون میں ظاہر ہوئی، یہ مضمون ان پانچ مقالات میں سے ایک ہے، جن کو محمد رشید رضا نے تاریخ الامام میں پیش کیا ہے، ان مقالہ کو محمد عبدہ اس دور کے اخباروں میں نشر کر چکے تھے ان تمام میں، جیسا کہ استاد ایم، ہورتن نے مشاہدہ کیا ہے، "آتش شباب کا بھڑکتا ہوا شعلہ رقصاں ہے"

اس وقت ہم جس مقالہ کے درپے ہیں، وہ ۳ ستمبر ۱۸۷۶ء میں جریدۂ الاھرام میں شائع ہوا، یہ اخبار قاہرہ کے تمام روزنامہ اخباروں میں زیادہ قدیم ہے، اس وقت ہفتہ وار تھا، یہ مضمون اسی اخبار پر تبصرہ کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا، جس کی تاسیس اسی وقت عمل میں آئی تھی، اس میں ازہری نوجوانوں سے

(کیونکہ محمد عبدہ اس وقت ازہر کے طالب علم تھے) یہ تبلایا ہے کہ مصر گذشتہ زمانے میں روئے زمین کا سب سے بڑا ملک تھا تہذیب و تمدن یہاں ارتقائی مدارج طے کر چکا تھا جبکہ اور ممالک میں یہ بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ مصر ہی سے تمدن کا سرچشمہ پھوٹا جس سے یہاں کے آس پاس کے ممالک کے علاوہ مغربی قوموں نے سیرابی حاصل کی اور بے شمار انقلابات اور تبدیلیوں کے بعد اس نے اپنے مقصد و منتہا تک رسائی حاصل کر لی ......

"زمانہ اپنے حسب حال گردش کرتا رہا، آخر میں تمدن اپنے اصل مرلیم اور سرچشمہ کی طرف واپس ہو گیا، مصر نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو ایک بلند مقام تک پہنچایا چنانچہ اس نے بھی مصری خدمت کا حق خوش اسلوبی سے ادا کیا اور اپنی قدردانی و حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا،

"رفتہ رفتہ عہد حاضر میں تہذیب و تمدن کے وہ سرچشمے پھوٹ نکلے جن کا انتظار تھا اور اہرام کے قدیم بانیوں کے زمانے سے بدرجہا بہتر ہو گئے، جدیدہ اہرام اسی تمدن جدید کی خدمت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دینے والا ہوگا"

باقی دوسرے چاروں مقالات میں بھی، جو ۱۸۷۶ء میں لکھے گئے تھے اس دور کی انقلابی تحریکات اور ہنگامہ خیز افکار کا عکس جھلکتا ہے، یہی حال جمال الدین کی تعلیمات کا ہے۔

دوسرے مقالہ میں ان ضروری جوہری پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن پر اس فن انشاء پردازی کا دارومدار ہے، جو انسانی تہذیب و ثقافت میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے، آخر میں اپنے بیان کو اس بات پر ختم کیا ہے، کہ صحافت کے لئے ہر قوم کے سیاسی و مذہبی معاملات و امور میں توجہ رکھنا اور ان کا باقاعدہ مطالعہ کرنا ضروری ہے،

تیسرے مقالہ کا عنوان "انسانی مدبر اور عقلی مدبر" ہے، انسانی مدبر سے آپ کی مراد ایسا حیوانی مدبر ہے جس میں تمام ظاہری و باطنی احساسات پائے جائیں اور اس کے اندر حیوان کی ترکیب کی حفاظت کا سامان پایا جائے

عقلی و روحانی مدبر سے مراد "انسان کی وہ باہوش قوتیں ہیں، جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں، کہ وہ تاریک پردوں کو چاک کردیں اور اخلاق و فضائل سے آراستہ ہوتے رہیں"

انسان دو گروہ میں منقسم ہے "ایک گروہ نے سرزمین حیوانیت میں قدم دھر دیا۔ دوسرے گروہ نے انسانیت کی بلند چوٹی تک رسائی حاصل کی، جب کبھی کسی شخص کی فطرت میں انسانیت کا پلہ بھاری ہوتا ہے تو اس کا رجحان عقلی تصرفات کی طرف بڑھتا ہے، یہ ظلم و استبداد کی بیخ کنی کرے گا، جہالت کے عناصر کو برباد کردے گا اور ہر چیز کو دلیل و برہان کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کرے گا"۔

یہاں تک آپ کی تحریر میں فلسفیانہ طبعی رنگ غالب نظر آتا ہے، آخر میں آپ اس طرح تبلیغ دیتے ہیں "بعض لوگ وہ ہیں، جن کے عقلی عادات و خصائل محض برائے نام ہیں، معتقدات میں تقلید کو روا رکھتے ہیں اور فلسفیانہ علوم پڑھنے کو جائز نہیں قرار دیتے"

"ان میں سے بعض ایسے اشخاص ہیں، جو ملک کی تباہ حالی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اپنے دشمنوں کے غلبہ و اقتدار کی نوید سن کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے، یہ محض نتیجہ ہے، ان کی ہمتوں کی کمزوری، جہالت کی تاریکی، قعر حیوانیت میں گر پڑنے اور درجہ انسانیت سے ہٹ جانے کا یہ ان کے لئے عبرت و بصیرت کا مقام ہے اور اس امر کی دعوت ہے کہ

وہ ان کے مشترک دشمن کے مقابلہ میں متحد و منظم ہو جائیں اور تمام مذہبی فرقہ وارانہ اختلافات و نزاعات کو دور پھینک دیں" آگے فرماتے ہیں:

"مصریوں کی مثال ان دو بھائیوں کی طرح ہے جن کے درمیان بہت دنوں سے جدائی واقع ہو گئی ہے، اس کے باوجود جب کبھی کوئی اجنبی ان میں سے کسی ایک پر زیادتی کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو یہ آپس کے نزاع و اختلاف کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے تاکہ اجنبی دشمن کو اپنے ملک سے نکال دیں"

"چوتھا مقالہ" علوم کلامیہ اور علوم عصریہ کی طرف دعوت" کے باب میں ہے، اس میں ایک ازہری طالب علم کا قصہ بیان کیا گیا ہے (جو اپنے حال کے بہت مشابہ ہے) جس نے بعض منطق و کلام کی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا، باوجودیکہ منطقی علوم کا مقصد صرف یہ تھا، کہ ان کے ذریعہ علم کلام کی تحصیل میں مدد لی جائے، لیکن اساتذہ نے اس طالب علم کو پریشان کر دیا، اس کو اس قسم کے علوم پڑھنے سے باز رکھا، اس کو لمبی چوڑی نصیحتیں کرتے رہے، "میں اس کو دھمکی دی اس کے والد کو قاہرہ بلوایا، تاکہ وہ اپنے لڑکے کو ایسے علوم پڑھنے سے نجات دلائے، چنانچہ لڑکے کے والد آئے اور ان کو اس وقت تک چین نصیب نہ ہوا، تاوقتیکہ "انھوں نے اپنے لڑکے کو قرآن کی قسم کھلائی کہ وہ ہمیشہ جادۂ ایمان پر برقرار رہے گا" اور اس کے بعد ہرگز اس قسم کے خطرناک علوم کی طرف توجہ نہ کرے گا،

اس کے علاوہ اس قسم کے علوم مغرب و مشرق کے جامعات میں پڑھائے جاتے تھے "بڑے بڑے مسلمان محققین مثلاً غزالی وغیرہ نے یہاں تک کہدیا کہ یہ علوم فرض عین ہیں، تمام علماء نے بالاتفاق کہا کہ وہ فرض کفایہ میں سے ہیں

بالخصوص ایسے اضطراب انگیز و پر آشوب دور میں جب کہ دہریت کا سیلاب چاروں طرف سے امنڈ کر آ رہا ہے، ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، تاکہ ان کے ذریعہ سے ان شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے، جو دین و مذہب کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں

"کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ جب ان علوم کی نسبت ہمارا یہ حال ہے، جنھوں نے اسلامی سرچشمہ سے سیرابی حاصل کی، جن کے رگ و ریشہ میں ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے اسلامی عناصر رواں دواں ہیں، تو ان فائدہ بخش جدید علوم کی نسبت ہمارا کیا حال نہ ہوگا، جو اس دور میں ہماری زندگی کی ضروریات میں داخل ہیں، ہم کب تک اپنے کانوں میں انگلیاں رکھے رہیں گے، تاکہ ان کے تذکرے نہ سنائی دیں؟

اگر اس قسم کا واقعہ وحشت زدہ عالموں کے زمانے میں سرزد ہوا ہوتا، یا ہماری اور دوسری قوموں کے درمیان تعلقات و روابط قائم نہ ہوئے ہوتے، تو ہم اس معاملہ میں ان کو معذور سمجھتے ہیں لیکن ہم خدیوی اسمٰعیل کے شاندار عہد میں سانس لے رہے ہیں، جو علم و فن کی نشر و اشاعت اور اپنے ملک میں تمدن کے اسباب و وسائل کی فراوانی میں تمام حاکموں میں پیش پیش ہے،

"ان عالموں نے، جو اس امت کی روح رواں ہیں، اب تک ان علوم جدیدہ میں کوئی فائدہ نہیں دیکھا، لیکن وہ ایسی چیزوں میں مشغول ہو گئے، جو ایسے زمانے کے لئے سزاوار تھیں، جن کے ستارے ڈوب گئے، ان کو ذرا بھی اس کا خیال نہیں ہوتا کہ ہم اب ایک "جہان نو" میں قدم دھر چکے ہیں، ہمیں زمانے نے ہم کو ہمارے دین اور ہمارے فضل و شرف کو ایک ایسی وادی میں پھینک دیا ہے، جو بھوکے شیروں سے معمور ہے، اگر ہم بھی ان شیروں میں سے ایک ہیں تو ہم نے اپنے

آپ کو اور اپنے دین و مذہب کو بچالیا، ورنہ یا تو ہم اپنے دین کو چھوڑ دیں اور اپنی جانوں کی حفاظت کرلیں، یا سو جہالت اور گمراہی کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں۔

لہٰذا ہم پر فرض ہے، کہ ہم اپنی ہمسایہ قوموں اور حکومتوں کے ارد گرد نظر دوڑائیں، اور ان اسباب کو دیکھیں جنھوں نے ان کو اپنی پہلی حالت سے نکال کر طاقتور اور مالدار بنا دیا، جب ہمیں ان کی ترقی کا حقیقی سبب معلوم ہو جائے تو ہم پر واجب ہو جاتا ہے، کہ ہم بھی فوراً اسی سبب کو اختیار کریں تاکہ ہم اپنے نقصانات کا تدارک کرلیں اور مستقبل کی برکتوں سے فیضیاب ہو جائیں، ہم نے بامعان نظر ان کا جائزہ لیا، تو ان کی طاقت و قوت اور دولت و ثروت کے ارتقاء کا راز صرف اسی میں مضمر تھا، کہ انھوں نے اپنے باہمی علوم و معارف کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا، اس بنا پر ہمارا اولین فریضہ ہے، کہ ہم اپنے ملکوں میں اس قسم کے علوم و فنون کی اشاعت میں اپنی پوری جد و جہد اور ساری طاقت و توانائی صرف کر دیں"

ہم اسی قسم کا نیا نغمہ ایک آخری مقالہ میں، جو ان ہی مقالات کا سلسلہ ہے، سنتے ہیں، جس کا آغاز آپ اس طرح فرماتے ہیں، کہ اگرچہ عربی زبان کا خزانہ اپنے مفردات سے معمور تھا، باوجودیکہ وہ کسی زمانے میں طبعیات، الہیات، ریاضیات اور طب وغیرہ تمام علوم و فنون کی گراں قدر تصنیفات کی اشاعت کا ذریعہ تھی، لیکن اب وہ رو بہ زوال ہو گئی ہے۔ دوسری قومیں علم، تربیت اور تہذیب و ثقافت میں آگے بڑھ گئی ہیں، آخری دور میں بعض جدید کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، لیکن اب تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا، جو علم سیاست اور تاریخ و تمدن کی طرف توجہ کرتا" تاکہ وہ "کیزو" کی کتاب کا جو "تاریخ و تمدن" کے باب میں ہے ترجمہ کرتا" مقالہ کو جمال الدین افغانی کے

ان جماعوں کے تذکرہ پر ختم کیا گیا ہے، جو مذکورہ کتاب پر تقریظ و تبصرہ کے سلسلہ میں کئے گئے تھے:

جمال الدین فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں، کہ یورپ والوں نے ایک خاص ترقی حاصل کی..... اس کا سبب اُن مقدمات کے نتائج تھے، جنھوں نے قیاسی طور پر صحیح نتیجہ کو مرتب کیا، یہاں تک کہ ان کو اس مقصد و مدعا تک پہنچا دیا، ہر انسان کا فرض ہے، کہ وہ اُن مقدمات کی تلاش و جستجو کرے، جنھوں نے ان قوموں کی سعادت و خوشحالی کی تخلیق کی، تاکہ یہ ان کو اپنے ملک و ملت کے افراد کو اپنے غیروں کے درجہ پر پہنچانے کے لئے استعمال کرے"

"یہ کتاب ان تمام اصول و اسباب اور وسائل و آلات پر مشتمل ہے، جن کو اہل یورپ کی خوشحالی میں نمایاں دخل ہے ...."

ہم نے محمد عبدہ کے ان آراء و نظریات کو پھیلا دیا ہے، جن کو آپ نے اپنے ان مقالات میں سمیٹا ہے۔ اس لئے کہ یہ ان آثار و عناصر کا انکشاف کرتے ہیں، جو آپ کی عقلی و فکری تشکیل میں کارفرما تھے، اس کے بعد یہ اس امر کا موجب ہوئے کہ لوگ آپ کو ازہری ماحول میں بحیثیت ایک زعیم و مجدد کے پہچاننے لگے اس کے علاوہ آپ کے یہ افکار و رجحانات آپ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، کہ کس طرح آپ نے جب کہ آپ ازہر میں طالب علم تھے جمال الدین کی رہنمائی سے فیض یاب ہو کر قومی اصلاح کی خدمات انجام دیں۔ کیونکہ اس وقت سے آپ کی فکر و نظر میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا، حالانکہ آپ چند سال پیشتر تصوف کی الجھنوں اور صوفیانہ خیالات کی دشوار گزار گھاٹیوں میں کھوئے ہوئے

اور دنیائے واقعات سے بیخبر عالم خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ؎

آپ کا یہ فکری ارتقاء اور ذہنی انقلابی منظر آپ کی دو لون تصنیفات میں، جن کو اس وقت شائع کیا تھا، پوری آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اس سے بیشتر ہم نے آپ کی پہلی تصنیف "رسالۂ واردات" کی طرف اشارہ کیا ہے جو ۱۸۷۴ء میں جلوہ گر ہوا۔ بقول پروفیسر ہورتن کے یہ رسالہ "لطیف جرأت آمیز جذبات اور فلسفیانہ افکار وخیالات کا مظہر ہے" اس میں آپ کی ازہری تعلیمات کے آثار کی جھلک اور آپ کے صوفیانہ تجربات ومشاہدات کا رنگ جھلکتا ہے، اسی طرح جمال الدین کی تعلیمات وتحریکات اور بالخصوص آپ کے فلسفیانہ نقطہ نظر اور تقلید کی زنجیروں سے رہائی حاصل کرنے کے پر جوش جذبات موجود نظر آتے ہیں،

محمد عبدہ ہمیں اپنے نفس کی داستان مقدمہ میں اس طرح سناتے ہیں کہ نفس کلمہ وکلام کی الجھنوں سے دور اور خیالات کی پرچھائیوں کے زندان سے علیحدہ ہو کر علم وعرفان کی جلوہ گاہ میں باریاب ہے"۔

آپ اس رسالہ میں وحدۃ الوجود کو پیش کرتے ہیں اور فلاسفہ صوفیا کا یہ مسلک کہ وجود حقیقی اللہ کا وجود ہے، اختیار کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں،

"ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ سوائے اللہ کے وجود کے اور کوئی وجود نہیں کائنات اسی کے جلووں سے پرنور وہی موجود ہے اور اس کے علاوہ ہر شئے معدوم ہے"

ہورتن نے بیان کیا ہے کہ محمد عبدہ نے علم کلام کے بعض مسائل مثلاً صفات اللہ پر جہاں گفتگو کی ہے، تو گفتگو میں یقین واذعان کی کمی، جرأت شباب کا فقدان اور خوف واحتیاط کا غلبہ پایا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی آپ شک وشبہ

کے عالم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، نیز ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں، کہ آپ اللہ کی صفات علم، ادراک اور ارادہ میں فلاسفہ کے آراء اور اشعری کے معتقدات کے مابین نہایت جوش اور قوت کے ساتھ تفریق کرتے ہیں اور تخلیق عالم، انسان، نبوت اور روح کے بقاء دوام میں بحث کرتے ہیں،

آپ کی دوسری کتاب جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی ہے، بلاشک وشبہ اس کا جداگانہ رنگ ہے، جلال الدین دوانی نے عقائد عضدیہ کے متن کی جو شرح کی ہے، یہ کتاب اسی کا حاشیہ ہے، یہ متن علم کلام میں ایک مختصر رسالہ ہے، جس کو عضد الدین ایجی (متوفی ۱۳۵۵ء) نے تصنیف کی تھی، ان کا شمار مدرسۂ اشعریہ کے متاخرین متکلمین میں ہوتا ہے، انھوں نے اس رسالہ میں مختلف فرقوں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے، ان کے اختلاف کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، ایک ثانوی اور دوسرا جوہری اختلاف، ان کے مابین اس طرح معقول رائے کیساتھ اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جو تمام کے لئے قابل قبول ہو،

ایجی ان اشخاص میں سے تھے جو اپنے زمانے میں عقل ونظر پر بھروسہ رکھتے تھے، انھوں نے اپنے اصول واحکام کو ایک مختصر اور معتدل اسلوب میں ڈھالا ہے، اسی بنا پر مدت دراز تک لوگوں نے ان کی کتاب کی قدر کی، یہی وہ موضوع ہے، جس کو شیخ محمد عبدہ نے اختیار کیا، اس سے پہلے آپ دو سال کے عرصہ سے تصوف کی وادی میں حیران وسرگرداں تھے، جب آپ کا یہ انتخاب آپ کے فکری انقلاب اور تحول ذہنی کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے، تو اس موضوع میں آپ کے آراء ونظریات بھی اسی پر اکثر وبیشتر دلالت کرتے ہیں، آپ اپنے رسالہ کا آغاز ایک مشہور حدیث پر (جس کی صحت کو بعض محققین تسلیم نہیں کرتے) بحث کرتے ہوئے کرتے ہیں، یہ حدیث، آنحضرت صلعم کی طرف منسوب ہے آپ

نے فرمایا "ستفترق امتی ثلاثا و سبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ" میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائیگی سوائے ایک فرقے کے تمام کے تمام دوزخی ہیں'۔

محمد عبدہ نے اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں ان کا فریضہ ہے کہ اپنے مخالف گروہوں کے مقابلہ میں گہری رواداری کا ثبوت دیں، کیونکہ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی شمار کرتا ہے'

آپ اس سے ایک اور نتیجہ' جو نہایت عظمت و شان والا ہے' یہ نکالتے ہیں' کہ عقل ہی ایک ایسا واحد وسیلہ ہے جو ہمیں صحیح عقیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

محمد عبدہ ان مدتوں میں جب کہ آپ کے احساسات نشو و نما پا رہے تھے' آپ کی معلومات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور ان امور و مسائل میں' جن پر ہم نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' آپ کی نظر وسیع اور توجہ گہری ہوتی جا رہی تھی' مسلسل ازہر میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے' آپ حلقۂ درس میں حاضر نہیں ہوتے تھے' بلکہ آپ کا زیادہ تر اعتماد مکتبۂ جامعہ کی کتابیں پڑھنے پر تھا' کیونکہ اساتذہ کے سینوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے' اور یہ محمد عبدہ اور جمال الدین پر کڑی نگرانی رکھے ہوئے تھے' کچھ تو اس لئے کہ اس علم فلسفہ سے ان کو سخت نفرت و عداوت تھی' جس کو جمال الدین نئے سرے سے پڑھاتے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ عام طور پر آپ کی تحریکات میں تجدیدی جذبات کارفرما تھے' اس کے علاوہ اس مخالفت کا ایک اور اہم سبب یہ تھا' کہ محمد عبدہ اور آپ کے علاوہ دیگر طلبا اکثر و بیشتر اوقات ازہر کے اسباق سے بے پروائی برت رہے تھے اور حلقۂ درس سے غائب ہو کر جمال الدین کے پاس پڑھنے کے لئے چلے جاتے تھے۔

محمد عبدہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، کہ جمال الدین کے طریقۂ تعلیم سے استفادہ کرے، بلکہ آپ نے اصلاح کی روح کو اُن طلبہ کے دلوں میں پھونکنے کی کوشش کی جو اپنے اسباق میں امداد لینے کے لئے آپ کا سہارا ڈھونڈھا کرتے تھے، آپ نے ان کو علم کلام کی چوٹی کی چند کتابیں پڑھائیں، جو ازہر میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں، مثال کے طور پر آپ نے ان کو شرح تفتازانی (متوفی ۱۳۸۹ء) جو عقائد نسفیہ نسفی کی وفات ۱۱۴۲ء میں ہوئی) پر کی گئی ہے، پڑھائی اس کتاب میں اور معتزلہ کے آراء و نظریات میں بعض مقامات پر تشابہ ہے بعض طلباء نے شیخ علیش کے کان بھر دیئے، جو اس وقت فتنہ پردازوں کا سرغنہ تھا، انھوں نے اس سے بیان کیا، کہ محمد عبدہ معتزلہ کا مذہب زندہ کر رہے ہیں، اس کی بازپرس کے لئے آپ کو طلب کیا، زیادہ تر غیظ و غضب کا موجب یہ امر ہوا، کہ ایک طالب علم دشوار اور مشکل کتابوں کو پڑھنے کی جرأت کرتا ہے، جن کو پڑھنے کی ہمت ازہر کے کسی استاد کو نہیں ہوتی، جب محمد عبدہ اس کے پاس آئے تو شیخ علیش نے کہا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے مذہب معتزلہ کو مذہب اشعریہ پر ترجیح دی ہے؟ آپ نے فرمایا جب میں اشعری تقلید کو چھوڑتا ہوں تو معتزلی تقلید کو کس طرح گوارا کرلوں؟ پھر تو میں تمام کی تقلید سے دست بردار رہتا ہوں اور اسی چیز کو قبول کرتا ہوں جو دلیل و برہان کی کسوٹی اور عقل و بصیرت کے معیار پر کھری نکلے۔

نوجوان طالب علم کے اس جواب سے شیخ علیش کو کسی طرح تشفی نہ ہوئی یہ حادثہ ازہر کی فضا میں گونجنے لگا، بعض رجعت پسندوں نے جمال الدین اور محمد عبدہ کے پیروکاروں کے طریقہ میں غور و خوض کرنا شروع کر دیا، اس انقلابی واقعہ کی وجہ سے قریب تھا کہ محمد عبدہ کو شہادۃ عالمیہ کے حاصل کرنے اور ازہر

کے مرتبۂ تدریس سے محروم کر دینے کا فیصلہ ہو جائے، کیونکہ جب آپ نے مجلس امتحان کے روبرو مئی ۱۸۷۷ء میں پیش کیا، تو آپ نے دیکھا کہ اکثر ممتحنین میں جو درپردہ آپ کے دشمن و مخالف تھے، تمام نے باہمی اتفاق کر لیا تھا، کہ آپ کو کسی درجہ میں بھی کامیاب نہ کیا جائے، لیکن آپ نے بے نظیر خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا پھر شیخ محمد عباسی نے، جو اس عہد کے شیخ ازہر تھے اور جن کا تعلق حزب الاصلاح سے تھا، اس معاملہ میں مداخلت کی، اس لئے اساتذہ نے آپ کو ناکام کرنے کی جرأت نہ کی، اول درجہ میں کامیاب کرنے کے بجائے ان سبھوں نے بالاتفاق آپ کو درجۂ دوم میں کامیاب کیا، حالانکہ شیخ عباسی آپ کو درجۂ اول کا مستحق سمجھتے تھے۔

جب محمد عبدہ نے عالمی درجہ حاصل کر لیا، تو آپ کی مدت تعلیم کا بھی خاتمہ ہو گیا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے اندر آپ جامعہ ازہر میں جہاں آپ نے ایک مدت تک طالب علمی کا زمانہ گزارا تھا، بحیثیت مدرس کے عہدۂ درس پر فائز ہو گئے اب یہاں سے آپ کی علمی طلب اور ذوق جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پایا، کیونکہ اپنے آخری دور تک آپ برابر اپنی علمی تشنگی کو بجھاتے رہے، آپ فرمایا کرتے تھے۔

"میں ہمیشہ طالب علم رہا ہوں، ہر روز زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی تمنا کرتا رہا"

اسی روح کو برقرار رکھتے ہوئے آپ نے ازہر میں تدریس کے عہدہ کے لئے پیشقدمی کی، آپ کے علمی ذوق و انہماک اور درس و تحصیل کے ساتھ گہرے شغف نے اس روح کو اور نمایاں اور اجاگر کر دیا،

تیسرا باب

محمد عبدہ کی قومی زندگی کا آغاز

۱۸۷۷ ــــــــــــــ ۱۸۸۸

(۱) محمد عبدہ بحیثیت عالم و صحیفہ نگار

۱۸۷۷ ـــــــ ۱۸۸۲

"میں محض اس لیے پیدا کیا گیا ہوں، کہ ایک کامیاب معلم بن کر رہوں" یہ جواب تھا محمد عبدہ کا، جب کہ لوگوں نے چند سال بعد آپ سے اصرار کیا تھا، کہ موجودہ منصب کو چھوڑ کر، جس کو آپ ازہر میں انجام دیا کرتے تھے، کوئی اور بڑا عہدہ قبول کرلیں

درحقیقت آپ نے اپنی قومی زندگی میں جو قدم اٹھایا تھا اور اپنے آراء و افکار کو پھیلانے اور جمہور کی تعلیم و تربیت میں ہر پہلو سے اپنے جس اثر و نفوذ کو استعمال کیا تھا اس سے بالکلیہ یہ امر روشن ہوجاتا ہے، کہ تعلیم و تربیت کے جذبات سے آپ کا دل معمور تھا اور یہ آپ کے خلوص نیت اور صداقت اعتقاد کی بین دلیل ہے، کہ آپ صرف اسی قسم کی زندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں،

اس کے علاوہ جو علم آپ نے جمال الدین سے حاصل کیا تھا اور جو جذبہ صادق آپ کے سینہ میں دین و وطن کی خدمت کے لئے موجزن تھا، ان دونوں نے ملکر آپ کو دور تحصیل کی فراغت کے بعد عوام کی تعلیم و اصلاح کی طرف متوجہ کردیا، چنانچہ آپ نے عالمی شہادت حاصل کرنے کے بعد پورے جوش و انہماک کے ساتھ ازہر میں منصب تدریس کو قبول کرلیا، بیشتر گوناگوں موضوعات میں یہاں تعلیم دی قطعی براہین کی اساس پر جن کو جمال الدین سے حاصل کیا تھا، عقائد کا نیا درس دینا شروع کردیا۔

دوسری طرف اپنے گھر میں چند طالب علموں کو، جو آپ کے پاس آیا کرتے تھے اخلاق وسیاست کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے، چنانچہ ان کو ابن مسکویہ (متوفی ۱۰۳۰ء) کی کتاب تہذیب الاخلاق پڑھائی، یہ کتاب علم اخلاق میں ہے آج تک مشرق میں اس کو بہت بڑی قدر وقیمت اور شان وعظمت حاصل ہے نیز آپ نے علم سیاست پر طلباء کے روبرو لیکچر دیئے اور آپ کے پیش نظر گیزو کی کتاب "تاریخ تمدن" تھی جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ حال ہی میں ہوا تھا،

۱۸۷۸ء کے اواخر میں اس دور کے وزیراعظم ریاض پاشا نے محمد عبدہ کو مدرسۂ دارالعلوم میں، جس کو علی پاشا مبارک نے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں بنایا تھا، جب کہ وہ عہد خدیوی اسماعیل میں وزیر تعلیمات تھے تاریخ کا استاد مقرر کردیا،

یہ مدرسہ ان اشخاص کی کوششوں کی تصویر تھا، جو ازہر کی اصلاح سے بعض جدید علوم کو شامل کرنے کے سلسلہ میں ناامید ہوچکے تھے، اس مدرسہ کی تشکیل کا مقصد یہ تھا کہ یہاں ان علوم کا بھی درس دیا جائے جو ازہر میں نہیں پڑھائے جاتے تھے، تاکہ اس سے ایسے علماء نکلیں جو موجودہ دور کی علمی زندگی سے قریب ہوں،

محمد عبدہ نے اپنے درس کا آغاز عظیم الشان مورخ وفلسفی ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء) کے مقدمہ کے محاضرات سے کیا، اس قسم کے درس نے مصر میں نہ صرف ایک عہد جدید کی ابتداء کی بلکہ طریقۂ تدریس بھی انوکھا اور نرالا تھا جس کی نظیر وہاں کے ملکوں میں اس سے پہلے ناپید تھی،

نوجوان استاد کا طریقۂ کار یہ تھا، کہ پہلے آپ اس جلیل القدر مورخ کے ان آراء ونظریات کو، جنھیں اس نے قوموں کے عروج وزوال کے اسباب، انسانی تہذیب وعمران کے اصول اور سوسائٹی کے نظام کے بارے میں پیش کئے ہیں

نہایت بسط و شرح کے ساتھ بیان کرتے، اس کے بعد سیاسی و اجتماعی امور میں اپنے ان خاص آراء و خیالات کو پیش کرتے، جن کو آپ جدید کتابوں سے حاصل کیا کرتے تھے، پھر ان تمام کو عملی طور پر اپنی امت کے حالات پر منطبق کرتے تھے،

اسی وقت آپ "مدرستہ الالسن الخدیویہ" میں علوم عربیہ کے مدرس ہو گئے اس طرح آپ اس مدرسہ میں اور ازہر اور دار العلوم میں کام کرنے لگے، آپ نے علوم عربیہ کے ساتھ ساتھ تدریس کے ان طریقوں کی اصلاح و تنقیح کی طرف توجہ کی، جو اس وقت رائج ہو چکے تھے، جن میں آپ کو بے شمار خرابیاں نظر آئی تھیں جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر بیان کیا ہے،

درحقیقت آپ کے طرز تفہیم اور طریقۂ تدریس میں ہمیشہ آپ کا نصب العین اصلاحی رہا، آپ کی غرض و غایت ان تمام سے یہ تھی کہ "مصریوں کے ایک ایسے نوخیز، جواں ہمت طبقہ کی ایجاد کی جائے، جو عربی زبان اور اسلامی علوم کو زندہ کرے اور حکومت کے خمیدہ مہروں کو درست و استوار کر دے"

یہ لطیف اشارہ حکومت کے نظم و نسق کی درستگی کے متعلق غیظ و غضب کی اس عمیق روح پر دلالت کرتا ہے، جو اس دور کے طلباء کے گروہ میں جلوہ گر تھی، کیونکہ وہ مشاہدہ کر چکے تھے، کہ ان کی حکومت کو گھن لگ چکا ہے۔ اور اجنبی حکومتوں کا نفوذ و اقتدار ملک کے مالی نظام میں بڑھ گیا ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا نہایت اہم ہے، کہ محمد عبدہ کا نظریہ یہ تھا کہ مستقبل میں امور کی اصلاح کے لئے تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ ہے آپ نے تہذیب اخلاق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اور اصول حکمرانی کی تعلیم کے سلسلہ میں اس اہم کام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا تھا، لیکن آپ کی تدریس کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

۲۵ رجون ۱۸۷۹ء میں خدیو اسماعیل پاشا نے اپنے لڑکے توفیق پاشا کو تخت سلطنت پر بٹھایا، اس نے جمال الدین کو مصر سے جلا وطن کر دیا، محمد عبدہ کو دارالعلوم اور مدرستہ الالسن سے علیٰحدہ کر دیا، اور آپ کو اپنے دیہات "محلہ نصر" میں نظربند ہونے کا حکم صادر کرہ یا، اس طرح وہ امیدیں اور تمنائیں پامال ہوگئیں، جو آزادانہ سیاسی اور اصلاحی طور پر آپ کے پیرودں سے وابستہ تھیں۔

یہ واقعہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں پیش آیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد عبدہ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ جمال الدین سے گہرے تعلق اور دین وسیاست کے بارے میں آپ کے عجیب وغریب آرار دخیالات کا نتیجہ تھیں، یہی وہ نظریات تھے، جن کو آپ نے دوران تدریس میں نشر کیا اور ان کو اپنے اخباری مقالات میں شائع کیا،

آزاد خیال وزیر اعظم ریاض پاشا اس وقت ملک میں موجود نہ تھے، جب اپنے سفر کے لبعد واپس آئے، تو محمد عبدہ ان تین افراد میں سے ایک تھے جن کو ریاض پاشا نے ستمبر ۱۸۸۰ء میں وقائع مصریہ کی ادارت کے لئے مقرر کیا تھا، یہ اخبار حکومت کا ترجمان تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد زمام ادارت کو آپ کے سپرد کیا گیا، آپ کو اجازت دی گئی، کہ آپ کے ساتھ لبعض مدیر شریک ہوجائیں، یہ تمام آپ ہی کی طرح جمال الدین کے شاگرد تھے، جنھوں نے آپ کی زیرنگرانی انشا پردازی اور تحریر میں پختگی حاصل کر لی تھی، آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا اور آپ کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار تھے

مدیروں کا گروہ ان افراد پر مشتمل تھا، شیخ عبدالکریم سلمان، جو محمد عبدہ کے مخلص دوست اور آپ کے مددگار تھے، شیخ سعد زغلول، جو اس وقت ازہر میں تعلیم پاتے تھے جن کی عمر اکیس سال کی تھی، جو آگے چل کر مصر کی تحریک سیاست

کے انقلابی زعیم اور یہاں کے ترجمان بن گئے، تیسرے فرد شیخ سید وفا تھے۔

اخبار وقائع مصریہ کی ادارت کے لئے جب محمد عبدہ متعین کئے گئے تو اس وقت اس اخبار میں سرکاری اعلانات کے ساتھ ساتھ حکومت کی بعض خبریں اور مقامی واقعات شائع ہوتے رہتے تھے، لیکن جدید مدیر نے اس اخبار کی اصلاح اور اس کے گوشوں کو وسیع کرنے اور اس کے نفوذ و اثر کو بڑھانے کی طرف فوری توجہ مبذول کی، چنانچہ آپ نے ادارہ مطبوعات کے لئے جو تمام مطبوعات اور نود" جریدہ رسمیہ" کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا، ایک لائحہ عمل کا مطالبہ کیا، ریاض پاشا نے آپ کی موافقت کی اور اس مطالبہ کو منظور کرلیا، تجویز کے احکام یہ تھے کہ حکومت کے تمام اداروں، محکموں اور اسی طرح عدالتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی کارگزاریوں، تقررات، فیصلوں اور ان میں قوانین و احکام کو جو نافذ ہو چکے ہیں اور جو مستقبل میں نافذ ہونے والے ہیں، جریدہ رسمیہ (سرکاری) میں بغرض نشر و اشاعت روانہ کریں،

صدر مدیر کو یہ حق حاصل تھا، کہ وہ قابل تنقید احکام و تجاویز پر اپنا نقد و تبصرہ کرے، یہ تنقید محض نظری یا تشکیلی نہ تھی، بلکہ یہ حکومت کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور اس کی تجاویز پر بھی شامل تھی۔ اس تنقید و تبصرہ نے حکومت کے ملازم پیشہ طبقہ کے دلوں میں جذبۂ خلوص اور ایک خاص قسم کا اہتمام صادق پیدا کردیا تھا، کیونکہ تنقید صدر مدیر کے قلم سے سرزد ہوتی تھی اور یہ درحقیقت حکومت کا ترجمان اور اس کے خیالات و آراء پر عبوری نظر رکھنے والا تھا، چنانچہ اس آغازی اقدام نے رفتہ رفتہ مختلف شعبوں کی اصلاح کی طرف متوجہ کرادیا،

آپ سرکاری تجاویز میں انشاپردازی کی سطح کو بلند کرنے پر زور دیتے رہے، یہاں تک کہ اکثر بلند پایہ مصنفین اور چوٹی کے انشاپردازوں نے عربی

زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی شدت سے ضرورت محسوس کی۔ اس مقصد کے لئے شبینہ مدارس قائم کئے گئے' تاکہ مصنفوں اور مدیروں اور صحیفہ نگاروں کو تعلیم دی جائے' عربی زبان میں درس دینے کے لئے محمد عبدہ مقرر ہوئے

صدر مدیر کو مطبوعات کا مدیر ہونے کی حیثیت سے یہ حق حاصل تھا' کہ وہ ملکی اور اجنبی اخبارات و رسائل پر پوری نگرانی رکھے' جو مصری حدود میں نکلتے ہیں' نیز اس کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اخباروں کی ان حقیقت بیانی کا بھی انکشاف کرے۔ جو حکومت کے عہدہ داروں اور اس کی کارگزاریوں کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں' حکومت پر یہ امر واجب تھا' کہ وہ اخباروں کے ان بیانات کی تحقیق کرے' جو ملازموں کے متعلق کہے جاتے ہیں' اگر یہ غلط ثابت ہو جائیں تو اخبار قہر و غضب کا نشانہ بن جائے اگر دوبارہ انہی غلط الزامات اور بے بنیاد افواہوں کو دہرایا جائے تو حکومت پر لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو غیر معینہ مدت تک یا ادارہ کی صوابدید پر جس مدت کو وہ مقرر کرنا مناسب سمجھے معطل قرار دے'

نیز محمد عبدہ نے عربی اخباروں کی تحریری نشان کو دوبالا کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا' چنانچہ آپ نے ایک مشہور جریدہ کے مدیر کو اس کا اخبار بند کر دینے کی دھمکی دی' اگر وہ مقررہ مدت میں کسی صحیح عبارت لکھنے والے شخص کا انتخاب نہ کرے' اس طرح آپ نے اپنے اقتدار و اختیار کو مصر کے ادبی ارتقا کو نمایاں کرنے کے لئے ایک حد تک صرف کیا'

آپ نے پہلے ہی دن سے ملک کی تعلیمی حالت کی اصلاح کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی' بیشمار مضامین نشر کئے' جن میں مدارس' معلمین' طرز تعلیم اور طریقۂ تدریس پر تنقید کی اور ان کی پوشیدہ خرابیوں اور بنیادی معائب کو آشکار کیا

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمات کی ایک اعلیٰ مجلس کی ۱۳ مارچ ۱۸۹۵ء میں تشکیل عمل میں آئی اور شیخ عبدہ اس کے رکن منتخب ہوئے پھر آپ ہی ایک ذیلی مجلس کے بھی رکن مقرر ہوئے، جس کو مجلس اعلیٰ نے تمام مدارس میں تعلیم و تربیت کے اصلاحی طریقوں میں غور و فکر کرنے کے لئے ترکیب دیا تھا[1] جس طرح حکومت کے دیگر بیشتر شعبوں نے آپ کے ارشادات و نصائح سے استفادہ کیا اسی طرح سررشتۂ اوقاف نے بھی ان کو اپنا مشعل راہ بنایا،

اس کے باوجود محمد عبدہ نے جریدہ رسمیہ (سرکاری) کے دائرۂ نفوذ و اقتدار کو حکومتی اداروں کی تنگ جولاں گاہوں میں ہی محصور نہ رکھا، بلکہ اپنے انقلابی آراء و تحریکات اور اصلاحی کوششوں کی نشر و تبلیغ کے لئے ایک ادبی شعبہ قائم کیا، تاکہ اس میں آپ اپنے اور اپنے مددگاروں کے ان آراء و افکار کی اشاعت کریں، جو قوم کے مسائل حیات سے متعلق ہیں، مصر میں اس قسم کے اخباروں کی بے حد کمی تھی، جو عوام کے اندر اصلاح و انقلاب کی روح پھونکنے کا ارادہ کرنے والے ہوں،

---

[1] مجلس نے محمد عبدہ کے مطالبات کے موافق قرار دادیں پیش کیں، منجملہ ان کے یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت اجنبی مدارس کے لئے ان کی علمی خدمت کے مطابق رقم مخصوص کر دے یہ امر طبعی تھا، کہ اس خصوصی امداد کی وجہ سے یہ مدارس نہایت مسرت کے ساتھ اس کو قبول کر لیتے، لیکن اس کے ساتھ یہ قانون بھی نافذ کیا گیا کہ یہ مدارس حکومت کی نگرانی میں رہیں گے، کیونکہ حکومت سے ان کو امداد ملتی ہے، تمام مدارس میں تعلیمی نظام میں اس قسم کی تبدیلی کی ضرورت کو حکومت نے تمام حکومتوں کے طرز عمل کی پیروی میں اختیار کیا۔ مثلاً ان مدارس کی نگرانی و معائنہ کرنا، جن کو وہ اپنے خزانے سے امداد دیتی ہے، مگر فتنۂ اعرابیہ نے ان مطالبات کی تنفیذ و تکمیل کا موقعہ نہ دیا (المنار جلد ۸ صفحہ ۴۱۰)

محمد رشید رضا مرحوم نے اپنی کتاب "تاریخ الاستاذ الامام" میں چھتیس[36] مقالے نشر کئے ہیں، یہ تمام وہ اہم مضامین ہیں جن کو محمد عبدہ نے "وقائع مصریہ" میں تحریر کئے تھے، ان میں ملک کی زندگی کے اکثر گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں مقالہ نگار کا وہ کمال اہتمام ظاہر ہوتا ہے، جو اپنی امت کی ترقی کے لئے صرف کیا، نیز ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نے قوم کی ترقی کی عمارت کن مضبوط بنیادوں پر رکھنا چاہی تھی، حالانکہ اس کے علاوہ دوسروں نے قومی ترقی کے بہت سے نظریات و تجاویز پیش کئے تھے، اور یورپ کی نقل اتارنے اور اس کی کورانہ تقلید کرنے پر اپنا سارا زور صرف کر رہے تھے!

ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ آپ نے مدارس کے طریقہ تعلیم پر کس بیباکی سے تنقید کی ہے، اس کے علاوہ آپ نے اپنی تبلیغی مساعی اور انقلابی تحریکات کو نہ صرف تنقید و نکتہ چینی ہی پر محدود رکھا، بلکہ آپ نے یکے بعد دیگرے مسلسل اپنے تعلیمی خیالات کا اظہار کیا،

(11)

آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ اپنی قوم کو تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت کے بلند مقام تک پہنچانا اتنا آسان امر نہیں ہے جیسا کہ بعض تعلیم یافتہ طبقہ گمان کئے ہوئے ہے، آپ کا خیال یہ تھا کہ درحقیقت قومی ارتقار اس میں نہیں کہ یورپ کے مختلف علوم مجرد طور پر حاصل کر لئے جائیں یا اپنے معاشی حالات میں یورپ کی تقلید کر لیں۔ کیونکہ اگر تعلیم کو محض معاشی زندگی کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اخلاق و عادات، رسم و رواج، بود و باش، پوشاک گھر کے ساز و سامان اور تعیش پسندانہ نمائش میں یورپ کی تقلید کا رنگ غالب آجائے گا اور یہ ایک ایسی روح جدید کی تخلیق کا موجب ہوگا، جو اس جادۂ مستقیم کو فراموش کر دے گی، جو شرف حقیقی اور مجد ذاتی تک پہنچانے والا ہے"

لیکن آپ کا نظریہ یہ تھا، کہ امت کی ترقی محض ایسا راستہ اختیار کرنے پر موقوف ہے، جو افراد کو بلند مقام تک پہنچا دے، اس لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ عادات اور رسم و رواج میں رفتہ رفتہ تبدیلی کی جائے اور اس کی بجائے سہل اور سادہ طریقے اختیار کئے جائیں، امت کے اہم ترین فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ تہذیب اخلاق سے آراستہ ہو اور لوگوں کے افکار و کردار کو دوبالا کرنے کے لئے جد و جہد کرے، اس کے بغیر اصلاح نہایت دشوار ہے، مگر یہ ایک وسیع کام ہے، اس میں پہلا زینہ اصلاح تعلیم ہے

محمد عبدہ نے محسوس کیا کہ بچہ کے عقیدہ و مذہب پر تعلیم کا گہرا اثر ہوتا ہے چنانچہ آپ نے والدین کو بار بار لکھا کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے مدارس اور اداروں میں نہ بھیجیں، جن میں غیر مذہب کے معلمین پڑھاتے ہوں، کیونکہ بعض اوقات ان بچوں نے بڑے ہونے کے بعد اپنے استادوں کا دین اختیار کر لیا، اس لیے کہ کمسنی کے عالم میں مذہبی تعلیم بچہ کے دل و دماغ اور اس کے اخلاق و عادات میں لازمی طور سے سرایت کر جاتی ہے، اگر بچہ اپنا دین تبدیل کر دے، تو والدین کو سوائے اپنے افسوس پر ملامت کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں،

آپ نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "علم اور اس کا اثر ارادہ و اختیار پر" دوسرا مضمون "ملکات و عادات" میں اور اس کے علاوہ "تمدن" پر بھی مقالہ لکھا ہے، اس میں آپ نے بعض لوگوں کی خصوصاً ان مالداروں کی رائے پر بحث کی ہے، جن کے پاس تمدن سے مراد اسراف اور بیجا اخراجات ہیں۔

ایک اور مضمون قوموں کے ان کردار و عادات پر لکھا جو اصلاح کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اس میں آپ نے رشوت کی مذمت کی اور اس

پر نہایت افسوس کا اظہار کیا، کیونکہ عوام الناس رشوت ستانی کو عدل کے نفوذ یا ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔

"شادی کی ضرورت انسان کیلئے"۔ جو مضمون لکھا ہے اس میں شادی کو اجتماعی نظام کا ایک ضروری جز قرار دے کر اس پر بحث کی ہے اور تعدد ازدواج کی اُن خرابیوں کو تسلیم کیا ہے، جو خاندانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں نیز اس امر کی تصریح کی ہے، کہ اسلامی شریعت نے شوہر پر اپنی بیویوں کے مابین حدود اللہ کو عادلانہ طور پر برقرار رکھنے کو جو فرض ٹھہرایا ہے اس کا عملی مقصد محض یہ ہے کہ صرف ایک زوجہ پر اکتفا کر لیا جائے۔

نیز آپ نے دینی رسم ورواج کی تردید میں جو مذہبی روح کے منافی اور معرت رساں ہیں، مقالہ لکھا اور دو مضمون اسراف اور دیوانہ وار خرچ کرنے کے بارے میں تحریر کئے ان میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ اس سے ناواقف ہیں کہ فقروفاقہ اور فضولخرچی کے درمیان کیا تعلق ہے، پھر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقی فقرالناس تو محض تربیت کی خرابی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

مقالات کے تیسرے سلسلہ میں آپ نے اُمت کی سیاسی زندگی کو بہتر بنانے کی تدبیریں پیش کی ہیں ان میں بیان کیا ہے کہ ملک کے قوانین کا احترام کرنا سعادت وخوشحالی کی لازمی ضروریات میں سے ہے، قوانین کا قوموں کے مختلف حالات کے پیش نظر گوناگوں اور مختلف ہونا ضروری ہے نیز ان میں اتنی لچک ہو کہ وہ ہر قوم کے افکار ونظریات سے میل کھا سکیں، ان قوانین کو وضع کرتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ وہ ان اشخاص کے عقلی درجات کے ہم آہنگ ہوں، جن کے لئے یہ وضع کئے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے مبہم نہ ہوں، جس سے ان کا سمجھنا ان کے لئے دشوار ہو جائے،

اور وضع قوانین کا مقصد فوت ہوجائے'

آپ نے حکومت شوریٰ (پارلیمنٹ) پر بھی بحث کی ہے، جس میں یہ بیان کیا ہے کہ امت کے منتخب اربابِ اقتدار جو بھی قانون وضع کریں اس میں یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلامی روح کے عین مطابق ہو نیز عوام پر یہ وظیفہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مندوبوں کے واسطہ سے حاکموں کی خیر خواہی کرتے رہیں، شریعت نے حاکموں کی باہمی خیر خواہی کے لئے کوئی خاص کیفیت و نوعیت بیان نہیں کی، اس لحاظ سے کوئی امر مانع نہیں کہ ایسا کوئی خاص نظام وضع کر لیا جائے۔ جو عدل و انصاف کا ذمہ دار اور قومی مصلحت کا کفیل ہو، ہر فرد پر یہ امر واجب ہے کہ وہ اپنے وطن سے محبت رکھے اور اس کی ہر طرح حفاظت و حمایت کا دم بھرتا رہے۔

واقعی یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے جیسا کہ محمد رشید رضا کا بیان ہے کہ جریدۂ رسمیہ کا صدر مدیر جو ازہری استاد ہے جس کے سر پر عمامہ ہے، ایسی استبدادی حکومت میں مجلس حکم میں شریک ہوتا ہے جس کے دسائس میں اور علماء ارباب دین کے اختیارات میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ شخص سرکاری ملازمین کی کارگزاریوں پر غور کرتا ہے اور ان کو تنقید کی کسوٹی پر کھتا ہے اصلاحی نقطۂ نظر سے ان کی کوششوں کی سرپرستی کرتا ہے، ملکی صحافت کو حق و صداقت کی تعلیم دیتا ہے، اس کے ادبی مقام کو بلند کرتا اور امت کے اخلاق و کردار کو درست کرنے کے لئے پیہم جد و جہد کرتا ہے'

لیکن حوادث روزگار پوشیدہ طور پر اس اہم کام سے باز رکھنے کیلئے کام کرتے رہے، جیسا کہ اس سے بیشتر تعلیمی راستہ میں آپ کی تحریکات کے لیے ایک حد مقرر کر دی گئی تھی، چنانچہ مئی ۱۹۰۲ء میں تقریباً اٹھارہ مہینے

کارگزار رہنے کے بعد "وقائع مصریہ" سے آپ کا تعلق منقطع ہو گیا اسی زمانے میں احمد اعرابی پاشا کی تحریک تیزی کے ساتھ اپنا راستہ طے کر رہی تھی اور اعرابی پاشا نے کافی قوت و غلبہ حاصل کر لیا تھا، اس شان و شوکت کا مظاہرہ احتجاجی شکل میں مصری فوجی افسروں کی طرف سے ہوا کیوں کہ مصری فوج میں ترکسی نژاد افسروں کو ترجیح دی گئی تھی۔ پھر یہ تحریک وسیع ہو گئی، آخرکار یہ اجنبیوں کے ممتاز مرکز اور ملکی معاملات میں ان کے قوی نفوذ و اثر کے خلاف بغاوت میں منتقل ہو گئی،

اس طرف اعرابی پاشا جو پہلے نائب کے مرتبہ تک پہنچ گیا تھا، پھر وکیل جنگ منتخب ہوا اور اس کے بعد ۴ فروری ۱۸۸۲ء میں محمود پاشا سامی کی وزارت میں وزیر جنگ ہو چکا تھا، اب وطنی قائد اور بطل حریت ہو گیا، لشکر کے ہاتھ میں ملک کی زمام اختیار آگئی اور وہی اس کی تمناؤں، اور ارادوں کا ترجمان بن گیا،

جب ۲۶ مئی میں وزارت کا خاتمہ ہو گیا، تو یہی موقعہ تھا، کہ اعرابی پاشا دوبارہ وزیر جنگ بن جاتا، لیکن حالات و حوادث نے آزادی و استقلال کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا، چنانچہ ۱۱ جون کو اسکندری فتنہ پھر تروتازہ ہو گیا، ۱۲ جولائی کو برطانوی سمندری بیڑے نے اسکندریہ کے قلعوں کو بموں کا نشانہ بنا دیا، ۱۳ ستمبر میں مصری فوج نے تل کبیر میں برطانوی فوجوں کے مقابل شکست کھائی، دو دن کے بعد اعرابی پاشا گرفتار ہو گئے

---

[1] جنوری ۱۸۸۱ء میں تینوں فوجی افسر اعرابی، علی فہمی اور عبد العال وزیر جنگ عثمان رفقی پاشا کے پاس احتجاج کرنے کے لئے گئے، ان کو گرفتار کرنے کے لئے احکام صادر ہوئے، فوج نے یکم فروری کو مظاہرہ کیا اور ان کو قوت بازو کے ذریعہ رہائی دلائی۔

اس طرح وطنی تحریک بالکلیہ ختم ہوگئی، اس تحریک کے علمبرداروں اور قائدین کو نظر بند کر دیا گیا اور عرابی پاشا کو قتل کر دینے کا حکم صادر کیا گیا، پھر سیلون میں جلا وطن کر کے اس حکم میں تخفیف کر دی گئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس دور میں محمد عبدہ نے "وقائع مصریہ" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے وہ ایک بڑی حد تک تحریک اعرابیہ کی تاریخ سے اتفاق رکھتا ہے،

گو آپ ترقی پسندوں کے زعیم اور جمہوری حکومت کے قیام کے داعی تھے، آپ کی یہ کوشش نہ صرف اس اعتبار سے تھی کہ مصر جیسے اسلامی ملک میں آپ جمہوری داغ بیل ڈالنے والے تھے، بلکہ اس حیثیت سے اس کے داعی تھے کہ یہی ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کی طرف پہنچنا ناگزیر ہے، نیز آپ نے اجنبی مداخلت کی برائیاں کھول کھول کر بیان کیں[1] لیکن ان تمام کے باوجود وطنی تحریک میں آپ کا بھی حصہ تھا، لارڈ کرومر آپ کی اس خصوصیت کے بارے میں کہتا ہے "بلا شک وشبہ آپ وطنیت کے علمبردار تھے"

درحقیقت آپ جیسا کہ لارڈ کرومر کا بیان ہے، تحریک وطنی کے روح رواں تھے، تحریک کے ابتدائی ادوار میں اور قبل اس کے کہ فوجی قائدین اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے تلواروں کو میان میں سے نکالیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ اپنی اصلاحی تحریکات کو وسیع پیمانے پر نافذ کرنے کا

---

[1] المنار جلد ۸ صفحہ ۴۱ - ۵۱ کی روایت یہ ہے کہ محمد عبدہ جمال الدین کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے جمہوری حکومت کی مدافعت کی اور حکومت کے اختیارات کو دستور کے ساتھ محدود کرنے کی کوشش کی، نفس مصدر صفحہ ۴۱ کا بیان ہے کہ جمال الدین اور محمد عبدہ دونوں کے دونوں اسماعیل پاشا کی حکومت کے زمانے سے اجنبی غلبہ و دخل سے اندیشہ کرتے رہے تھے، اپنے خطبوں اور تحریروں میں اسی خطرہ کو زیادہ تر آشکار کیا،

وقت قریب آچکا ہے، اس وقت آپ یہ خیال کرتے تھے، کہ ملک کے زعمار وقائدین شخصی اغراض سے کوسوں دور ہیں اور وہ تمام اصلاحی راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور عدل ومساوات کی مضبوط عمارتیں قائم کر رہے ہیں، چنانچہ آپ نے مخلصانہ طور پر اپنی تمام قوتوں کے ذریعہ تحریک کو سرگرمی کے ساتھ چلانے کا قصد کرلیا، آپ نے قائدین وزعمار کی بہتر خواہی اور ان کو مفید مشورے دینے سے "خواہ وہ ان کی خلاف مرضی ہی ہی کبھی بخل سے کام نہ لیا"[1]

"وقائع مصریہ" کی نگارش اور ملکی صحافت کی نگرانی کے جو اختیارات آپ کے تفویض تھے، ان کے ذریعہ سے آپ کو اس کا سنہری موقع مل گیا، کہ آپ رائے عامہ کو متحد کردیں اور ان معقول اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے عوام کو آمادہ کریں جنکے عمل درآمد ہونے کی آپ کو زیادہ توقع تھی،

قائدین وزعمار کا وہ گروہ، جو اعرابی پاشا کے ارد گرد جمع ہوا تھا، اپنی نگاہیں محمد عبدہ کی ذات پر مرکوز کئے ہوئے تھا، یہ تمام آپ کو اپنا معلم اور ان کے افکار کا قائد سمجھتے تھے، آپ کے سامنے یہ سب وطن اور اس کی فلاح وبہبود کے لئے آپ سے اطاعت کا پیمان باندھتے تھے، یہاں تک کہ آپ کو زعماء انقلاب مثلاً عبداللہ ندیم وغیرہ مشہور زعیموں کے مابین اس تحریک انقلاب کا زعیم منتخب کرلیا گیا۔

---

[1] بلنٹ مصر کی تاریخ سری مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۲ء (صفحہ ۱۰۱) کہتا ہے کہ عرابی پاشا کی تحریک کے مظاہرہ کے بعد جس میں اس نے ریاض پاشا کو معزول کرکے پارلیمنٹ قائم کی اور شریف پاشا کو وزیر مقرر کیا، صحافت محمد عبدہ کی زیر نگرانی پہلے سے بھی زیادہ دیرینہ قیود سے آزاد ہوگئی اور پورے جوش ونشاط کے ساتھ اخبارات شائع کرنے لگی۔

جس وقت محمد عبدہ نے انتقال کیا، تو اس عہد کی صحافت کے بیان کے مطابق تمام کی نظر میں آپ مسلسل تحریک کے علمبردار تھے اور اس میں آپ کا قوی اثر تھا، اکثر اخباروں کے بیانات کے پیش نظر ہم مجمل طور پر یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اعرابی تحریک کے علمبردار سوائے آپ کے مشورہ کے کوئی کام نہیں کرتے تھے،

اس کے علاوہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ عام طور سے انقلابی تحریک کے زعیم تھے اور آپ کا اس کے اندر قوی نفوذ واثر تھا لیکن اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو حق بات وہی ہے جس کو محمد رشید رضا نے بارہا بیان کیا ہے، کہ اکثر اہم امور میں محمد عبدہ کے آرا فوجی زعماء کے خیالات سے مختلف تھے، جب یہ تحریک ارتقائی منزل پر پہنچ گئی تو ان کے درمیان اختلافات کی یہ خلیج بھی وسیع ہوگئی، آخر میں آپ کو مجبوراً اپنی تقریروں، تحریروں اور ان کے ساتھ بحث ومباحثہ میں ان کی کارروائیوں اور ان کی اکثر وبیشتر پیشقدمیوں پر تنقید وجرح کرنی پڑی، آپ ان کے وسائل وذرائع کے ساتھ متفق نہیں تھے، بالخصوص ان کی قوت کے سایہ میں پناہ لینے کے طرز عمل کے مخالف تھے آپ ان کی طرح ان کے اس اقدام کے حسن انجام کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتے تھے

محمد رشید رضا نے آپ کے اس مقام وموقف کو اختصار وایجاز اور نہایت دقیق پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"آپ عسکری بغاوت کے مخالف تھے، اگرچہ آپ عقلی وفکری تحریک کے روح رواں تھے"

آگے بیان کرتے ہیں:

"شیخ عبدہ اس بغاوت وانقلاب کی ابتداء میں اس کو ناپسند کرتے تھے زعماء انقلاب کیساتھ رہکر آپ ان کو اس فتنہ کی آگ کو تیز کرنے سے منع کرتے تھے۔

کیوں کہ آپ بخوبی واقف تھے کہ یہ تحریک آپ کے اس علمی کام کو ختم کر دے گی جس کو آپ نے جاری کر رکھا ہے اور سر اس اصلاح کا خاتمہ ہو جائے گا جس کو حکومت انجام دے رہی ہے یا آئندہ ارادہ کرتی ہے، نیز یہ انقلابی فتنہ ملک پر غیروں کے تسلط و غلبہ کے لئے راستہ کو ہموار کر دے گا[1]

آپ علی الاعلان زعماء انقلاب پر تنقید کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ لوگ آپ کو دھمکیاں دینے لگے کہ اگر آپ ان کی مخالفت سے باز نہ آئیں گے اور ان کے جھنڈے تلے جمع نہ ہو جائیں گے، تو آپ کے ساتھ حد درجہ سختی برتی جائے گی[2]

محمد عبدہ اور اعرابی پاشا اور اس کے فوجی پیروؤں کے درمیان طلبہ پاشا کے گھر میں جو مباحثہ ہوا، وہ فریقین کے اختلاف رائے اور ان کے نقطہ ہائے نظر پر روشنی ڈالتا ہے اعرابی اور اس کے مددگار اس امر پر متفق تھے کہ نیابی دستوری حکومت کے قیام کا مصر میں وقت قریب آ چکا ہے محمد عبدہ نے اس کی مخالفت میں کہا کہ سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایسے اشخاص

---

[1] نفس مصدر صفحہ ۱۴۲ نیز دیکھو ملنت کا بیان جس میں وہ کہتا ہے کہ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ شیخ محمد عبدہ اور میرے بقیہ ازہری احباب قوت کے وسائل کو استعمال کرنے پر رضامند نہ تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عرصہ دراز سے جن اصلاحات کی یہ تبلیغ کر رہے ہیں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے (مصر کی تاریخ سری صفحہ ۱۲۰)

[2] المنار جلد ۸ صفحہ ۴۱۳ کا بیان ہے کہ اعرابی نے ایک مرتبہ دو فوجی افسروں کو محمد عبدہ کے پاس آپ کو دھمکی دینے کے لئے روانہ کیا، یہ بیان رشید رضا کی کتاب تاریخ جلد ۳ صفحہ ۲۱ کے اس قول کے ہم آہنگ ہے کہ "فتنہ اعرابیہ کا سیلاب زوروں سے امنڈنے لگا تو محمد عبدہ نے اس کے علمبرداروں کو انکی نا عاقبت اندیشی اور سوء انجام سے باخبر کرنیکی کوشش کی یہاں تک کہ انھوں نے آپکو قتل کرنیکا ارادہ کر لیا

کو پیدا کیا جائے، جو عزم و استقلال کے ساتھ فکر و بصیرت کی روشنی میں نیابی حکومت کے کام انجام دیں اور حکومت کو عدل و انصاف اور اصلاح و فلاح کے لئے آمادہ کریں، اس سلسلہ میں ملک کے باشندوں اور سربرآوردہ اشخاص کو تیار کرایا جائے تاکہ وہ خاص کمیٹیوں میں جو صوبوں میں تشکیل دی جائیں رعایا کی ضروریات پر بحث کریں اور ملک کے اہم انتظامات میں ان سے مشورہ بھی طلب کیا جائے، یہ کسی طرح قرین حکمت و دانش نہیں کہ رعایا کے سپرد ایسے کام کئے جائیں جن کو انجام دینے کی ان کے اندر صلاحیت نہ ہو، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے مال میں سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے تصرف پر قدرت رکھنے سے قاصر ہے، تاوقتیکہ اس کی تربیت کمال درجہ تک نہ پہنچ جائے اور مفید تصرف کرنے کی صلاحیت و اہلیت اس کے اندر پیدا کر دے،

اگر قوم کے اندر اپنے معاملات سنبھالنے اور انتظامات انجام دینے میں حکومت کی مشارکت کی صلاحیت و استعداد ہوتی، تو اس کو حاصل کرنے کے لئے فوجی قوت کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، پھر آپ نے فرمایا کہ آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ مبادا ملک کے اس شور و شغب اور فتنہ و بغاوت کا نتیجہ اجنبی اقتدار کی صورت میں نمایاں ہو جائے اعرابی باشا نے کئی مرتبہ کہا "آپ اطمینان رکھیں، میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ آپ کی خواہش سے بڑھ کر چند سال کے اندر مطالبات کی تکمیل ہو جائے گی،

دوسرے موقع پر، جب کہ زعماء انقلاب نے اپنے روبرو آپ کو مورد الزام ٹھرایا اور آپ نے ان کے سامنے تقریر کی، تو آپ کی تقریر کا موضوع ایک تاریخی بیان تھا آپ نے فرمایا کہ: قوموں کی سیرت و کردار اور سوسائٹی کے قوانین میں یہ طریقہ رہا ہے، کہ استبدادی حکومتوں کے غلبہ و اقتدار کو محدود کرنا

اور رعایا کے درمیان جمہوریت و مساوات کو قائم کرنا اوسط و ادنیٰ طبقوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے جب کہ ان میں صحیح تعلیم و تربیت عام ہوا ور عام رائے دہندگی میں ان کو حق حاصل ہو روئے زمین پر بسنے والی کسی قوم کی تاریخ میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ خاص اشخاص، مالداروں اور ارباب حکومت نے خود کو دیگر تمام لوگوں کے برابر سمجھا ہو اور ادنیٰ طبقہ کے ساتھ شریک ہو کر اپنے امتیازات کو زائل کر کے زندگی کی ضروریات میں ان سے مشورہ طلب کیا ہو، بھلا اب اس مرتبہ اور اس جماعت کے افراد سے کس طرح مساوات کی توقع پوری ہو سکتی ہے ؟ کیا قدرت کا قانون اپنی مخلوق میں تبدیل ہو گیا اور عالم انسانی کے کردار بدل گئے ؟ یا تم فضل و شرف کے اس بلند درجہ پر فائز ہو گئے ہو، جہاں تک دنیا کا کوئی شخص نہیں پہنچا، کہ تم عقل و بصیرت سے اس کے لئے تیار و رضامند ہو گئے کہ اپنی ساری قوم کو اپنے جاہ و منزلت میں شریک کر لو اور عدالت و انسانیت سے محبت کا دم بھرتے ہوئے بے نواؤں اور فاقہ مستوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنے لگو ؟ یا تم اس منزل کا سفر کر رہے ہو جو تم کو نا معلوم ہے اور وہ کام کر رہے ہو، جن کی تم کو خبر تک نہیں ؟"

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں محمد عبدہ نیابی حکومت کی تائید کرنیوالوں میں سے تھے، لیکن آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ اس قسم کی حکومت کا قیام امراء اور اس کی حکومت کی رضامندی کے ذریعہ ہونا چاہئیے نہ کہ اسطرح پر کہ اس کے خلاف بغاوت کر کے حاصل کی جائے۔ نیز ابتداء میں تعلیم و تربیت کے ساتھ اس کی مشق و مزاولت کی جائے یہاں تک کہ جدید نسل اپنی قوت و طاقت کی انتہا تک پہنچ جائے اور دانش و حکمت کے طریقہ سے رشد و کمال تک رسائی حاصل کرے،

اس کے باوجود جب آپ کو حسب اقتضائے حالات دو امور میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا اختیار دیا گیا، یا تو آپ اصلاح پسندوں میں شامل ہوجائیں یا ملک کے امیر کی صف میں کھڑے ہوجائیں۔ جو درحقیقت غیروں کے غلبہ و تسلط کی صف تھی، تو آپ نے اصلاح پسندوں کے زمرہ میں جانے کو اختیار کرلیا حالانکہ آپ کو ان کے انجام کار کا اندیشہ تھا۔

جب انقلابی تحریک ناکام ہوگئی تو محمد عبدہ کو زعماء انقلاب کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا، یہ تمام عدالت میں پیش کئے گئے آپ کو تین ماہ نظربند کرنے کے بعد تین سال کے لئے جلاوطنی کا حکم صادر کردیا گیا۔ حکومت کی اجازت کے بغیر آپ کو اپنے ملک واپس آنے سے روک دیا گیا۔ یہ فیصلہ ستمبر ۱۸۸۲ء میں صادر ہوا۔ اس سال کے ختم ہونے سے پیشتر محمد عبدہ نے مصر کو خیرباد کہکر شام کی طرف رخ کیا، تاکہ یہاں اپنے ملک کی طرف واپسی کی اجازت ملنے تک کوئی ٹھکانا تلاش کریں۔

اس طرح آپ کی وہ ابتدائی کوششیں جنھیں آپ نے اپنے ملک کو بیدار کرانے اور اس کو بام ارتقار پر گامزن کرنے کے لئے صرف کی تھیں، نہایت حسرت ناک اور مایوس کن ناکامی پر ختم ہوگئیں، نیز یہ دیکھ کر آپ کو مزید قلق و ملال ہوا، کہ آپ کے چند رفقار کار، جن کی طرف آپ بہت زیادہ مائل تھے اور ان پر اعتماد و اطمینان رکھتے تھے عدالتی فیصلہ کے وقت آپ سے برگشتہ ہوگئے اور آپ ہی پر تمام الزامات عائد کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ گراں قدر امیدیں اور عظیم الشان تمنائیں جو آغاز کار ہی سے آپ کے سینہ میں موجزن تھیں ان کے بھڑکتے ہوتے شعلے بجھنے والے نہ تھے۔

آپ نے قیدخانہ سے اپنے پنج نامہ کے دوران میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں ان بے بنیاد الزامات کو بیان کرنے کے بعد جو آپ کے سر عائد کئے گئے تھے فرماتے ہیں:

"ذہشت انگیز واقعات و حوادث تو فراموش ہو جائیں گے لیکن یہ مجد و شرف عنقریب لوٹ جائے گا اگر اس سرزمین کی فطرت اپنی خست اور کم ظرفی کی وجہ سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے اور اپنی قسمت کو واپس لینے سے انکار کر دے تو یہ کسی دوسرے ملک میں جو اس سے بہتر ہوگا، لوٹ جائے گا، اس وقت میں اپنے رفیقوں کو مجد و شرف کی طرح کھینچ لاؤں گا اور وہ بلندی و برتری کی طرف منجذب ہو جائیں گے، یہ تمام اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ میں زندہ رہوں، جسمانی صحت میری مساعد و سازگار ہو ان دونوں آرزوں کے ماورا کوئی اور چیز طلب نہیں کرتا بجز اس خدائے واحد کی امداد و اعانت کے جس کو بعض لوگوں نے پہچانا ہے اور بعضوں کو اس کی ذات سے انکار ہے۔"

(۲)

زعیم انقلاب

یا

جلاوطنی کی زندگی کے حالات

(۱۸۸۲ —— ۱۸۸۸)

جب محمد عبدہ نے ۱۸۸۲ء کے اواخر میں مصر کو خیرباد کہا، تو آپ نے اپنے وطن کی طرف واپسی کی آپ کو اجازت ملنے تک، شام میں ٹھہرنے کا مستقل ارادہ کرلیا تھا لیکن بیروت میں تقریباً ایک سال قیام پذیر رہنے کے بعد جمال الدین نے" جو ۱۸۸۳ء کے شروع میں پیرس میں تھے، آپ کو ایک خط لکھا، جس میں آپ کو "مسئلہ مصریہ" میں اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلایا،

چنانچہ آپ ۱۸۸۴ء کے شروع میں بیروت سے روانہ ہوئے اور پیرس میں اپنے استاد کے پاس پہنچ گئے، جہاں آپ دس مہینے تک ٹھہرے رہے، اس دوران میں آپ ایک یا دو مرتبہ انگلستان گئے" تاکہ مصر و سوڈان کے امور میں، جو اس وقت مہدی سوڈانی کے فتنہ کی وجہ سے اضطراب انگیز صورت اختیار کرچکے تھے، برطانیہ کے سربرآوردہ عہدہ داروں سے بات چیت کریں، ان دونوں رفیقوں نے اس وقت ایک سیاسی پوشیدہ جماعت کی تنظیم کے لئے کام کرنا شروع کیا جو "جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ" سے نامزد تھی، جس کو ان دونوں نے تمام اسلامی ممالک میں عام فکری و ذہنی بیداری کی لہر دوڑانے اور اتحاد و یگانگت کی طرف دعوت دینے کے لئے تشکیل دی تھی، پھر جمعیت کے نام سے عوام الناس کے درمیان اپنی

تحریکات کو پھیلانے اور دعوت و تبلیغ کو عام کرنے کے لئے ایک

جب رسالہ موقوف کر دیا گیا تو دونوں دوست بچھڑ گئے، جمال الدین روس کی طرف چلے گئے اور محمد عبدہ نے ۱۸۹۳ء میں تونس کی طرف رُخ کیا جہاں آپ کچھ عرصہ ٹھہرے رہے، اس کے بعد بھیس بدل کر اکثر خطوں میں کوچ کیا، لوگوں کو باہمی اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے رہے اور ایک مرکز پر جمع ہونے کا پیغام دیا۔[۱]

باوجودیکہ اس رسالہ کی مدتِ حیات بہت کم تھی لیکن اس کے پیغام عمل اور دعوتِ فکر سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی کامیابی کے سبب کو معلوم کر لینا بہت آسان ہے، یہ رسالہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط پر خون کے آنسو بہاتا تھا ان تمام کو ایک دین کے جھنڈے تلے متحد ہونے کی دعوت دیتا تھا، تاکہ وہ اپنے ظالم حاکموں کے غلبہ کو دور کر سکیں اور ان اجنبی سلطنتوں کے مظالم کی روک تھام کریں جو ان کے مذہب اور ان کے اسلامی روایات کی مخالفت کرتے ہیں، نیز یہ کہ مسلمان پھر متحد و کامران اور فاتح اسلام کو اس کا اگلا وقار و شرف لوٹا دیں،

عروۃ الوثقیٰ نے ان تمام مسلمانوں کے اندر بیداری کی روح پھونکنے کے لئے اپنی دعوت و تبلیغ کے فرض کو خوش اسلوبی اور موثر طریقہ سے انجام دیا، جن کو یہ دیکھ کر رنج ہوتا تھا کہ اسلامی جماعتیں پراگندہ و منتشر ہو گئی ہیں، ان کے اندر نفاق و اختلاف کے عناصر جاگزیں ہوئے اور انحطاط و زوال کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، نیز

---

[۱] المنار جلد ۸ صفحہ ۶۲۴ عبد الرازق ومیشل صفحہ ۱۲۵۔ تاریخ جلد ا صفحہ ۳۹۰۔ البدایہ نیز کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ محمد عبدہ بھیس بدل کر مصر میں داخل ہوئے تاکہ سوڈان کے سفر کی تیاری کریں، جہاں آپ جمال الدین سے ملنے کے منتظر تھے جب کہ مہدی ت متعلق کوششیں کامیاب ہو جائیں ان دونوں کی غرض و غایت مہدی کی فوجوں کی تنظیم کے لئے خفیہ کوشش تھی، تاکہ ان کو مصر کی آزادی کا ذریعہ بنائیں۔

اس رسالہ نے جدید انداز میں اور بے نظیر فصیح عربی زبان میں اپنی دعوت پہنچائی، اس کی دعوت وتحریک کے اہم نقاط یہ تھے کہ:

"اسلامی دین ہی وہ مضبوط زنجیر ہے، جو مسلمانوں کی منتشر توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کرتا اور ان کے پراگندہ اجزاء کی تنظیم کرتا ہے، ان کے درمیان سے رنگ نسل، قوم و وطن کے امتیازات، وحدود کی چٹانوں کو پاش پاش کردیتا ہے، اسلامی شریعت نے بندوں کے معاملات کے درمیان پورے پورے حدود مقرر کردیئے اور حاکم ومحکوم کے لئے جزئی وکلی حقوق کی تصریح کردی، چنانچہ اس نے جنسی تفریقات اور نسلی امتیازات کا خاتمہ کردیا اور باہمی نفرت ومسابقت کے لئے کوئی گنجائش نہ چھوڑی،

اگر مسلمانوں کا کوئی حاکم اسلامی شریعت اور اس کے قانون کو مضبوطی سے تھام لے اور اس کے احکام کو پیش نظر رکھے تو اس کو اتنی قدرت حاصل ہوجائے گی کہ وہ اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کردے اور اس کو عظیم الشان غلبہ واقتدار حاصل ہوجائے، نیز اُسے تمام عالم اسلامی میں بلند وبالاتر درجہ نصیب ہوجائے اس لئے کہ دین اسلام کا رخ دیگر تمام ادیان ومذاہب کی طرح محض اخروی زندگی کی طرف نہیں ہے بلکہ اس کا دامن ایسے احکام ونظریات حیات سے مالامال ہے، جس میں بندوں کے لئے دنیوی فلاح وبہبود کا سامان بھی ہے اور دینوی واخروی سعادت وخوشحالی کے اسباب بھی مضمر ہیں، اسی کو شریعت کی اصطلاح میں سعادتِ دارین (دین ودنیا کی فلاح وبہبودی) کہتے ہیں۔

گذشتہ دور میں مسلمان آپس میں بھائی بھائی تھے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے جھنڈے تلے جمع تھے، انھوں نے علم وفن، فلسفہ وحکمت وطب اور ادبیات میں حیرت انگیز ترقی کی، جو اب تک نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ

ساری دنیا کے لئے سرمایۂ ناز و افتخار ہے، لہذا ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اسلامی قوت کی حفاظت کے لئے جد و جہد کرے، روئے زمین کے ان تمام ممالک کو دوبارہ خلافت اسلامیہ اور حکومت الہیّہ کی طرف لوٹا دیں، جو اس سے پیشتر اس کے زیر اقتدار رہ چکے ہیں، مسلمانوں کو کسی صورت سے بھی اپنے اجنبی حاکموں سے صلح کرنا جائز نہیں، تاوقتیکہ حکومت کو اپنے لئے مخصوص نہ کرلیں،

یہ حال تھا مسلمانوں کا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، لیکن مسلمانوں کے امراء و حکام کے اندر حرص و آز کے عناصر اور جاہ و منصب کے جذبات کے گھر جانے کی وجہ سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا اور ان کی جمعیت پریشان ہوگئی اور اسلامی جماعتیں حوادث روزگار کا نشانہ بن گئیں، کیوں کہ ان کے امراء خواہشات کی وادی میں بھٹکنے لگے، ان کی نظروں سے مجد و شرف کے مقاصد اوجھل ہو گئے اور انھوں نے خود فریب امارت کے القاب (اور سرکاری) خطابات کے آگے اپنا سر جھکا دیا،

ضعف و اضمحلال کے یہ آثار ملت اسلامیہ کے تعلقات در وابط میں اس وقت سے رونما ہونا شروع ہوئے جب کہ مرتبۂ خلافت سے علمی شان و منزلت کا تعلق منقطع ہوگیا اور خلفاء عباسیہ نے برائے نام خلافت پر قناعت کرلی، دین میں تفقہ و تفکر اور اجتہاد کے دروازے بند کر دئیے اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے روگردانی کرلی، اس طرح مذہبی نقطہ ہائے نظر میں زیادتی ہوگئی بہت سے مسلک و مذہب بن گئے اور تیسری صدی ہجری کے آغاز سے نزاع و اختلاف کے دھارے بہنے لگے، پھر وحدت خلافت پارہ پارہ ہوگئی اور وہ مختلف اجزاء و اقسام میں بٹ گئی،

چنانچہ ہم آج مسلمانوں کے امراء و حکام کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے

ہیں، کہ وہ اپنی حکومتوں کے اختیارات غیروں کے ہاتھوں میں سونپے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اپنے گھروں کے معاملات بھی انہی کے سپرد ہیں اور اپنے کندھوں پر غیروں کی محکومی و غلامی کے جوے کو اور مضبوط کرنے کی تائید کرتے ہیں،

ادھر فرنگیوں نے مسلمانوں کے ملکوں کو اپنی خواہشات اور حرص و آز کا نشانہ بنا رکھا ہے، وہ مسلمانوں کے باہمی دینی روابط و تعلقات کو درہم برہم کرنے کے لئے لگاتار جد و جہد کر رہے ہیں، تاکہ ان میں اختلاف و نزاع کی وسیع خلیج حائل کر دیں اور ان کی توانائیوں کو منتشر کر دیں، اسلامی حکومتیں جن اجنبیوں کی خدمات انجام دے رہی ہیں، وہ نہ تو بادشاہ کی جنس سے متعلق ہوتے ہیں اور نہ اس کے دین میں شامل ہوتے ہیں، بلکہ یہ روابط و تعلقات جنسی و نسلی ہیں، یہ لوگ امت اسلامیہ کی عظمت و سعادت کی پروا نہیں کرتے بلکہ اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے ان کو خاص فائدہ حاصل ہو جائے، امم اسلامی آج ایک دوسرے کی امداد سے غفلت برت رہی ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسروں کے حالات و واقعات سے ناواقف ہیں۔

علماء پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ دینی رابطہ و اسلامی تعلق کو پھر زندہ کریں اور آپس میں متحد و متفق ہو جائیں، جس کی طرف دین دعوت دیتا ہے ان کے اس اتحاد و اتفاق کے عہد و پیمان کا بہترین مظاہرہ ان کی مسجدوں اور ان کے مدرسوں میں انجام پذیر ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ ہر مسجد اور ہر مدرسہ وحدت و یگانگت کی زندگی کی روح کا مہبط و مظہر ہو جائے لیکن ان کے خیالات و اذہان میں اس وسیلہ کی شان و عظمت نہیں سماتی، حالانکہ یہی ایک قریب ترین وسیلہ ہے اتحاد و یگانگت کا کیونکہ ہر ملک کے علماء دوسرے ملک میں بسنے والے علماء کے حالات سے ناآشنا ہیں، نیز اس لئے کہ مسلمانوں کے امراء و

سلاطین علماء کو بگاڑنے کا سبب ہیں"

ان تمام بیماریوں کا علاج اخبارات و رسائل کی نشر و اشاعت سے ناممکن ہے، کیونکہ ان کا اثر و رسوخ بہت کمزور ہے اور نہ ان امراض سے یورپ کے مشہور طرز پر بیک وقت عام مدارس کے قیام سے نجات ہو سکتی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ مدارس اور ان کے وہ علوم جن کی تعلیم ان میں ہوتی ہے، اجنبی نفوذ و تسلط کو تقویت بہم پہنچانے کا ذریعہ ہوں نیز شفاء کی غرض و غایت یورپی تعلیم اور فرنگی عادات کی تقلید سے بھی میسر نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تقلید عوام کی روح کو فنا کرنے اور حکمراں قوموں کی اطاعت کا ایک کامیاب حربہ ہے

لہٰذا ان آفات و امراض کا کامیاب اور تیر بہدف علاج دینی احکام اور اسلامی قوانین کی طرف رجوع کرنے پر مبنی ہے، جیسا کہ ابتداء اسلام میں تھا اور خلفائے راشدین کے دور میں رائج تھا، جب مسلمان اپنے معاملات کو خود سنبھال لیں اور اپنے قدم اپنی فلاح و صلاح کے راستہ پر مضبوطی سے جما لیں اور اسلامی اصول کو اپنا نصب العین قرار دیں، تو وہ انسانی درجۂ کمال تک پہنچ جائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس مرتبۂ کمال سے نیچے نہ اتار سکے گی۔

مسلمانوں پر یہ امر واجب ہے، کہ وہ اپنے بھائی کی دستگیری کریں اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پیش نظر رکھے "انما المومنون اخوۃ" مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، مسلمان اتحاد و اتفاق کی ایسی مضبوط دیوار بن جائیں، جو ان پر ہر طرف سے امنڈنے والے سیلابوں کی روک تھام کر دیں"

آگے محمد عبدہ بیان کرتے ہیں کہ:

تیرا اس بیان سے یہ منشا نہیں کہ تمام امور و اختیارات کا مرف

ایک شخص مالک بن جائے، کیونکہ یہ بسا اوقات بہت دشوار ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کا حکمران و سلطان قرآن ہو، اور ان کی وحدت و یگانگت کا سرچشمہ دین اسلام، ہر حکمران طبعۃً حتی المکان اپنی کوشش دوسرے اسلامی ملک کی حفاظت کے لئے صرف کرے، کیوں کہ اس کی حیات و بقاء دوسرے کی حیات و بقا سے وابستہ ہے۔

جب کسی قوم پر کوئی خودمختار اور استبداد پسند حکمران ہو، قانون ہی اس کا ارادہ اور نظام ہی اس کی مشیت ہو، اپنے من مانے تصرف سے قوم کو آفات و مصائب میں گھیر رکھا ہو اور اس کو قعر مذلت میں گرا رکھا ہو، تو لوگوں کا فرض ہے کہ اپنے نفسوں کو اس کی حکومت سے آزاد کرالیں، تاکہ اس کا فساد تمام قوم میں سرایت نہ کر جائے"

ہمارے اوپر کے مجمل بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ جریدہ العروۃ الوثقیٰ کی روح، جو اس کے جدید پیرایۂ بیان اور اس کے انداز گفتگو میں جلوہ گر تھی جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں جا سکتا، محمد عبدہ کے ان آراء و نظریات کو عبور کر گئی، جنھیں آپ اپنی مصر کی سالقہ صحافتی زندگی میں دعوت دیتے تھے، اس لحاظ سے کوئی تعجب نہیں، کہ اسلامی ممالک کے استبداد پسند حکمران اور اس ملک کی حکومتوں کے مصلحت پسند عہدہ دار العروۃ الوثقیٰ کے جاری رہنے سے گھبرا جاتے اور اس کو بند کرنے کی کوشش کرتے،

بسا اوقات اس رسالہ کی تلخ نوائی اور اس کے تنوع مقاصد کا کچھ تو سبب وہ حالات و اسباب تھے، جو مصر میں آخری دور میں رونما ہوئے، اجنبی مداخلت کا اثر یہ ہوا کہ محمد عبدہ اور جمال الدین کو جلا وطن کردیا گیا، انھوں نے سمجھ لیا کہ مسلمان حکمران خود اس جلا وطنی کا طرف دار تھا

اور یہ اس کی مسرت کا موجب بھی ہوا

اس کے علاوہ اس واقعہ کا ایک اور جوہری سبب ہے، وہ یہ کہ محمد عبدہٗ اپنے سیاسی ہیجان انگیزی کے دوران میں جمال الدین کی زیر قیادت اور ان کی رہنمائی میں کام کیا کرتے تھے، جمال الدین نے انقلاب پسند طبعیت پائی تھی بخلاف اس کے محمد عبدہ بذات خود بہت ہی سکون پسند واقع تھے اور دوسرے ہی طریقہ سے اصلاح کا اعتقاد رکھتے تھے، اگرچہ یہ طریقہ ذرا دیر سے نتیجہ خیز تھا، وہ طریقہ اصلاح کا تھا اور تعلیم و تربیت کا،

درحقیقت آپ نے، جیسا کہ بلنٹ نے بیان کیا ہے، ایک مرتبہ اس بات پر اتفاق کر لیا کہ قتل و خون ریزی ظالم حکمران سے ملک کو نجات دلانے کا ایک ذریعہ ہے، لیکن آپ بھی اس وقت جمال الدین کے قوی نفوذ سے آپ کی مصر سے جلا وطنی کے بیشتر بے حد متاثر تھے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ العروۃ الوثقیٰ کی ناکامی اور جمال الدین سے آخری جدائی کے تقریباً دو سال بعد آپ کے برابر جامعۂ اسلامیہ کی طرف دعوت دیتے رہے، جس کے آثار کی ابتدا آپ اُن اصلاحی خطوط سے ہوتی ہے جنھیں آپ نے ایک کو آستانہ کے شیخ الاسلام کی طرف اور دوسرے کو حاکم بیروت کے پاس روانہ کیا،

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ "دولت عثمانیہ کی حفاظت و نگرانی، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد تیسرا عقیدہ ہے، کیونکہ یہی ایک واسطہ ہے، اسلامی سلطنت کی حفاظت کا اور کفیل ہے اسلامی بقا و اقتدار کا"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ ہم اسی عقیدہ پر قائم ہیں، اسی پر ہماری زندگی اور موت کا دارو مدار ہے"

یہ خیال نہایت غلط اور گمراہ کن ہے کہ خلافت اسلامیہ کا احترام بجز دینی جذبہ و رجحان کے کسی اور جذبہ پر مبنی ہو سکتا ہے، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ وہ وطن، قوم، ملکی فلاح و بہبود وغیرہ مشابہ ناموں پر ترقی کریگا تو وہ جادۂ مستقیم سے بھٹک گیا۔

آپ اجنبیوں سے بہت بدگمان تھے اور ان کے نفوذ و اثر کو زائل کرنے کے درپے تھے، اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے فرانس انگلستان، جرمنی اور امریکہ کو اجنبی شیطانوں سے تعبیر کیا ہے، جنھوں نے اسلامی ممالک میں اجنبی مدرسوں کو قائم کیا تاکہ وہ مسلمانوں کے عقائد کو منہدم کرنے کی کوشش کریں اور ان کے ارادوں کو اپنے محکوم ملکوں کی اطاعت کے لئے قائل کریں۔"

جب ہم محمد عبدہ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ان کی تحریروں کے عام نقطۂ نظر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ آپ حقیقی معنیٰ میں اُن مصلحین میں سے تھے، جو ہیجان انگیز اور انقلابی وسائل کی بہ نسبت ہر چیز سے پہلے اصلاح و تعلیم کے وسائل پر زیادہ تر بھروسہ رکھتے تھے جب ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ آپ عرابی تحریک کے آخری ادوار کے دوران میں انقلابی تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول کی قوت نے آپ کو ایسے وسائل قبول کرنے کی طرف جذب کر لیا، جو آپ کے مزاج کے لئے سازگار نہ تھے جیسا کہ جمال الدین کے ساتھ سیاسی ہیجان انگیزی میں آپ کا اشتراک عمل زیادہ تر سیاسی مقاصد و اعتبارات کی وجہ سے تھا، آپ اس کو بخوبی محسوس کرتے تھے کہ حقیقی نتائج تک پہنچنا اس امر پر مبنی ہے، جب کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ باوقار اور طمانیت بخش طریقہ اختیار کیا جائے۔"

محمد رشید رضا کہتے ہیں، کہ آپ کے اور آپ کے استاد کے لئے مصر میں توفیق پاشا کے ساتھ جو واقعات گزرے، انھوں نے آپ کی سیاسی اصلاح کی امیدوں کو کمزور کر دیا، آپ نے قومی اصلاح کے لئے تعلیم و تربیت کی طرف اپنی نظر التفات مرکوز کر دی[1]، چنانچہ جمال الدین نے یورپ میں تصریح کی، کہ آپ کی نظر میں سیاسی وسائل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ ہرگز بر آمد نہیں ہوتا، کیونکہ اصلاح یعنی عادلانہ اسلامی حکومت کی تاسیس صرف اجنبی رکاوٹوں کو دور کرنے پر موقوف نہیں بلکہ ان دونوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ افراد کی حسب منشا تربیت کی طرف ایک ایسے پرسکون اور دور دراز مقام میں توجہ کریں، جہاں سیاست کا کچھ اقتدار نہ ہو، پھر یہ تربیت یافتہ لوگ اپنے گھروں سے مختلف اقطار و ممالک کی طرف کوچ کریں تاکہ اپنی طرح اوروں کی بھی تربیت و اصلاح کریں، اس طرح ان دونوں کے لئے زمانۂ قریب میں کام کرنے والے اشخاص کی عظیم الشان قوت فراہم ہو جائے گی،

محمد عبدہ کا نظریہ تھا "افراد ہی ہر ناممکن شے کو ممکن بنا سکتے ہیں"

---

[1] المنار جلد ۸ صفحہ ۷ ۵۴۔ مشاہیر الشرق جلد ۱ صفحہ ۲۸۵ کا بیان ہے کہ جمال الدین اور محمد عبدہ کی ایک غرض و غایت وحدۃ اسلامیہ اور مسلمانوں کی اصلاح تھی، لیکن ان کے مابین ان وسائل کے بارے میں اختلاف تھا جو اس مقصد تک پہنچنے کے لئے استعمال کئے جائیں، جمال الدین کا نظریہ یہ تھا، کہ سیاسی وسائل ممالک اسلامیہ کو اسلامی حکومت کے زیر سایہ متحد کرنے کے کفیل ہیں، لیکن محمد عبدہ نے معلوم کر لیا تھا کہ سیاسی وسائل خاطر خواہ نتائج تک نہیں پہنچا سکتے، اسی لئے آپ نے ان مقاصد تک تعلیم و تربیت، دین کو خارجی اثرات سے پاک صاف کرنے اور امم اسلامیہ کو دنیا کی قوموں کے درمیان اپنا ارتقائی مقام حاصل کرنے کیلئے مستعد کرنے کے واسطہ سے پہنچنے کی جد و جہد کی، برخلاف اس کے جمال الدین اپنے نتائج کو فوراً ہی دیکھنے کے متمنی و طلبگار تھے۔

لیکن جمال الدین کو اس رائے سے انکار تھا آپ کا دعویٰ یہ تھا، کہ ابھی تو انھوں نے جدوجہد شروع کی ہے، اس کو جاری رکھنا ناگزیر ہے یا تو وہ اس کو پائے تکمیل تک پہنچا دیں گے یا ہار مان کر بیٹھ جائیں گے،

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عبدہ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جہاں فتنۂ عرابیہ کے دور کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس امر کی دعوت دیتے تھے کہ وہ اپنے ان فرائض و واجبات میں تمیز کریں جو حکومت کی طرف سے اپنے اوپر عائد ہوئے ہیں اور ان حقوق عدالت میں امتیاز کریں جو قوم کے لئے حکومت پر فرض ہیں" چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ

" بیشک میں اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے مصری قوم کو اُن حقوق سے واقف ہونے کی دعوت دی، جو اپنے حکمراں پر عائد ہوتے ہیں، ہم نے قوم کو اس عقیدہ کی دعوت دی کہ حکمراں کی اطاعت و فرمانبرداری اگرچہ واجب ہے لیکن وہ ان انسانوں میں سے ہے، جو غلطی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات میں بھٹکتے ہیں، نیز یہ کہ اس کو قوم کی نصیحت ہی اس کی غلطی سے باز رکھ سکتی اور اس کی سرکشی کو روک سکتی ہے۔"

آگے فرماتے ہیں کہ: "میں اپنے بعض اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معروف ہو گیا، باقی رہا حکومت اور رعایا کا معاملہ تو میں نے اس کو قضا و قدر کے حوالے اور دست قدرت کے سپرد کر دیا، کیونکہ مجھے معلوم ہوا، کہ یہ ایسا پھل ہے جس کو قومیں اپنے بوئے ہوئے درخت سے حاصل کرتی ہیں اور اس کی نشو و نما کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں، یہی وہ پودا ہے، جس کی طرف اب توجہ کرنا چاہیئے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں آپ نے جو تلخ تجربات حاصل

کئے' انھوں نے اس رائے کی تبدیلی پر بہت زبردست اثر ڈالا، بہرحال ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں، کہ جلاوطنی سے واپس لوٹنے کے بعد آپ پہلے سے زیادہ اجنبی طاقت سے صلح جو اور نظام حکومت کی طرف زیادہ مائل رہے، کیونکہ آپ بقول خود "اپنی آزادی کی پوری قدر وقوت کرتے تھے" پھر آپ مصطفیٰ فہمی پاشا کے، جو ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۸ء تک وزیراعظم رہا، مخلص دوست اور بہی خیر خواہ بن گئے نیز آپ لارڈ کرومر کے دوست تھے، یہ آپ پر بھروسہ رکھتا تھا۔

۱۸۸۵ء کے اوائل میں یعنی اندرونی ہیجان انگیزی کے دور کے خاتمہ کے بعد شیخ عبدہ بیروت کی طرف واپس ہو گئے اور جمال الدین کو تنہا کام کے لئے چھوڑ دیا جس کو وہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک انجام دیتے رہے، جب آپ بیروت واپس آئے، تو آپ کے دیرینہ رفیقوں نے آپ کا خیر مقدم کیا اور آپ کا گھر بہت جلد تمام مذہب وملت کے عالموں، طالب علموں اور دلدادگان معارف کا کعبہ وقبلہ بن گیا، منجملہ اور علوم کے آپ اپنے گھر میں سیرت النبی کا بھی درس دیا کرتے تھے، شہر کی دو مسجدوں میں تفسیر کا بھی درس دینے لگے، ہر مذہب وملت کے لوگ آپ کے گھر میں آنے لگے، آپ کے حلقۂ درس میں سُنی بھی تھے شیعہ بھی، یہودی بھی تھے، نصرانی بھی، چنانچہ آپ کو اپنے دینی آراء و معتقدات کی نشر واشاعت کا بہترین موقعہ دستیاب ہو گیا، آپ کا سینہ بلا تفریق مذہب وملت ہر قسم کے لوگوں کے لئے کشادہ تھا اس کے باوجود آپ وہی کہتے جس پر آپ کا عقیدہ و ایمان تھا، خواہ وہ دینی ہو یا علمی یا اجتماعی امور ومسائل سے متعلق ہو، چنانچہ اس طرز فکر سے آپ نے تمام کی قسمت اپنے ہاتھ میں کر لی اور اہل علم وفضل کو اپنے علمی تبحر، فہم و تدبر، ادب اور فصاحت و بلاغت سے مرعوب کر دیا۔

۱۸۹۵ء کے آخر میں آپ کو مدرسہ سلطانیہ میں تدریس کی دعوت دی گئی چنانچہ آپ نے اپنے دیگر تمام سابقہ مساعی کی طرح مدرسہ کی تنظیم کی، یہاں کے سررشتہ میں اصلاحات نافذ کیئے، نظام تعلیم کو معتدل کیا اور یہاں کے علوم میں توحید، فقہ، تاریخ اسلامی، منطق، معانی اور انشاء جیسے علوم کا اضافہ کیا،

آپ دن بھر درس و تدریس میں منہمک رہتے، آپ نے مدرسہ کے اخلاقی گوشوں کو بیدار کرنے کی طرف بہت توجہ کی، اس کے علاوہ آپ ادبی مشغلہ کے لئے تھوڑا بہت وقت نکال ہی لیتے، چنانچہ آپ نے جمال الدین کی کتاب "الرد علی الدھریین" کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، اپنے شاگردوں کے روبرو بلاغت اور ادب عربی میں جن دو مشہور کتابوں کی تشریح و تفسیر میں درس دیا تھا ان کو شائع کیا، پہلی کتاب نہج البلاغۃ ہے جو بلیغ عربی نثر کا بے نظیر نمونہ ہے دوسری کتاب مقامات بدیع الزماں ہمدانی ہے یہ بھی سجع کا اعلیٰ نمونہ ہے،

آپ نے علم توحید پر جو درس دیئے تھے وہ اس وقت شائع نہیں ہوئے تھے، لیکن یہ دروس رسالہ توحید کے لئے اساس قرار پائے جس کو آپ نے بعد میں شائع کیا، اسی طرح آپ نے اخبارات میں بیشمار مضامین نشر کئے۔

آپ اصلاحی تحریکات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے رہے، کسی لمحہ قرار سے نہ بیٹھے، آپ جس دائرہ میں کام کرتے تھے وہ آپ کی اصلاحی کوششوں کے لئے تنگ اور ناکافی تھا اس لئے آپ کو ایک وسیع میدان کی ضرورت تھی جب آپ نے شام وغیرہ سلطنت عثمانیہ کے دیگر خطوں کا سفر کیا، اکثر لوگوں سے تعلقات پیدا کئے اور بذات خود ان کے حالات سے آگاہ ہوئے تو ۱۸۸۷ء میں دو خطوط تحریر کئے جو آپ کی تحقیقات کا خلاصہ اور آپ

کے طرز فکر کا پتہ چلتا ہے، آپ نے ان دو خطوط میں اُن حالات کو پیش کیا ہے جنھیں آپ نے مشاہدہ کیا اور ان کا طریق علاج بیان کیا ہے۔

پہلا خط قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کی طرف دینی اصلاح و تعلیم کی تجویزوں کے بارے میں لکھ کر روانہ کیا، آپ نے ان تجاویز کو خلافت آل عثمان کی مضبوطی و استواری کے لئے ضروری قرار دیا، پھر یہ بیان کیا کہ سلطنت کے جس گوشہ پر بھی نظر دوڑائیے تو وہاں ایسے لوگوں کی کثرت ہے، جن کے پاس دین برائے نام باقی رہ گیا ہے، اسلامی روح کو انھوں نے اپنے قالب سے نکال پھینکا ہے اصول دین کے ساتھ ان کی جہالت اور اسلامی فرائض کے ساتھ ان کی غفلت و ناآشنائی نے ان کے اخلاق و عادات کو بگاڑ دیا، جس کی وجہ سے اجنبی شیاطین نے اکثر مسلمانوں کے دلوں میں داخل ہونے کا راستہ نکال لیا اور اپنے مدارس کے طرز فکر اور طریقۂ تعلیم سے مسلمانوں کے جذبات کو اپنے قابو میں کر لیا اور مسلمانوں کے مدارس سے ان کے دل برگشتہ کر دیئے، اس ضعف و اضمحلال کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں خالص دینی تعلیم کی درس گاہیں اور جامعات ناپید ہیں، اس کا علاج سوائے تعلیمی اصلاح کے اور کوئی نہیں ہو سکتا،

اس کے بعد آپ نے لوگوں کو باعتبار ان کے اعمال اور باعتبار ان کے علوم و معارف کے تین طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر گروہ کی ضروریات اور ان کے حالات کے پیش نظر ایک خاص قسم کی تعلیم کا مطالبہ کیا ہے، ان تمام مطالبات کو مجلس معارف (سررشتۂ تعلیمات) کے سامنے پیش کیا جس کو سلطان نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ترکیب دیا تھا۔

دوسرا خط شام کے طریقۂ اصلاح کے لئے ایک لائحہ عمل ہے۔ جس کو آپ نے والیٔ بیروت کے نام روانہ کیا، جس میں آپ نے اُن طبقات و مذاہب کے حالات کا نقشہ کھینچا، جو ممالک شام یعنی لبنان، بیروت اور شام کے باشندوں میں پائے جاتے ہیں، آپ نے دینی، تعلیم اور سیاسی رجحانات پر بحث کی، پھر آپ نے ان نقصانات کو بیان کیا، جو عنقریب اجنبی مدارس کی روز افزوں ترقی سے ظہور پذیر ہونے والے ہیں آپ نے صالح مدارس کے قیام اور دینی تعلیم پر زیادہ تر توجہ صرف کرنے کا مطالبہ کیا،

بیروت میں تقریباً ساڑھے تین سال قیام پذیر رہنے کے بعد بعض ارباب اقتدار کی سفارش سے جن میں سے لارڈ کرومر ہے خدیو توفیق باشا نے آپ کا قصور معاف کردیا، تو آپ ۱۸۸۸ء کے اواخر میں مصر واپس آئے، آپ بیروت میں اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسرا عقد کر چکے تھے۔

جب سے آپ نے مصر چھوڑا تھا، یورپ کے مختلف ممالک میں کوچ کرتے ہوئے چھ سال گزارے، یورپ کی تہذیب و تمدن کو غائر نظر سے دیکھا، وہ تمدن جس کو آپ نے پہلی مرتبہ یورپ کی جدید کتابوں میں پڑھا تھا، جس کو بذات خود بغیر کسی واسطہ کے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کی تمنا آپ کے دل میں کروٹیں لیتی رہتی تھی، نیز آپ نے بیشمار اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی اور مسلمانوں کی کمزوریوں کے اسباب کو معلوم کیا، آپ کے دل پر بعض ایسی صورتیں مرتسم ہوگئیں، جن کو بعد کے سنوں نے اور اجاگر کردیا، اس طرح آپ کو اس جلا وطنی اور عرصہ دراز تک اپنے وطن سے غائب رہنے کی وجہ سے جو آپ کے لئے پہلے ناپسند تھا، اصلاحی میدان میں جس کو آپ نے اپنے لئے اختیار کیا تھا، زبردست نفوذ اور عظیم الشان قوت و

طاقت کا سرمایہ حاصل ہو گیا۔

محمد رشید رضا فرماتے ہیں کہ "جلاوطنی ان تمام اشخاص کے لئے جو جلاوطن کئے گئے تھے ایک دردناک عذاب تھی، بجز امام محمد عبدہ کے، کیونکہ وہ آپ کے لئے رحمت و برکت ثابت ہوئی، آپ نے دوران جلاوطنی میں اپنے علم اور اپنی تربیت کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا، نیز یہ اکثر ممالک میں آپ کے علمی آراء و خیالات کی نشر و اشاعت کا موجب ہوئی۔"

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ یورپ کے وہ سفر جو پہلی مرتبہ آپ کی خلاف مرضی تھے، بعد میں بیش قیمت فائدہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ دوبارہ آپ نے یورپ کا سفر کیا، ہر مرتبہ آپ محسوس کرتے کہ آپ کو اپنی قوتوں کو از سر نو تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "جب کبھی میں یورپ جاتا ہوں تو ہر مرتبہ مجھے مسلمانوں کو بہتر سے بہتر حالت میں بدلنے کے لئے ایک نیا ہی خیال اور نئی امید پیدا ہوتی تھی"

باوجودیکہ یہ امیدیں اور آرزوئیں اپنے وطن واپس ہونے کے وقت کمزور ہو چکی تھیں، کیونکہ آپ بہت سی مشکلات برداشت کر چکے تھے اور دشوار گذار منزلوں سے گذر چکے تھے، نیز لوگ اپنے رسم و رواج کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اپنے من گھڑت اصولوں اور باطل عقائد اور اوہام کے علاوہ کسی اور چیز کی اصلاح ان کے لئے ذلت و توہین کا باعث تھی ——— لیکن آپ فرماتے ہیں

"باوجود اس کے جب میں یورپ دوبارہ واپس ہوا اور یہاں ایک یا دو ماہ مقیم رہا۔ میری وہی دیرینہ تمنائیں میرے دل میں بیدار ہو گئیں میں نے مشاہدہ کیا کہ جس مقصد تک پہنچنے کو میں محال اور دشوار سمجھتا

تھا، اب وہ میرے لئے آسان ہو گیا ہے"۔

اس طرح شیخ محمد عبدہ چند ایسے قوی موثرات سے متاثر تھے جو بیرونی ممالک کے طویل قیام کے دوران میں آپ کے ذہن و دماغ کے گوشوں میں مرتکز ہو چکے تھے اور ان ہی اثرات کو ساتھ لے کر آپ اپنے وطن لوٹے، تاکہ اپنے دین و وطن کی خدمت میں اپنی زندگی کا دور گزار دیں۔

چوتھا باب

آخری دور

(۱)

محمد عبدہ بحیثیت اجتماعی مصلح کے

۱۸۸۸ ـــــــــ ۱۹۰۵

جب محمد عبدہ اپنے وطن واپس آئے، تو مصریوں نے کھلے دل سے آپ کی تعظیم و تکریم کی۔ کیونکہ ان کی نگاہوں میں آپ ایک ایسے جلیل القدر شخص تھے، جنھوں نے بہت بڑا جہاد کیا، ان کی آزادی کے مطالبہ پر زیادہ توجہ صرف کی اور مسلمانوں کو بلند مقام پر پہنچانے کی کوشش کی، اس اعتماد کی وجہ سے آپ نے بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں میں تصرف کیا اور ان میں اپنا زبردست اثر چھوڑا، آپ ہمیشہ نشاط عمل کا نمونہ تھے، چنانچہ آپ نے گوناگوں اہم کاموں میں حصہ لیا۔

درحقیقت آپ نے ہمیشہ لوگوں کی رضامندی کو حاصل نہ کیا، کیوں آپ ایسے اصلاحات کی جدوجہد کرتے تھے، جن کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے بعض قوموں کی بڑی مصلحتوں کو اختیار کرنا ضروری تھا، اس کے باوجود آپ کے دشمن بھی درپردہ آپ کے بے لوث اغراض، پاکیزہ مقاصد اسلامی غیرت وحمیت اور آپ کے وطنی خدمات کے معترف تھے، آپ کی زندگی کے وہ چند سال، جنھیں آپ نے اپنی جلاوطنی سے واپسی کے بعد سے اپنی وفات تک بسر کئے تھے، اپنے سابقہ ادوار حیات کی بہ نسبت مصر کے لئے اور اسلامی گرانقدر کوششوں کے لئے نشاط آفریں تھے

غالباً اس دور کا سچا نقشہ وہ ہے، جو آپ کی وفات کے بعد کھینچا گیا ہے کہ

" مصر کا کوئی گرانقدر کام تکمیل نہ پاتا تا وقتیکہ اس میں پہلا ہاتھ آپ کا نہ ہو اور آپ کی پہلی کوشش نہ ہو۔"

ملکی عدالت میں آپ کی کارگزاری

خدیو توفیق باشا نے آپ کو معاف کرنے کے بعد ملکی ابتدائی دارالعدالتوں کا منصف (قاضی) مقرر کر دیا، آپ کی تمنا تھی کہ دارالعلوم میں تدریس کے عہدہ پر دوبارہ فائز ہو جائیں، کیونکہ آپ بخوبی محسوس کرتے تھے، کہ تعلیم ہی آپ کا وہ صحیح میدان ہے جس کا آپ نے تجربہ حاصل کیا تھا اور اس کی لذت سے خوب واقف تھے لیکن خدیو نے یہ عہدہ دینے سے انکار کر دیا، مبادا آپ کے سیاسی افکار و خیالات طلباء کے ذہنوں پر اثر انداز ہو جائیں۔

جب آپ نے دیکھا کہ آپ کی ان آرزوں کا پورا ہونا دشوار ہے تو آپ نے اس منصب کو قبول کر لیا، جو آپ کے لئے پیش کیا گیا تھا، چنانچہ آپ پہلے بنہا میں اس کے بعد زقازیق اور پھر قاہرہ میں منصف مقرر کئے گئے، دو سال بعد یعنی ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں قاہرہ کی عدالت خفیفہ میں بحیثیت مشیر کے منتخب کئے گئے۔

کرسئ قضا پر بیٹھنے کے بعد آپ نے فیصلوں میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کو ملحوظ خاطر رکھا، آپ ہر ممکن طریقہ سے مخالفین کی مشکلات کو حل کرنے اور ان کے مابین اصلاح و اتفاق پیدا کرانے کی کوشش کرتے تھے، اگر اس مقصد کے لئے قانون کوئی امداد کرتا تو اس کی آڑ لیتے ورنہ قانونی الفاظ کو نظر انداز کر دیتے اور احکام میں قانون اور اس کی روح کی تشریح کرتے، آپ شکل و

صورت کی رعایت پیش نظر نہیں رکھتے تھے، اس طریقۂ کار نے ان لوگوں کو آپ کے خلاف نکتہ چینی کرنے کے لئے آمادہ کردیا، جو قانون کی تقلید کرتے اور اس کے الفاظ کی لکیروں کو پیٹا کرتے تھے،

بہت سے ایسے فیصلے تھے، جن میں آپ نے جان بوجھ کر قانون کی مخالفت کی، مثلاً آپ نے اس شخص کو نظر بند کرنے کا حکم دیا، جس کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے جھوٹی گواہی دی[۲]۔

---

[۱] المنار جلد ۸ صفحہ ۴۶۸ و ۴۶۹ - تاریخ الاستاذ جلد ۳ صفحہ ۲۴۴، محمد رشید رضا آپ کو اپنے مجتہد قاضی سے موسوم کرتے ہیں نہ کہ مقلد سے، جو اصل سرچشموں کی طرف رجوع کرنے کے بعد جن میں اپنی رائے کا بھی امکان ہو، ایک مستقل نظریہ پر پہنچتا ہے، اور گذشتہ اماموں کے فیصلوں کا اتباع کرنا کافی نہیں سمجھتا، اہل سلف کے نزدیک اجتہاد نام ہے قرون اولیٰ کے ائمہ کبار کے مقام تک ٹھہر جانے کا، اسی لئے تیسری صدی ہجری سے اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا ــــــ محمد عبدہ اور آپ کے ہمنوا اپنے زمانے میں اجتہاد کے حق کا مطالبہ کرتے تھے، تاکہ اسلام اور خاص کر اس کا نظام قضائی عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق و ہم آہنگ ہو، چونکہ ملکی عدالت میں جس قانون کا اتباع کیا جاتا تھا، وہ باعتبار اپنی پاکیزگی و بساطت کے اسلامی قانون نہیں تھا اس لئے محمد رشید رضا کا مقصد اپنے اس قول سے محض یہ تھا کہ آپ کے اجتہاد کا عقیدہ صرف اس غرض سے تھا کہ موجودہ قانون کے درمیان تطبیق دیجائے، محمد عبدہ اسلامی شریعت کے مجتہد تھے آپ کی مستقل رائے تھی، اس بارے میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ قانون عدل یا انصاف کے لئے وضع کیا گیا ہے نہ کہ عدل قانون کے لئے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت قانون میں اس امر کی صراحت نہیں تھی کہ جھوٹے گواہ کو سزا دی جائے، حکومت نے امام محمد عبدہ کے فیصلہ کو تسلیم کرلیا اور اس کے بعد سے قانون میں تبدیلی کردی گئی تاکہ آپ کی رائے کے موافق عمل کیا جائے، دیکھو تاریخ الاستاذ جلد ۱ صفحہ ۱۴۴، مترجم

فیصلوں کو صادر کرنے اور مجرم و غیر مجرم کے درمیان تمیز کرنے کی فہم و فراست آپ کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، اس اعتبار سے آپ دیگر مشہور علماء کی بہ نسبت ممتاز تھے۔

ازہر میں آپ کے اصلاحات

اسی وقت سے ازہر کی اصلاح کے لئے آپ کا رجحان تیزی سے بڑھنے لگا، آپ کا یہ میلان بہت دیرینہ تھا، جو آپ کے دل میں طالب علمی کے زمانے سے موجزن تھا جب کہ آپ جمال الدین کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے تھے چونکہ ازہر مصر میں اور تمام عالم اسلامی میں علمی مرکز تھا، اس لئے آپ کا اعتقاد تھا کہ ازہر کی اصلاح پر تمام مسلمانوں کے حال کی اصلاح وابستہ ہے، آپ کی تمنا یہ تھی کہ اگر آپ کو اختیار دیا جاتا تو ادارہ کی اور تعلیم کی ازہر میں اصلاح کرتے، اس کے تعلیمی نظام کو وسیع کر دیتے تاکہ بعض جدید علوم بھی اس کے اندر پڑھائے جائیں اور ازہر کے اور دیگر یورپی یونیورسٹیوں کے درمیان قوی مشابہت پیدا کر دیں، اس سے بڑھ کر آپ کی خواہش یہ تھی کہ اگر آپ کا بس چلے تو اسلام کے لئے ایک نیا پریس قائم کریں اور اس کو بذات خود حدود ازہر کے اندرون چلائیں جو دینی علوم کا مہبط اور اسلامی معارف کا قوی مرکز ہے، اس وقت آپ اس بات کے مستحق ہوں گے کہ مصر میں بلکہ تمام عالم اسلامی میں اپنے پیش کردہ اصلاحات کی نشر و اشاعت کی امید رکھیں، کیونکہ ازہر کو تمام دنیا میں ایک خاص مقام اور وسیع شہرت حاصل ہے، یہی تمام مسلمانوں کی ہدایت کا منارہ اور علم و حکمت کا سرچشمہ ہو جائے گا، بہرحال آپ کا منتہائے نظر یہ تھا کہ ازہر کا دور جامد میں اپنے سابقہ حال ہی پر قائم رہنا محال ہے، آپ کا اعتقاد یہ تھا کہ یا تو اس کی تعمیر جدید کی جائے یا اس کی تخریب کو، جو ادھوری ہے مکمل کر دیا جائے،

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ آپ نے ازہر سے تعلق رکھنے کے زمانے ہی سے ازہر کی اصلاح کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی تھی، جب آپ اپنی جلاوطنی کا زمانہ بسر کرنے کے بعد واپس لوٹے، تو اس راہ میں اپنا جہاد از سرِ نو شروع کر دیا، شیخ محمد انبابی کو جو اس زمانے میں شیخ ازہر تھے، نظام تعلیم میں بعض جدید علوم کو بھی شریک کرنے کی طرف توجہ دلائی، آپ کے اصلاحی خیالات کی جو مخالفت کیجاتی تھی، اس سے آپ نے معلوم کر لیا کہ ازہر میں آپ کی اصلاحی کوششیں ہرگز بارآور نہیں ہو سکتیں، تاوقتیکہ بادشاہ وقت اس کی تائید میں پوری دلچسپی نہ لے، لیکن خدیوی توفیق پاشا نے اس کے لئے امداد بہم پہنچانے سے بخل برتا۔

جب توفیق پاشا کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا عباس حلمی دوم اس کا جانشین ہوا تو محمد عبدہ نے اس کے روبرو ازہر کی اصلاح کے لئے پیش قدمی کی، چنانچہ اس نے آپ کی موافقت میں ۷ رجب ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۸۹۵ء کو ایک تمہیدی قانون صادر کیا اور مذاہب چہارگانہ کے بڑے بڑے علماء و اساتذہ پر مشتمل ادارۂ ازہر کے لئے ایک مجلس کی تشکیل کی اور حکومت نے شیخ محمد عبدہ اور آپ کے دوست شیخ عبدالکریم سلمان کو اس مجلس کا نمائندہ قرار دیا اور ان دونوں کے انتخاب میں شیخ ازہر یا ازہر کی مجلس سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔

محمد عبدہ ابتدا میں انتظامی مجلس کی روح رواں تھے، باوجودیکہ آپ کو خدیوی سے امداد و تائید حاصل تھی اور آپ ایک حد تک حکومت کی نظر میں معزز تھے، لیکن آپ نے اس بات کو پسند کیا، کہ اساتذہ کی دلجوئی کے ساتھ ازہر میں اصلاح کو نافذ کیا جائے، چنانچہ آپ نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کی تنخواہوں میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ ازہر میں تعلیم دینے والے بہت کم ایسے اساتذہ ہیں، جنھیں ماہانہ سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے، بعضوں کی پندرہ روپیہ

ماہوار تنخواہ ہے اور بہت سے ایسے ہیں جنھیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا، ان کی گذر اوقات اس طرح ہے کہ طلبا ر انھیں کچھ دے دیا کرتے ہیں، یا وہ اپنے دوسرے کام سے گذارہ کرتے ہیں، محمد عبدہ نے اساتذہ کی تنخواہوں اور ان کے اقتصادی نظام کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کی تو حکومت کے خزانہ سے دو ہزار پونڈ ازہر کی امداد کے لئے مقرر کئے گئے، جو ایک معلوم انتظامی کمیٹی کے سپرد کئے گئے اس کے تصرف میں شیخ الازہر کی رائے اور میلان کو کچھ دخل نہ تھا جیسا کہ سابقہ رقم میں تصرف کا حال تھا، اس رقم کے ساتھ ساتھ حکومت نے مزید امداد کا وعدہ کیا بشرطیکہ اس رقم کو نفع بخش مصرف میں خرچ کیا جائے اور اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں، اس طرح آپ کو موقعہ مل گیا کہ علمار کو ان کے درجوں کے مطابق ماہانہ تنخواہ مقرر کیا ئے، تاکہ ہر استاد شیخ الجامعہ کی خوشامد یا اس کی خواہشات کا آلہ کار بنے بغیر باقاعدہ ماہانہ اپنی تنخواہ حاصل کرلیا کرے،

پھر آپ نے طلبار کی قیامگاہوں کی طرف توجہ کی، تو دیکھا کہ ان کے رہنے کے کمرے بہت کنجان ہیں، ان میں اصول حفظان صحت کا کچھ خیال نہیں رکھا گیا ہے، نیز آپ نے مشاہدہ کیا کہ یہاں کے طلبہ کو جو خوراک دی جاتی ہے وہ ان کے لئے ناکافی ہے، یہ خوراک ان کو قدیم رسم کے موافق مل رہی تھی، چنانچہ آپ نے اس میں اضافہ کی کوشش کی، روزانہ پانچ ہزار سے پندرہ ہزار روٹیاں ملنے لگیں پھر دیوان اوقاف میں زیادتی کی، جس کے حصول میں خدیوی نے امداد کی اوقاف خیریہ کی تنظیم کی، جو ازہر کے لئے مخصوص تھے، ان کی حالت تباہ و ناگفتہ بہ تھی، چنانچہ آپ نے ان کی آمدنی میں سالانہ چار ہزار پونڈ سے چودہ ہزار سات سو پچاس پونڈ اضافہ کردیا، اور انتظامی کمیٹی نے روزمرہ کی خوراک کو تقسیم کرنے کے لئے، جو بعض اساتذہ اور عہدہ داروں کی ثروت کا سرچشمہ اور باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں کا سبب

تھا ایک نظام مقرر کیا

علمار کی اولاد کے لئے جن کے آبار کی وفات کے بعد ان کی تنخواہیں ان کے نام پر بغیر کسی شرط وقید کے مقرر ہوجایا کرتی تھیں، اس کے استحقاق کے لئے ایک قانون بنایا اور یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ باقاعدہ علم حاصل کریں تاکہ ان کے آبار کے تدریسی فرائض انجام دیسکیں۔

پھر آپ نے طلبار کی رہائش کے لئے مکانات میں اضافہ کیا، مکانوں کے اسباب اور ساز و سامان کی تجدید کی اور ان کو حفظان صحت کے اصول کے مطابق بنایا، ان کے ٹھکانوں تک پانی کے پہنچانے کا انتظام کیا تاکہ طلبار آسانی کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کر سکیں، ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کے بجائے بجلی کے قمقموں کو روشن کیا، طلبار کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ایک طبیب کو مقرر کیا، پھر ازہر کے اندرون طلبار کو مفت دوائیں جاری کرنے کے لئے ایک عطار خانہ کھولا اور کچھ عرصہ کے بعد ایک ہسپتال قائم کر دیا،

اس طرح آپ نے انتظامی معاملات کی طرف اپنی توجہ پھیر دی، چنانچہ ادارۂ ازہر کے لئے اس کے قریبی ایک عمارت میں کتب خانوں کا انتظام کیا اور جدید انتظامی فرائض کو انجام دینے کے لئے شیخ جامعہ کی امداد کے واسطے چند منشیوں کو ملازم رکھا، اس سے پیشتر شیخ ازہر ہی اپنے گھر میں ادارہ کے انتظامات انجام دیا کرتا تھا جہاں مدرسین اور طلبار اپنے معاملات پیش کرنے کے لئے دوڑے دوڑے جاتے تھے حالانکہ دوسری طرف روزمرہ کے اکثر و بیشتر کاموں کو ایک ہی منشی انجام دیا کرتا تھا، جن میں وہ خود مختار تھا،

پھر آپ نے نظام تعلیم پر گہرا فکر و غور کیا، اکثر مدرسین کی تائید یران اصلاحات کو حاصل کرنے کے لئے جنھیں آپ نظام تعلیم میں نافذ کرنا مناسب سمجھتے

تھے، تقریباً تیس جلیل القدر عالموں پر مشتمل ایک مجلس کی تشکیل دی گئی، اس کے ذمہ عائد کر دیا گیا کہ وہ موجودہ علوم کی تحقیقات کرے، جو ازہر میں پڑھائے جاتے ہیں، نیز ان علوم کی طرف اشارہ کیا جائے جو اضافہ کئے جا سکتے ہیں، ان تمام مطالبات و تجاویز کو مجلس انتظامی کے سامنے پیش کرے، چنانچہ اس مجلس نے علوم مقاصد و علوم مسائل کو بیان کیا اور ان علوم پر حساب، جبر، تاریخ اسلام، انشاء، لغت، ادب، مبادی مندسہ، جغرافیہ وغیرہ علوم مسائل اضافہ کئے، اور طالب علم کو عالمی شہادت (ڈگری) حاصل کرنے کے لئے یہ لازم قرار دیا کہ وہ علوم مقاصد اور بعض علوم وسائل کے ساتھ ساتھ حساب اور جبر و مقابلہ کا امتحان دے، پھر قانون کو اس نصیحت پر ختم کیا گیا کہ طلبار کو چاہیے کہ پہلے چار سالوں میں کتابوں کی حواشی اور طویل تعلیقات کو پڑھنے سے باز رہیں اور آسان طریقہ سے دینی علوم کے جواہر کو پورے طور پر حاصل کریں، نیز ان کے لئے شرعی آداب اور اخلاق و محاسن سے آراستہ ہونے کو لازمی قرار دیا گیا۔

پھر مجلس انتظامی نے علماء سے رائے و مشورہ لینے کے بعد بعض تکمیلی قراردادیں پیش کیں، جن میں سے بعض طریق تعلیم اور مدرسین کی ذمہ داریوں سے متعلق تھیں اور بعض قواعد و ضوابط اساتذہ کے ساتھ طلبا کے اخلاق و آداب اور اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ سلوک و طرز عمل پر مشتمل تھے پھر تعلیمی اوقات اور مدت دراست کی حد بندی کی گئی، چنانچہ کام کے چار سے آٹھ ماہ کا اضافہ کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید قانون نے طلبار و اساتذہ کے اندر جوش عمل کی روح پھونک دی، پہلے تو امتحان کی طرف پیش قدمی کرنے والوں کی اوسط تعداد سالانہ تین تھی اور کسی سال بھی چھ کی تعداد سے کسی طرح متجاوز نہ ہوئی، لیکن جدید قانون کے بعد پچانوے سے زیادہ بڑھ گئی

جس میں ایک تہائی طلبہ کامیاب ہوئے بعض علماء کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ مبادا جدید علوم اکثر و بیشتر طلباء کو قدیم مروجہ علوم کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا کر دیں' اس اندیشہ کے ازالہ کے لئے شیخ محمد عبدہ نے ایک امتحان منعقد کیا' تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ قدیم و جدید علوم میں تعلیم پانے والے کامیاب طلباء کی تعداد اُن طالب علموں سے بڑھ چڑھ کر ہے' جو محض قدیم علوم میں تعلیم پانے کی وجہ سے پست ہمت اور ناکام ہو گئے۔

پھر آپ کو معلوم ہوا کہ کتب خانہ ازہر ابتر حالت میں ہے' اس سے لاپروائی برتی جا رہی ہے اور ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے' واقعی اس کے وجود کا شعور تک نہیں ہوتا تھا' اس کی کتابیں مختلف اوراق میں پراگندہ اور منتشر تھیں' بہت سی نایاب اور گرانقدر کتابیں اہل مغرب کے ہاتھوں تک پہنچ چکی تھیں' نفیس اور بیش بہا کتابوں کو کتب فروشوں کو کوڑیوں کے مول بیچ دیا گیا تھا' چنانچہ ان تمام کتابوں کو ان کے پوشیدہ مقامات سے نکال کر لایا گیا اور کتب خانہ میں رکھا گیا' پھر ان کی ترتیب و تنظیم کی گئی اور نایاب و نفیس کتابوں کی طرف خاص توجہ دی گئی پھر اُن کلیات (کالجوں) اور جامعات (یونیورسیٹیوں) میں کتب خانے قائم کئے گئے' جو جامع ازہر سے متعلق ہیں' مثلاً جامع احمد' جامع دسوقی کلیہ دمیاط اور کلیہ اسکندریہ' ان تمام میں ازہر کا قانون اور اسی کا نظام رائج کیا گیا' ان تمام میں بھی وہی اصلاحات رائج کئے گئے جو مرکزی جامعہ یعنی ازہر میں نافذ کئے گئے تھے' محمد عبدہ کے دل میں یہ تمنا موجزن تھی کہ ازہر کو تمام ممالک کی اصلاحی تحریک اور عقلی ارتقاء کا مرکز بنا دیا جائے۔

اس کے بعد ازہر میں اپنے عہدۂ تدریس پر فائز ہو گئے اور یہاں علم توحید' تفسیر قرآن' بلاغت اور منطق میں درس دیئے' یہاں اس امر کی طرف

اشارہ کردینا ضروری ہے کہ محمد عبدہ نے عربی زبان زندہ کرنے اور اس کے فصیح وبلیغ اسالیب بیان کو روبنما کرنے کے لئے کس قدر عظیم الشان جدوجہد کی ازہر اور دیگر درس گاہوں میں آپ نے اپنے خطبات، دروس اور بول چال میں ان کا عملی نمونہ پیش کیا نہ صرف اسی پر اکتفا کیا بلکہ دلوان اوقاف سے کوشش کرکے تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ مقرر کیا تاکہ وہ ایک ایسے عالم کے لئے خرچ کئے جائیں جو ازہریین فصیح عربی ادب کی تعلیم دے سکے۔

ہم نے مختصر طور پر محمد عبدہ کی اُن تمام مساعی جمیلہ کو بیان کردیا ہے جنھیں آپ نے ازہر کی اصلاح کے لئے صرف کیں کیونکہ ان سے آپ کے بہت سے اہم مقاصد وابستہ تھے نیز یہ مسلمانوں کی اصلاح کو انجام دینے کی امیدوں کا مرجع تھیں آپ نے اپنی زندگی کے آخری دس سال میں جو کوششیں صرف کی تھیں وہ ان ہی اغراض ومقاصد کی طرف لوٹتی ہیں، اس کے علاوہ یہ امر قابل افسوس ہے کہ آپ کو جس قدر کامیابی حاصل ہوئی وہ نہ تو آپ کے گراں قدر مقاصد کے مناسب تھی اور نہ آپ کی مخلصانہ جدوجہد اور والہانہ سرگرمی کے موزوں۔

درحقیقت آپ نے اپنی زندگی کے ایک حصہ میں کامیابی حاصل کی اور آپ کے مقاصد کا مادی پہلو تو ظاہر ہوگیا لیکن آپ کے ان مقاصد کے روحانی گوشے معرض خطر میں رہے، بہرحال ہم آپ کی شخصیت کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اُن بنیادوں کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی جن پر ہم مستقبل کی عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ تمام ازہریین یا ان کا اکثر وبیشتر گروہ ہر اصلاح کے مخالف تھا، بلکہ ان میں سے بہت سے افراد اصلاح کی ضرورت کو

محسوس کرتے تھے اور انھوں نے اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے استاد الامام کی اعانت کی اور جس وقت خدیوی سے آپ کو تائید حاصل ہو گئی تو انھوں نے آپ کی کوششوں اور سرگرمیوں میں اور بیبا کی پیدا کر دی، لیکن بدقسمتی سے خدیوی کے تیور آپ سے بدل گئے۔ آپ کے لئے تائید کے بجائے اس نے آپ کی اُن اصلاحی تحریکات کی سخت مخالفت شروع کر دی، جن کی تبلیغ آپ کیا کرتے تھے جب محمد عبدہ کو کامیابی کے آثار نہ دکھائی دیئے اور آپ ہر طرح مایوس ہو گئے تو ۹ ارمارچ ۱۹۰۵ء میں مجلس انتظامی سے مستعفی ہو گئے آپ کے ساتھ آپ کے دوست شیخ عبدالکریم سلمان اور ایک اور رکن شیخ سید احمد جنبلی نے بھی استعفا دے دیا، ازہر میں یہی آپ کا آخری زمانہ تھا کیونکہ چند ماہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور ازہر تھوڑے ہی دن ؐ اپنے اسی قدیم طرز اور مالوف سیرت و کردار کی طرف لوٹ گیا جس کو کوئی چیز بدلنے والی نہ تھی۔

منصب افتاء میں آپ کی کارگزاری

۳ رجون ۱۸۹۹ء میں خدیوی نے شیخ حسونہ نواوی کو مصر کے منصب افتاء سے معزول کرنے کے بعد محمد عبدہ کو ان کے بجائے فائز کیا، اس منصب کے اعتبار سے آپ پر تمام ممالک کے لئے شریعت کی حقیقی تفسیر و ترجمانی کے حق کو ادا کرنے کا بہت بڑا فریضہ عائد ہو گیا، آپ کے فتوے انتہائی اور آخری تھے، ان کو کوئی چیز توڑ نہیں سکتی تھی، آپ کے پیشتر جو لوگ منصب افتا پر کارگزار تھے، اُن میں سے اکثر کا گمان تھا کہ مفتی کا تقرر حکومت کی مصلحتوں کے لئے دینی مشیر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی تحریر اور اس کے فتویٰ کا موضوع و محور صرف ایسے مسائل تھے جو حکومت کی مصلحتوں پر حاوی و محیط ہوتے ہر وہ

مسئلہ جو افراد کی طرف سے انہی احکام کی پابندی کا مطالبہ کیا کرتا تھا اس کی کچھ پروا نہیں کی جاتی تھی۔

جب محمد عبدہ کو یہ منصب پیش کیا گیا تو آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ تنگ جولاں گاہ میں گردش کریں اور قومی خدمت کے لئے زیادہ مواقع دستیاب نہ ہوسکیں، حالانکہ آپ کو بخوبی علم تھا کہ منصب افتاء ان نہایت بلند اور عظیم المرتبت منصبوں میں سے ہے جو محض ایک اسلامی فقیہ و مجتہد ہی کو میسر آسکتا ہے، لیکن آپ نے اس منصب کو قبول کرلیا اور اس کو بلندی و عظمت کا لباس پہنا کر اپنے موافق بنالیا، جیسا کہ ہر اس خدمت میں آپ کا شیوہ رہا ہے، جو آپ کو عطا کی جاتی تھی، نیز آپ نے افراد کو فائدہ پہنچانے کیلئے فتویٰ کا دروازہ کھولدیا، اس طرح آپ نے اس منصب کی شان و عظمت اور اس کے نفوذ و اثر کو چار چاند لگادیے اور آخری دم تک منصب افتاء پر فائز رہے

آپ کے بیشمار فتوؤں کا تعلق ان امور و مسائل سے تھا، جو مصر میں مسلمانوں کے ان لوگوں سے میل جول اور ربط و تعلق کی بنا پر پیدا ہوگئے تھے، جو مسلمانوں کی جنس کے مخالف ان کے مذہب کے مضاد تھے، اسی طرح جدید تمدن کے حالات اور خصوصاً ان مسائل سے متعلق تھے، جو ایسے ماحول سے پیدا ہوگئے تھے جنھوں نے مصریوں کو اپنے مذہب کے مقابلہ میں قانون کا مطیع و منقاد بنادیا تھا

آپ کے تمام فتوؤں میں تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی روح کارفرما تھی اور اسلام کو جدید تمدن کی ضروریات کے ہم آہنگ بنانے کا قوی جذبہ موجزن تھا، لیکن اس آزادی فکر اور استقلال رائے نے رجعت پسندوں کو تلخناک مخالفت پر آمادہ کردیا۔

آپ کے دو فتوے بہت مشہور ہیں، ایک فتویٰ وہ تھا جس میں اہل کتاب

کے ذبیحوں کو مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا تھا تھا، دوسرا فتویٰ وہ تھا جس میں بنکوں میں روپیہ جمع کر کے اس سے فائدہ حاصل کرنے کو جائز ثابت کیا گیا تھا،

آپ کے فتووں نے عالمگیر شہرت اختیار کر لی اور یہ دور دور عالم اسلامی میں پہنچ گئے، سبھوں نے آپ کو اپنے زمانے کا زعیم و رہنما تسلیم کر لیا، مشرق و مغرب کے قریب و دور میں بسنے والے آپ کے پاس اپنے مسائل پیش کرتے اور آپ سے فتویٰ طلب کرنے لگے،

آپ کی یہ کوششیں نہ صرف فتووں کے صادر کرنے تک محدود رہیں بلکہ آپ نے شرعی عدالتوں کی تحقیق و تفتیش کی اور ان پر یہ لازم قرار دیا کہ وہ شخصی حالات میں شرعی احکام و قوانین کے مطابق فیصلہ صادر کریں آپ کے منصب افتاء کی خصوصیت یہ تھی، کہ آپ نے ان عدالتوں کی طرف خاص توجہ کی اور ان کی فروعی اصلاح پر زور دیا، حکومت نے ان کی تفتیش آپ کے سپرد کی اور آپ کو اس کے بارے میں کامل اختیارات عطا کئے، آپ نے اکناف و اطراف کے تمام شہروں کا معائنہ کیا، کوئی صوبہ اور مرکز ایسا نہ تھا، جہاں کی عدالتوں کا بہ نفس نفیس مشاہدہ و معائنہ نہ کیا ہو۔ ان کی کارگزاریوں پر دقیق بحث کی اور یہاں کے ملازموں کے حالات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، آپ نے دیکھا کہ ان شرعی عدالتوں میں بہت سے نقائص تھے، منصفوں اور دوسرے ملازموں میں بہت سی کمزوریاں تھیں، وہ صحیح قانونی طریقوں کو رائج کرنے سے عاجز تھے، ان کی تنخواہوں کی کمی عدالتوں کے دفاتر کی زبوں حالی اور ان کی عدم گنجائش کی وجہ سے عدالتی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ ان تمام حالات کی روئیداد آپ نے حکومت کے پاس لکھ کر بھیجی ان کے طریقہ علاج کی توضیح کی اور قاضیوں اور منصفوں کی تعلیمی اصلاح کی مناسب تجاویز بھی پیش کیں اور ان تمام کو وزارت عدالت کے سامنے پیش کیا، چنانچہ اس نے

ان میں غور و خوض کیا اور مناسب احکام و قوانین نافذ کرنے کی طرف توجہ کی، مجلس القوانین نے بھی شرعی عدالتوں کی اصلاح کا اہتمام کیا، اس کے مطالبہ کی بنا پر حکومت نے شیخ محمد عبدہ کی زیر صدارت دو مجلسوں کی تشکیل کی، پہلی مجلس ممتاز اور جلیل القدر منتخب عالموں پر مشتمل تھی، تاکہ قاضیوں کے عمل درآمد کے لئے لازمی شرعی احکام مرتب کرے، دوسری مجلس میں بڑے بڑے علماء اور بعض معززین شریک تھے تاکہ شرعی منصفوں کے مدرسہ کے قیام کے لئے ایک قانون وضع کریں، شیخ محمد عبدہ نے اپنی قرارداد اسکندریہ کی طرف سفر کرنے سے چند دن پیشتر حکومت کے سامنے پیش کی، جہاں آپ مرض الموت میں گرفتار ہوئے اور اسی میں وفات پالی۔

محمد عبدہ منصب افتار پر فائز ہونے کی وجہ سے ادارۂ اوقاف کی مجلس اعلیٰ کے رکن تھے آپ نے مسجدوں کے حال کی اصلاح اور یہاں کے خدمات کی شروط پر بحث کرنے کے لئے ایک مجلس کی تشکیل دی جس کے خود ایک رکن تھے آپ نے روئداد لکھی جس کے ضمن میں اصلاح کی تجاویز و مطالبات بھی تھے جن میں سے اہم یہ تھے کہ، آئمہ، خطیب اور مؤذن وغیرہ علماء ازہریین سے ہوں نیز امام کا فرض ہے کہ وہ جامع مسجد میں، جہاں وہ خدمت پر مامور ہے، نمازیوں اور دیگر عام لوگوں کو درس دے، مسجدوں کے فرائض انجام دینے والوں کے لئے معقول تنخواہیں دی جائیں یہ قرارداد آپ نے مجلس کے روبرو پیش کی، لیکن مجلس خدیوی کی مداخلت کی وجہ سے ان قراردادوں کے ایک حصہ ہی کو نافذ کرسکی،

مجلس شوریٰ القوانین میں آپکی کارگزاری

محمد عبدہ منصب افتاء پر مامور ہونے کے بعد ۵ رجون ۱۸۹۹ء میں مجلس شوریٰ القوانین میں ہمیشہ کے لئے رکن بنائے گئے، آپ اس کے ایک اجلاس میں حاضر ہوئے جو ۲۹ رجون کو منعقد ہوا تھا، مصر میں اس وقت نیابی حکومت کا نیا دور تھا اس مجلس کا غلبہ و اقتدار نہایت محدود تھا اسکی رائے صرف ایک مشیر کی حیثیت رکھتی تھی، اس کے عملدرآمد کرنے کے طریقے محض اتفاقی تھے، اس کے اور حکومت کے درمیان غلط فہمی تھی اور حکومت اس کے ضعف کی وجہ سے اس کو ناقابل اطمینان نظر سے دیکھتی تھی۔

محمد عبدہ نے مجلس کی جلیل القدر خدمات انجام دیں اور ثابت کر دکھایا کہ آپ ایک قادر و مستقل جمہوریت پسند اور ایک پرزور خطیب ہیں، اپنی رکنیت کی قابلیت کی دھاک بٹھادی، بالکل اسی طرح جیساکہ آپ ایک ماہر، منتظم اور بتجربہ کار اور امتیاز مشیر اور تمام معاملات میں وسیع تجربہ و نظر رکھنے والے کی حیثیت سے مسلم ہو چکے تھے، تھوڑا ہی عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ آپ مجلس کی روح رواں ہو گئے، آپ کی ہر بات قابل قبول اور آپ کی ہر رائے سزاوار احترام تھی، آپ اکثر مجلسوں کے صدر تھے، جنھیں حکومت مجلس کی کارگزاریوں کی تحقیقات سپرد کیا کرتی تھی اور ہر اس مجلس کے صدر تھے جس کو مجلس حکومت کے ساتھ ہر ایک کام کی مفاہمت کے لئے مقرر کیا کرتی تھی، حکومت اور مجلس کے مابین حسن تفاہم اور باہمی اعتماد کی وجہ سے مجلس کی رائے پر کاربند ہونے لگی اور اس کا اعتبار حکومت اور تمام شہروں کی نظر میں بڑھ گیا۔

محمد عبدہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنے زمانے کے بہت سے کام انجام

دیئے کیونکہ آپ کا عقیدہ تھا کہ آپ نیابی حکومت کی اصلاح کی اعانت کر رہے ہیں یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ قومی امور میں دلچسپی لی جائے اور عوام کے ذہن و فکر کی تربیت میں حصہ لیا جائے، یہاں تک کہ یہ جدوجہد ترقی کرتے ہوئے مجلس کے ارکان کا خاصہ بن جائے اور اس کے بعد آنے والی نسل میں یہی عناصر منتقل ہو جائیں آپ اس وقت بذات خود تمام امت کی تربیت کے لئے عمل کرتے تھے اور اس کو اپنے معاملات و امور میں غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔

جمعیۃ خیریۃ اسلامیہ میں آپکی خدمت گزاری

جب محمد عبدہ نے یورپ کے اکثر ممالک میں سیر و سیاحت کی، تو آپ یہ دیکھکر بہت متاثر ہوئے کہ یہاں رفاہ عام کی بہت سی انجمنیں ہیں، نیز آپ نے مشاہدہ کیا کہ لوگ بھلائی کے کاموں پر باہمی تعاون کرتے اور قومی خدمت انجام دینے میں حصہ لیا کرتے ہیں آپ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو بھی مسیحی اقوام کے قدم بقدم عمل کرنے کی ضرورت ہے، ادھر اسلام انفرادی نیکی و احسان کا حکم دیتا ہے اور فقراء و مساکین کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے، لیکن آج ممالک اسلامیہ کے کسی خطہ میں بھی محتاجوں کی امداد اور مسکینوں کی دستگیری کے لئے کسی منظم اجتماعی جدوجہد نے کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کی[۱] چنانچہ مسلمانوں

---

[۱] یہی مفہوم ہے محمد رشید رضا کے بیان کا جس کو آپ نے المنار جلد ۵ صفحہ ۴۹۰ میں پیش کیا ہے آپ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے لئے ایک چیز کی ضرورت ہے جو تمام سے اہم اور اسی پر ہر چیز کا دار و مدار ہے ...... وہ قومی خدمت اور مشترک اعمال کے لئے باہمی تعاون ہے، ہمیں کسی اسلامی خطہ میں ایسی کامیاب انجمن ہائے امداد باہمی کا وجود نظر نہیں آتا جن سے امید رکھی جا سکے کہ امت اسلامیہ کے لئے وہ موجب خیر ہوں، لیکن

کو رفاہ عام کے کاموں کی طرف رجوع کرنے، قومی خدمت پر تعاون کرنے اور مالداروں کے دلوں میں فقراء و مساکین کے ساتھ ہمدردی و غمخواری کرنے اور رحمدلی و نیکی کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے محمد عبدہ نے ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء میں جمعیۃ خیریۃ اسلامیہ کی تاسیس کی طرف دعوت دی، آپ خود بانیانِ انجمن میں ایک رکن کی حیثیت سے تھے، اس انجمن کی غرض و غایت ان مسلمانوں کی امداد و اعانت کے نام جو کسبِ معاش سے عاجز ہیں اور ان مفلس و نادار بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدارس کا قیام تھا، جو تعلیم کے اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے اپنے علاوہ دیگر بانیوں کے ساتھ نہایت دلچسپی لینی شروع کی اور ملک کے مالداروں، معززین اور سربرآوردہ اشخاص کو انجمن کی تائید، اس کی تنظیم، اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے اور اس کی مدافعانہ کوششوں کی طرف دعوت دینے میں گراں قدر جدوجہد مبذول کی، دورِ طفولیت ہی میں اس انجمن نے اپنے ظاہری اعمال کے ماوراء سیاسی مقاصد بھی مضمر رکھے، ۱۳۱۸ھ سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ انجمن کے صدر منتخب کئے گئے، پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی اور جدوجہد سے انجمن کی خدمت انجام دینے لگے اور اپنی وفات تک اس کے صدر رہے،

جمعیۃ احیاء کتب عربیہ میں آپکی کارگزاری

ہم نے اپنے گذشتہ بیان میں محمد عبدہ کی ان کوششوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کو آپ نے "وقائع مصریہ" کے مدیر اول کی حیثیت سے اور ازہر سے متعلق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷ کا) مسلمانان ہندوستان و مصر نے برطانوی آزادی کے زیر سایہ جن انجمنوں کا آغاز کیا ہے وہ اب تک گہوارۂ طفولیت میں ہیں،

ہونے کے زمانے میں عربی زبان کو زندہ کرنے اور اس کو اپنی اس بلند سطح پر پہنچانے کی راہ میں خرچ کیں، جو عربی دورِ ثقافت میں اپنے انتہائی اوجِ کمال تک پہنچ چکی تھی یہ جدوجہد نہ صرف آپ کی علمی جرأت آمیز جدت طرازی کا نتیجہ تھی، بلکہ آپ کا عقیدہ تھا کہ عربی زبان ہی مذہبی بنیاد اور دینی اساس ہے اور مسلمانوں کی زندگی ان کی زبان کے زندہ ہوئے بغیر محال ہے، لہٰذا زبان کی اصلاح کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ یہی دینی اصلاح کا وسیلہ ہے،

آپ اپنی ایک تقریر میں، جو تیونس میں عالموں اور فاضلوں کے ایک بڑے مجمع میں کی تھی، فرماتے ہیں:

"ہماری زبان کی اصلاح ہی ہمارے عقائد و خیالات کی اصلاح کے لیے واحد وسیلہ ہے، اپنی زبان سے مسلمانوں کی کوتاہی و جہالت ہی نے اپنی دینی کتابوں کے مطالب و معانی سمجھنے اور اپنے اسلاف کے اقوال و عبارات میں غور و خوض کرنے سے باز رکھا، عربی فصیح زبان میں علم و ادب کے وہ ذخیرے اور فلسفہ و حکمت کے وہ خزانے ہیں جہاں تک پہنچنا بغیر زبان پر قابو پائے اور اس میں مہارت حاصل کئے دشوار ہے"۔

اس کے علاوہ آپ کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ زبانِ عربی کا احیا، ان جیسی کتابوں سے محال ہے جو ازہر میں پڑھائی جاتی ہیں، بلکہ اصلاح کے لئے ناگزیر ہے کہ اس دور کے جلیل القدر علما اور عظیم المرتبت ائمہ کی کتابوں کو زندہ کیا جائے جو امت میں علم و ادب کا "زندہ دور" کہلایا جاتا ہے، چنانچہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے آپ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنی زیرِ صدارت ایک انجمن کی تاسیس کی جس کا نام "جمعیۃ احیاء العلوم العربیہ" رکھا گیا اس انجمن نے دو گرانقدر کتابیں (اسرار البلاغۃ و دلائل الاعجاز

مصنفہ عبدالقاہر جرجانی متوفی ۱۰۷۸ء) طبع کیں، ان کتابوں کے شیخ محمد عبدہ نے بیرون ملک سے قلمی نسخے حاصل کئے تھے۔ پھر شیخ محمد شنقیطی کی اعانت سے لغت کی ایک کتاب (کتاب المخصص مصنفہ ابن سیدہ لغوی اندلسی ۱۰۰۷ - ۱۰۶۶ء) سترہ جلدوں میں طبع کی گئی، کتاب موطأ امام مالک کو بھی طبع کرنا شروع کیا گیا، اس کے قلمی نسخے تیونس، فاس وغیرہ ملکوں سے حاصل کئے گئے تھے۔

وہ لوگ بھی آپ کی حوصلہ افزائی کرنے لگے، جو ادبی ارتقاء و احیاء میں حصہ لیا کرتے تھے، خواہ ان کی یہ دلچسپی تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے ہو یا اجنبی زبانوں کو نقل و ترجمہ کرنے سے۔

اسلام کیلئے آپ کی دفاعی جدوجہد

محمد عبدہ جمال الدین کے نقش قدم پر چلے اور اسلامی دفاع میں آپ کے طریقہ پر ہی کاربند رہے، حسب اقتضائے حال مخالفین اسلام کے حملوں کا رد کیا ان حملوں کی تردید کے لئے آپ کو بہت سے مواقع حاصل ہوئے جن میں سے دو مشہور ہیں، ایک موسیو جبرئیل ہالوتو وزیر خارجہ فرانس کی تردید ہے دوسری تردید فرح انطون مجلہ جامعہ کے مدیر کے متعلق ہے، آپ نے ان دونوں مخالفین اسلام کا زبردست اور مسکت رد لکھا ہے، جس کی وجہ سے آپ نے عالم اسلامی میں ہر جہتی شہرت حاصل کی اور سب کی نظر میں آپ اسلامی دفاع میں دسترس مناظر ثابت ہوئے،

اوائل سنہ ۱۹۰۰ء میں جریدہ جرنل دی پاری نے موسیو ہالوتو کا ایک مضمون "مسئلہ اسلامیہ اور اسلام کا مقابلہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مضمون کو اخبار "المؤید" نے نقل کیا، موسیو ہالوتو کے اس مضمون کی اولین غرض و غایت یہ ہے کہ

فرانسیسی حکومت اور فرانسیسی قوم کو اس امر کے ثابت کرنے کی تحریک دی جائے، کہ فرانسیسی نوآبادیات میں اسلامی جماعتوں اور مسیحی اقوام کے مابین بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں نیز اس نے طویل بحث و نظر کے بعد اپنی حکومت کو ایسی ٹھوس سیاسی آزادی دینے پر ترغیب دی ہے، جو عالم اسلامی کے ساتھ تعلقات کے بنیادی اصول پر مشتمل ہو اس نے دونوں مذہب یا بالفاظ دیگر دونوں تمدن مسیحیت و اسلامیت کے مابین امتیازات و حدود کو قائم کرنے کا قصد کیا ہے، ان میں سے ایک آریہ اصل سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا سامیہ نسب و خاندان سے، ہانوتو نے دو دینی بنیادی مسائل میں دونوں مذاہب کی رائے کو پیش کر کے بحث کی ہے ایک ذات الٰہی ہے اور دوسرا مسئلہ جبر و اختیار (قضا و قدر) مسیحیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ عقیدۂ تثلیث یا بالفاظ دیگر انسانی خدا اور اس کے معبود حقیقی کے ساتھ روح القدس کے ذریعہ اتصال تعلق کی وجہ سے وہ انسان کے مرتبہ کو بلند مقام تک پہنچاتے ہیں۔ اس عقیدہ کو وہ ذات الٰہی سے حقیقی قرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی عقیدہ توحید کے باب میں یہ ہے کہ اللہ کو بشریت کی صفات سے اس حد تک منزّہ و مقدس کیا جائے کہ خدا اور انسان کے درمیان نسبت منقطع ہو جائے اس طرح نظریہ ہے کہ انسان کو پست و کمزور قرار دیا جائے۔

اسی طرح مسیحی عقیدہ نے، جو انسان کی آزادی اور اس کی خود مختاری کا معترف ہے انسان کو میدانِ عمل میں گامزن ہونے پر آمادہ کر دیا اور اس کو تنازع للبقاکی وسیع جولان گاہوں میں گردش کرنے پر برانگیختہ کر دیا، بخلاف اس کے مسلمانوں کو ان کے قضا و قدر کے اعتقاد نے ایسے قانون کے سامنے اندھا دھند سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا، جو تغیر و تبدل سے ناآشنا ہے"۔

محمد عبدہ نے جریدۂ "المویّد" میں اس مضمون کو پڑھا اور اسی وقت اس کی

تردید لکھ کر رسالہ مذکور کو بھیج دی، اس مضمون میں آپ نے مسیو ہانو تو کی تاریخی معلومات پر سخت تنقید کی، پھر یہ ثابت کیا کہ یورپ والوں کے پاس جو تمدن پہنچا وہ محض اُن اولین مہاجرین کے ذریعہ آیا جنھوں نے آریائی مشرقی ممالک سے یورپ کی طرف کوچ کیا، اہل یونان نے، جن کو مسیو ہانو تو نے یورپ کے معلمین کا نام دیا ہے سامی قوموں کے میل جول سے اپنے تمدن و تہذیب کی خوشہ چینی کی ہے حالانکہ اسوقت یورپ خونریزیوں، جنگ و جدل اور قتل و غارتگری کے سوائے تہذیب و تمدن کے نام سے نا آشنا تھا، اسلام نے سرزمین یورپ میں علم و حکمت کی روشنی پھیلائی، اس کو ایران، مصر، روم اور یونان کے علوم و فنون کے خزانے ہاتھ آئے تھے اس نے ان تمام کو ان لوثوں اور کثافتوں سے پاک و صاف کیا جن کو منزلی قوموں کے رؤسا و سلاطین کے ہاتھوں نے تہ بہ تہ کر رکھا تھا،

پھر شیخ عبدہ نے یہ ثابت کیا کہ قومیں ایک دوسرے سے اپنی ضروریات زندگی کے مطابق تمدن و تہذیب کو لے لیا کرتی تھیں، چنانچہ آریائی مغرب نے سامی مشرق سے اس سے کہیں زیادہ حاصل کیا، جتنا کہ آج مضمحل و غلام مشرق آزاد و مستقل مغرب سے حاصل کر رہا ہے، اس لحاظ سے مدنیت کا مطلب، جس کو مسیو ہانو تو مراد لے رہے ہیں، سوائے مذہب کے اور کچھ باقی نہیں رہتا اسی مقام سے محمد عبدہ یہ بیان کرتے ہیں، کہ توحید الٰہی کو پیش کرنے والا دین سامی دین نہیں بلکہ وہ محض عبرانی دین ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے جانشین فرزندوں نے روشناس کرایا تھا، لیکن عرب کلیتہً، اور آرامی وغیرہ سامی النسل باشندے بت پرست تھے،

تضاد قدر میں بحث و نظر کسی خاص ملت کے ساتھ مخصوص نہیں، خود مسیحی قوموں کے درمیان جبر و اختیار کے بارے میں بیشمار اختلافات پائے جاتے

ہیں، شیخ عبدہ نے اپنے اس بیان کی شہادت میں تومیین کا مذہب پیش کیا ہے جو قدلیس توما اور دومینکین کے پیرو ہیں، یہ لوگ اپنے آپ کو جبریہ (یعنی انسان کو مجبور ماننے والے) کہتے ہیں، بخلاف اس کے دیلولا "جزویت" کے پیروکار قدریہ اختیاریہ (انسان کو قادر و مختار تسلیم کرنے والے) ہیں جبریہ عقیدہ سامی الاصل مذہب کا نہیں، جیسا کہ مسیو ہانوتو کا دعویٰ ہے، بلکہ اس مسلک کے اصول کی پیداوار اور اس کے فروع کا نشو و نما سوائے آریوں کے درمیان کے اور کہیں نہیں ہوا، قرآن مجید نے جبریہ عقیدہ رکھنے والوں کی رائے کی نکتہ چینی کی ہے اور ان کے اس قول کی "ولوشاء اللہ ما اشرکنا ولا آباؤنا ولا حرمنا من شئی" یعنی اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز سے محروم ہوتے" اس طرح تردید کی ہے: کذلک کذب الذین من قبلہم حتی ذاقوا بأسنا قل ہل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون" اسی طرح ان سے پیشتر کے لوگوں نے جھٹلایا، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا ذائقہ چکھ لیا، اے پیغمبر ان سے کہدے کیا تمھارے پاس علم ہے اگر ہے تو اس کو ہمارے سامنے ظاہر کریں، وہ تو محض گمان کا اتباع کرتے ہیں، اگرچہ تم محض اٹکل پر نشانہ لگاتے ہو" قرآن مجید نے تقریباً چالیس آیتوں میں کسب و اختیار کو ثابت کیا ہے، ابتداء اسلام میں آنحضور اکرمؐ اور صحابہ نے اپنے اقوال و اعمال میں جو روش اختیار کی وہ ہمارے اس دعویٰ پر برہان ہے، وہ لوگ اسلام کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت میں سعی پیہم کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے جو آثار و نقوش چھوڑے ہیں، وہ آج ہانوتو اور ان کے رفقاء کار کے لئے موجب رنج و الم ہیں،

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں "لیکن مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ماننو

نے مسلمانوں کو نام نہاد اور گمراہ کن صوفیاء و مشائخ کے ہاتھوں مصائب میں مبتلا کر دیا، اس طرح مسلمانوں کے درمیان کسلمندی اور کوتاہی عمل عام ہوگئی ...... اس قسم کے صوفیاء بھی آریوں کی برکات کی پیداوار ہیں کیونکہ یہ ہمارے پاس ایران و ہندوستان سے پہنچے۔

پھر محمد عبدہ نے دوسرے نقطۂ نظر یعنی توحید الٰہی کے خالص عقیدہ پر بحث کی ہے اور تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں سادہ لوح افریقی قوموں اور پیروان بدھ مت اور برہمنوں کے تصور توحید اور فلاسفۂ یونان اور مصری قدیم کاہنوں کے نظریۂ الہ کے مابین موازنہ کیا ہے اور ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ اپنے تمدن کے انتہائی اوج کے عالم میں توحید کے اس بلند مقام تک پہنچ گئے تھے، جہاں تک عقل انسانی رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ بخلاف اس کے پیروان مسیح اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ عقیدۂ تثلیث میں عقل کیلئے کوئی گنجائش نہیں، حالانکہ مسیحی مبلغین بت پرستوں کو خدائے واحد کی دعوت دیتے رہتے تھے اور شہنشاہ قسطنطین کے زمانے تک خدا کی تنزیہ اور توحید ان کی دعوت و تبلیغ کے لئے مرکز و محور تھی، ان کے درمیان صرف مابعد صدیوں میں آثار تشبیہ ظہور پذیر ہوئے اور تشبیہ میں حد درجہ غلو برتا گیا اور فساد اور بگاڑ نصرانی قوموں میں عام ہوگیا، یہاں تک کہ اس میں اصلاح کی ضرورت دامنگیر ہوئی۔

جب شیخ محمد عبدہ کا مضمون شائع ہوا تو "الاہرام" نے اس زعم کے ساتھ مسیو ہالونو کی طرف سے مدافعت کی کوشش کی کہ اس کے مضمون کے ترجمہ میں تحریف و تبدیلی واقع ہوگئی ہے، پھر مسیو جبرئیل ہالونو "الاہرام" میں لکھے ہوئے مضمون سے مطلع ہوا تو جریدۂ جرنل میں ایک اور مضمون "اسلام پر بھی ایک نظر" کے عنوان سے لکھا، جس کا ترجمہ جریدہ "المؤید" نے ۱۲ مئی ۱۹۰۰ء کی اشاعت میں شائع

کیا، اس میں ہالنوتو نے بیان کیا ہے کہ اس کا منشاء اسلام پر حملہ کرنے یا اس کے اندر نکتہ چینی کرنے کا نہیں بلکہ وہ اسلام کو عظمت و احترام، اعتدال و مصالحت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد مدیر الاہرام کو پیرس جانے کا اتفاق ہوا اس نے میسو ہالنوتو سے اس موضوع پر گفتگو کی، اور اس کو اپنے اخبار مورخہ ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۰۰ء میں نشر کیا، جس میں اس نے ہالنوتو کے اس بیان کی تردید کی کہ اس نے اسلام کی نکتہ چینی کا قصد کیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ ہالنوتو اس کے باوجود اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مشرق عدل و انصاف، آزادی اور تمدن میں یورپ کی حکومتوں کے طرز پر چل رہا ہے وہ اس کا بھی معتقد نہیں کہ اسلام جو دینی سلطنت اور تمدنی غلبہ و اقتدار کو جمع کرنے کا دعویٰ دار ہے وہ مشرق کے سیاسی مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکتا یورپ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اس نے اپنی بھلائی اور ترقی کے لئے کس طرح دونوں کی حدود کو جدا کر دیا،

محمد عبدہ نے اس گفتگو کا جواب تین مضمونوں میں دیا ہے جس کو "المؤید" نے نشر کیا، آپ نے مسلمانوں کو مسیو ہالنوتو کی گفتگو اور اس کے خیالات سے عبرت حاصل کرنے کی طرف دعوت دی ہے، جس نے ان کی کمزوریوں کے اسباب کی طرف ان کی رہنمائی کی، تاکہ وہ اپنے آپ کو یورپ سے آگے بڑھنے کے لئے تیار کرلیں نیز آپ نے جامعۂ اسلامیہ کے اُن اغراض و مقاصد کو بیان کیا، جس کی طرف ہالنوتو نے اشارہ کیا ہے، آپ نے یہ ظاہر کیا کہ یہ دینی اغراض ہیں نہ کہ سیاسی، ان سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف دعوت دینا مقصود ہے کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح محض ایک وسیلہ سے کر سکتے ہیں اور وہ دینی اصلاح ہے آپ نے علی الاعلان مسلمانوں کی ان کمزوریوں اور خامیوں کا اعتراف کیا جن کی اصلاح کی امید صرف اسی تحریک کو زندہ کرنے

سے ہو سکتی ہے، آپ نے یہ ثابت کیا کہ اگر گذشتہ امراء وسلاطین نے آپنے آپ کو دینی امیر و خلیفہ شمار کیا ہوتا تو کھلم کھلا مظالم کے ارتکاب سے دین کی مخالفت پر کبھی کمر بستہ نہ ہو سکتے، ہر گز دہ قرضوں کی بھاری رقم اپنی گردن پر نہ لیتے اور اُن بیجا اخراجات میں مبالغہ نہ کرتے، جنھوں نے اسلامی ممالک کو تباہی و بربادی میں ڈھکیل دیا اور ان کی متاع کونین سے گرانقدر اور عزیز چیز یعنی آزادی و استقلال کو فنا کر دیا۔

اسلامی دفاع میں آپ کا دوسرا مضمون مجلہ جامعہ عثمانیہ کے مسیحی مدیر کے مضمون کی تردید میں ہے، جس میں اس نے مشہور اندلسی مسلمان فیلسوف ابن رشد کے فلسفہ سے بحث کی ہے، اس میں اس نے فلسفہ و حکمت کے سلسلہ میں اسلامی اور مسیحی رواداری کا موازنہ کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ مسیحیت نے علماء و فلاسفہ کی کھلے دل سے خدمت کی اور ان کو بہت کم ایذائیں پہنچائیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام میں دینی و تمدنی غلبہ و اقتدار کو ہم آہنگ کرنے کے سبب سے مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام میں رواداری نہایت دشوار ہو گئی، مقالہ نگار نے مسیحیت کی وسعت نظر اور کشادہ قلبی پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ یورپ میں مسیحی ایذا رسانی کے باوجود عملی طور پر علم و حکمت کو فتح حاصل ہوئی اس وجہ سے علم و حکمت کی تخم ریزی نشو و نما پاتی رہی اور جدید تمدن کے بار آور درخت کی شکل میں نمودار ہو گئی، لیکن آج تک اسلامی تنگ نظری اور مذہبی احتساب پر غلبہ نہ پایا جا سکا، آگے مقالہ نگار نے بیان کیا ہے کہ مسلمان علماء ثانوی علل و اسباب کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں نیز یہ کہ ابن رشد درحقیقت زندیق تھا۔

شیخ عبدہ نے اپنی تردید میں چاروں مسائل پر بحث کی ہے جن پر فرح انطون کا مضمون مشتمل ہے، پہلے مسئلہ میں آپ نے کہا ہے کہ مسلمانوں نے

دیگر اہل مذاہب کے مقابلہ میں اپنے ہی فلاسفہ و حکماء کے لئے اپنے سینے کھول دیئے تھے۔

آپ نے اس کی تردید میں ثابت کیا کہ مسلمانوں نے دوسرے ادیانِ والوں اور مختلف نسلوں اور قوموں کے لئے بھی اپنا سینہ کشادہ کر دیا تھا اس کی تائید و شہادت میں آپ نے اُن غیر مسلم مورخین و فلاسفہ کے ناموں کی فہرست پیش کی، جنھوں نے اسلام کے زیر سایہ زندگی بسر کی،

زرح انطون نے دوسرا نقطۂ نظر یہ پیش کیا ہے کہ اسلامی فرقوں نے محض اپنے دینی معتقدات اور مذہبی تصورات کی خاطر ایک دوسرے سے جنگ کی امام نے اس کی تردید کی،

تیسرے مسئلہ میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی طبیعت علم و حکمت کے مقابلہ میں اپنی رواداری کو برداشت نہیں کر سکتی بخلاف اس کے مسیحیت پورے جوش و نشاط کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتی ہے، امام کی نظر میں یہ مسئلہ مضمون کے سب مسائل میں حد درجہ اہم معلوم ہوا، چنانچہ آپ نے اس پر تفصیل سے بحث کی اور اس کا مدلل رد کیا اور مزاجِ مسیحیت کو ظاہر کرنے والے تمام اصول کو پیش کیا اور ان کو فرداً فرداً اسلامی اصول و مبادی سے موازنہ کیا اور دونوں کے امتیازات و حدود کو واضح کیا اور ان میں سے ہر ایک کے اغراض و مقاصد اور رجحانات کو آشکار کیا۔

چوتھے مسئلہ میں اس نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ مسیحی رواداری کا طفیل ہے کہ اہل یورپ جدید تمدن سے خوشہ چینی کر رہے ہیں، استاد الامام نے تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے کہ کس طرح مسیحیت نے نہ صرف اپنے علماء و مفکرین کی ایذا رسانی پر اکتفا کیا بلکہ دوسرے تمام ادیان و ملل کے عالموں اور فلاسفہ کے ساتھ بھی اپنی تنگ نظری اور استبداد پسندی کا ثبوت دیا نیز آپ نے ظاہر کیا کہ کس طرح اسلام نے علم و حکمت [illegible]

کی، جو ان کے دین میں شریک تھے یا ان کے مخالف تھے۔ سرپرستی کی، اس کے بعد آپ نے ان اسباب کی تفتیش و جستجو کی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو عصر حاضر میں جمود و تعطل کے درجہ تک پہنچا دیا، اور ان کو پستی و زوال کے تاریک غاروں میں ڈھکیل دیا، آپ نے اپنا دفاعی مضمون اس مسئلہ کی تردید پر ختم کیا ہے، جس کو مقالہ نگار نے چھیڑا تھا، اس سلسلہ میں آپ نے فلسفۂ ابن رشد اور اس کے مادہ و وجود کی رائے پر بحث کی ہے اور متکلمین و فلاسفہ کے آراء کو پیش کیا ہے۔

ناتمام آرزوئیں

ازہر کی مجلس ادارت (انتظامی کمیٹی) سے محمد عبدہ کی سبکدوشی آپ کی اکثر تحریکات کی ناکامی کا سبب ہوئی، آپ نے اس زمانے کے شیخ ازہر شیخ علی ببلاوی کے مشورہ کے موافق تاریخ اسلامی کی تعلیم دی اور اسلامی تاریخ میں جدید پیمانہ پر ایک عالمانہ کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن جب آپ نے ازہر سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تو اس کام سے بھی اپنی توجہ پھیر لی۔

جب آپ نے اپنے اندر ازہر میں مخالفت کے سیلاب کو روکنے کی قدرت نہ پائی تو یقین کر لیا کہ اپنی امیدوں کی تکمیل ایسے اشخاص کی تعلیم کا مرکز بنا دیا جائے جو اسلام کو زندہ کرنے اور مسلمانوں کی اصلاح کرنے کا حق ادا کریں، آپ کے مقدر میں ہیں، اس وقت آپ نے اس مقصد کے لئے ایک جدید درس گاہ کی تشکیل کا ارادہ کیا، جس کی اپنی حسب منشا تنظیم کریں ایک جاگیردار نے یونیورسٹی کی تعمیر کے لئے زمین کا ایک حصہ بھی وقف کر دیا۔ آپ نے اس کی تشکیل کے لازمی امور اور ضروری اسباب کی تیاری شروع کر دی

لیکن آپ کی موت کی وجہ سے یہ درس گاہ اپنے تشکیلی خاکہ ہی کی حد تک رہ
موت کے اچانک آنے کی وجہ سے آپ نے اپنی تفسیر قرآن بھی ادھوری
دی، آپ نے ایک جماعت کی شرکت میں قاہرہ میں ایک ایسا روزانہ عربی جریدہ نکالنے
کے لئے سوچ رکھا تھا، جو صحافت کا اعلیٰ نمونہ ہو، اس کے مدیروں اور مضمون نگاروں
کا دقتِ نظر سے انتخاب کیا جائے، اس کی تمام تر نظر التفات قومی اصلاح اور صحیح و
درست اخباروں کو بیان کرنے پر تھی نیز اس کا اہتمام سیاسی معاملات و امور میں
ایک محدود و تنگ دائرہ میں ہو یہ تمام تصورات و خیالات امام کی موت کی وجہ سے
دفن ہو کر رہ گئے،

نیز آپ کا ارادہ تھا کہ ہندوستان، ایران اور روس کے ممالک کی سیاحت
کیجائے تاکہ مشرق میں مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیں جس طرح اس سے پہلے آپ
نے یورپ کے مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کیا تھا، آپ کا منشاء اس سیر و سیاحت
سے تمام مسلمانوں کے لئے تعلیم و تربیت کے امور سے روشناس ہونا تھا اور یہ معلوم کرنا تھا
کہ کس ملک میں کون سے طریق کار مفید ہو سکتے ہیں جو اوروں کے لئے ناموزوں ہیں۔

مرض اور وفات

محمد عبدہ جس زمانے میں اسکندریہ میں اپنے دوست محمد بک راسم کے گھر میں مقیم تھے
اپنے آخری مرض میں گرفتار ہو گئے، اتفاق سے اسی رات آپ کو یورپ کا سفر درپیش تھا
آپ کا یہ مرض طول پکڑ گیا، مگر آپ کی وفات سے چند ہفتے بیشتر یہ مرض سادہ اور
بسیط معلوم ہوتا تھا، اس سے بیشتر سوڈان کی طرف کوچ کرنے کے دوران میں ازہر
میں پیش شدہ حوادث سے پہلے جنہوں نے آپ کو سبکدوش ہونے پر آمادہ کر دیا تھا
آپ کا یہ مرض خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا، آپ علاج کی غرض سے یورپ کا سفر

کرنے والے تھے اور پھر مراکش کا ارادہ رکھتے تھے، مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سفر کرنا آپ کے لئے تقریباً ناممکن امر ہے، مرض کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء مطابق ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ کو سہ شنبہ کی شام کے پانچ بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔

دوسرے دن صبح میں آپ کا جنازہ ایک جم غفیر کے ساتھ ریلوے اسٹیشن لایا گیا. جہاں آپ کی نعش کو ایک خاص ٹرین میں جس کا حکومت نے انتظام کیا تھا قاہرہ کو منتقل کیا گیا اور دوران راہ میں بڑے بڑے شہروں پر ٹرین ٹھری

آپ کا جنازہ اسکندریہ کی بہ نسبت قاہرہ میں ہیبت وجلال کے مظاہر کو پیش کر رہا تھا، جنازہ کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے عہدہ دار اور سیاسی قائدین تھے، فوج اور پولیس، جلیل القدر علماء اور روحانی رؤسا اور بیشمار فوجی افسر، ملک کے سربرآوردہ لوگ اور ازہر کے طلباء اور تمام ملل و مذاہب کے بہت سے لوگ گروہ در گروہ جنازہ کے ساتھ شریک تھے، آپ کی نعش جامعہ ازہر میں منتقل کی گئی، جہاں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ازہر میں آپ کی نعش پر مرثیے نہیں پڑھے گئے اور نہ آپ کا ماتم کیا گیا جیسا کہ علماء کبار کی وفات کے وقت رسم جاری تھی جس کو بذات خود شیخ محمد عبدہ نے باطل قرار دیا تھا، نماز جنازہ کے بعد جنازہ مسجد سے قرافہ کی طرف لایا گیا، جہاں آپ کو سپرد خاک کیا گیا، حسن پاشا عاصم نے لوگوں کو بغیر ماتم و مرثیہ کے خاموشی کے ساتھ لوٹ جانے کی دعوت دی، پھر حسب عادت چالیس دن کے بعد محفل تعزیت منعقد کی گئی اس دن لوگ مقبرہ میں زیادہ تعداد میں آئے چھ مقررین نے تقریریں کیں، جو مرحوم کے اُن دوستوں میں سے تھے جو آپ کے مقاصد و تحریکات سے خوب واقف تھے انھوں نے آپ کی سیرت اور آپ کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی، نیز آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں اور تحریکات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔

(۲)
محمد عبدہ کے اوصاف و اخلاق

شیخ محمد عبدہ کی وفات کے بعد وہ قلم نرم پڑ گئے جو آپ کی نکتہ چینی اور تنقید میں سخت ہو گئے تھے، وہ زبردست حلے اور ریشہ دوانیاں سست و ماند پڑ گئیں جنھوں نے آپ کی شخصیت و کردار اور بالخصوص آپ کی زندگی کے آخری دو سالوں کی سرگرم تحریکات کی طرف اپنا رخ پھیر دیا تھا، تمام ممالک نے محسوس کیا کہ آپ کی وفات سے خود کو اور تمام مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، چنانچہ سبھوں نے نظری نزاعات اور دینی اختلافات کو فراموش کر دیا اور کیا مسلمان اور کیا یہود و نصاریٰ ان تمام نے مشترک طور پر ایسی ہستی کی قدر دانی کی، جس کو اب انھوں نے سلیم کیا تھا کہ آپ ایک بہت بڑے وطن پرست، بے پناہ مقرر، جری زعیم و قائد اور وسیع النظر مصلح تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عبدہ اکثر و بیشتر صفاتِ قیادت سے ممتاز تھے، بیان کیا گیا ہے کہ آپ قوی البنیان، معتدل الجسم، چہرلیش، تیز نظر اور بلند آواز تھے، بہت جلد منفعل اور متاثر ہو جانے والے اور بے روک ٹوک بولنے والے مقرر تھے جب بولنے لگتے تو سننے والوں کو مبہوت و ششدر کر دیتے، برجستہ گوئی میں درجۂ کمال حاصل تھا، تحریر و تقریر اور خط و کتابت میں فصیح عربی زبان کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، شیریں زبان بلاغت نگار ادیب تھے آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا، فہم و ذکا اور عقل و دانش میں شاید ہی کوئی آپ کا ہمسر رہا ہو، کام کے دھنی، پے در پے جد و جہد کرنے سے نہیں تھکتے تھے، اپنی عملی تاب و توانائی اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے مختلف میدانوں میں اپنے جواہر ریزوں کو روشناس کیا۔

آپ کے علمی درک وکمال اور معلومات وتحقیقات نے آپ کو اپنے زمانے کے مسلمان علماء کے مابین ایک اونچے مقام تک پہنچا دیا تھا' آپ کی شہرت تمام عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھی' آپ کو تمام اسلامی علوم مثلاً فلسفہ' علم توحید تفسیر قرآن' فقہ اور حدیث میں مہارت وبصیرت حاصل تھی آپ نے عربی ادب میں حد کمال تک رسائی حاصل کر لی تھی' آپ کو اپنے ادبی اسالیب بیان کو گوناگوں طریقوں سے استعمال کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا جس کو آپ نے تعلیم میں عملی طریقہ سے ظاہر کیا اور گراں قدر ادبی کتابوں کی نشر واشاعت میں روبہ عمل لانے کی سعی کی'

تاریخ اسلامی سے آپ کو گہرا شغف تھا' آپ نے نہ صرف تاریخ ابن خلدون کے درس اور اس کی تعلیق پہ اکتفا کیا' بلکہ مقدمہ ابن خلدون کو اپنے رسالہ توحید کے لئے اسلامی عہد بعہد کے انقلاب و تغیر کا ایک تاریخی بیان قرار دیا' جس میں آپ نے نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ اسلام کے تاریخی احکام کی صداقت وواقعیت کو ظاہر کیا ہے جس کی مثال آپ سے پیشتر علماء اسلام میں ناپید ہے'

اس کے علاوہ آپ نے فلسفہ پر جو مضامین لکھے ہیں' وہ پروفیسر ہورتن کے بیان کے مطابق' اس امر پر دلالت کرتے ہیں' کہ آپ نہ تو ابن سینا تھے اور نہ مرعوب دل ودماغ فلاسفہ کی طرح تھے' اس کے باوجود ہم کو ہورتن کا یہ بیان تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شیخ عبدہ نے اسلامی تعلیمی فلسفہ کی بجائے ایک نیا فلسفہ پیش کرنے کی کوشش کی اور علم توحید کو فکر ونظر کے ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جو جدید طریقہ تفکر کے مطابق ہے یہ تمام چیزیں آپ کے ماحول سے کسی طرح میل نہیں کھاتی تھیں۔

شیخ عبدہ مغربی علماء ومفکرین کی تصنیفات سے بھی باخبر تھے' آپ نے ان کا عربی ترجمہ کے ذریعہ سے مطالعہ کیا چالیس سال کی عمر کے بعد فرانسیسی زبان سیکھی تاکہ اس قسم کی جدید کتابوں کی اصل زبان کے ذریعہ سے مطالعہ کیا جائے۔ بعد میں آپ بلا روک ٹوک پڑھنے لگے تھے۔

اجتماع، اخلاق، تاریخ، فلسفہ اور فن تعلیم و تربیت پر علماء نے جو کتابیں لکھی تھیں ان کو خاص توجہ سے پڑھتے تھے۔ انگریز فلسفی ہربرٹ اسپنسر نے آپ کے دل میں گھر کر لیا، چنانچہ آپ نے انگلستان میں اس سے ملاقات کی اور اس کی کتاب تعلیم و تربیت کو اصل فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا، تاکہ مصری مدارس کی اصلاحی تجاویز و تحریکات میں اس کے آراء و نظریات سے استفادہ کیا جائے، آپ کو طالسطائی کے ادبی خیالات و رجحانات سے بھی گہرا شغف تھا، آپ نے اس جلیل القدر روسی کے نام جب کہ کلیسائے روسی نے اس کو محروم کر دیا تھا، ایک خط روانہ کیا،

یورپ کے آخری سفر میں آپ نے دولت عبریہ اور تاریخ عرب و اسلام کے مابین تعلقات و روابط کی بنا پر خطِ مسند سیکھا۔

آپ کے ہر آشنا کے دل میں آپ کی عظیم الشان شخصیت گھر کر گئی تھی، آپ کے چہرہ سے رعب و جلال اور آپ کی نشست و برخاست میں وقار و طمانیت کے آثار ہویدا تھے، بڑے لوگوں کی خوشامد اور لجاجت سے بہت بالاتر تھے، یہاں تک کہ آپ پر کبر و انانیت کا الزام دھرا گیا، لیکن درحقیقت آپ لطافت پسند اور تواضع پرست تھے، جیسا کہ آپ کے ان خطوط سے اس کا اظہار ہوتا ہے جو اپنے دوستوں اور شاگردوں کو آداب و اصول کے بارے میں تحریر کئے آپ حد درجہ روادار واقع ہوئے تھے آپ سے زیادتی کرنے والوں کو درگذر اور برائی سے پیش آنے والوں کو معاف کر دیتے تھے، اپنے دوستوں کے ساتھ حسن ظن کا یہ عالم تھا کہ آپ گاہے ان کے خلوص نیت کے اندازہ میں غلطی کر جاتے تھے، فقیروں اور محتاجوں پر جو دوستی کی وجہ سے آپ ابو البؤساء سے ضرب المثل ہو چکے تھے آپ کا گھر عین دوپہر کے وقت حاجتمندوں اور اہل غرض سے ہمیشہ بھرا رہتا،

ازہر کے نادار و غریب طلباء پر آپ بے حد مہربان تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر

طالب علموں کے لئے آپ کے خصوصی دفتر سے ماہانہ وظائف دیئے جاتے تھے، اپنی رائے کے اظہار میں راستبازی اور تصریح سے کام لیتے تھے، حتی المکان اپنے احکام میں عدل و انصاف کو پیش نظر رکھتے، کوئی عملی اقدام نہ کرتے تاوقتیکہ اس کو عقل و تدبر استقلال و بصیرت کی کسوٹی پر نہ جانچ لیتے، مگر جب اپنے کسی صحیح اور درست فیصلے پر پہنچ جاتے تو اس سے کسی طرح نہیں ٹل سکتے تھے۔

فکر و عمل میں آپ کا استقلال بہت مشہور تھا، اس کے باوجود آپ دوسروں سے مشورہ اور امداد لیا کرتے تھے، اس کے علاوہ ایک خاص صفت، جس کو آپ کے معاصرین حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے اور جو آپ کی عظمت کی اہم ترین صفت میں سے ہے، وہ آپ کی روحانی و ادبی شجاعت ہے، ایک عربی اخبار نے آپ کی تعزیت میں کہا ہے: "مرحوم مشرقی ممالک میں، جو خوف، دہشت، بزدلی اور استبداد کی سرزمین ہے، قوی دل آزاد ضمیر اور جری و بہادر ہستی تھے، اپنی رائے کو بیانگ دہل ظاہر کرتے اور اس پر ثابت قدم رہتے، آپ نہ کسی حاکم سے خوفزدہ ہوتے اور نہ کسی بڑی طاقت سے مرعوب، آپ کو اس استقلال رائے، جرأت فکر، بیباکی و بہادری کی وجہ سے بہت سی مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

آپ کے اسلامی جذبۂ خلوص نے آپ کے اندر فکر و عمل کی عجیب و غریب قوت و طاقت بھر دی تھی، اسلام کا رنگ آپ کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا، آپ کو اس امر کا زبردست دعویٰ تھا کہ اسلام عصر حاضر کے مطالب و ضروریات کے لئے اسوقت تک ہم آہنگ نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کا طریقہ عالمگیر اصلاح کو شامل نہ ہو، اس کے اندر ایک ایسی اصلاح درکار ہے جو واقعی میں اسلام کی نشأۃ جدیدۃ تک پہنچا دے یہ اصلاح آپ کے نظریہ میں اسلام کی پہلی صورت کی طرف رجوع کرنے میں تھی آپ کے اس بیباک تصور کی کوئی انتہا نہ تھی، یہاں تک کہ آپ کا ایک بیان نقل

کیا گیا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ "میں سوائے موت کے کسی اور چیز سے نہیں ڈرتا"۔

آپ کے اکثر ساتھی آپ سے اشارۃً کہا کرتے تھے کہ آپ مشقت ریز اسباب سے باز رہیں اور ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں جنھیں آپ سنبھالے ہوئے ہیں اور قومی اصلاح کی تکمیل کے لئے خدمت انجام دے رہے ہیں، نیز یہ کہ آپ محکمہ عدالتِ خفیفہ میں رجوع ہو جائیں جہاں آپ کو بہت بڑی تنخواہ ملتی ہے اور کام بھی بہت کم کرنا پڑے گا، اس طرح آپ اوروں کی طرح فارغ البال زندگی بسر کر سکیں گے، لیکن آپ نے اپنے دوستوں کی نصیحت کی طرف کان دھرنے سے انکار کر دیا آپ کے ایک دوست کہتے ہیں کہ "میں جیسا کہ شیخ عبدہ کو جانتا ہوں آپ کے لئے محال تھا کہ اوروں کی طرح تن آسانی کی زندگی بسر کریں"۔

ممالک اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے حالات سے باخبر ہونے کی وجہ سے آپ رات بھر جاگا کرتے اور عالم اسلامی کی اصلاح کے وسائل پر فکر و خوض کیا کرتے تھے۔ عام طور سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کا دل حب وطن کے جذبات سے سرشار تھا، خاص طور یہ جذبہ مصر جیسے اسلامی ملک کے لئے موجزن تھا، تاکہ یہاں وطنی خلوص کے بجائے اسلامی وقار و عظمت کا علم لہرائے۔

آپ اپنی تمام کوششوں میں حسن انجام کی قوی توقع رکھتے تھے، اپنی ناکامیوں اور مشکلات میں آپ کی یہی امید غالب رہا کرتی تھی، قاسم امین لکھتے ہیں:

"آپ کو اپنی امت کی اصلاح میں جو آرزو تھی، اس کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی تھی، آپ کو پختہ یقین تھا کہ ہماری شاداب و زرخیز سرزمین میں جب صالح اور پاک تخم بویا جائے گا، تو وہ نشو و نما پائیگا

بار آور ہوگا، بالکل اسی طرح جیسا کہ اس میں فساد کی تخم ریزی نے نشو ونما پائی اور ناخوشگوار پھل پھول لائے، اسی لئے آپ اپنے دونوں بھرپور ہاتھوں سے صالح افکار، نیک جذبات و خیالات اور مفید تعلیمات کا وہ تمام ذخیرہ لٹاتے رہے جن کو آپ نے اپنی زندگی میں جمع کر رکھا تھا۔"

محمد عبدہ نے دیکھا کہ باشندگانِ مصر اپنے ان اصلاحات اور تحریکات کے موقف میں جن کو آپ بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں، دو گروہ میں منقسم ہیں، پہلا رجعت پسندوں کا گروہ ہے، جن میں ازہرین اور ان کے مددگار شامل ہیں، یہ ہر انقلابی تحریک کی سخت مخالفت کرتے تھے کیونکہ وہ اپنے شاندار اور باعظمت ماضی کو، جس کا سرمایہ ان کے پاس پہنچا ہے، مقدس نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے وہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل گوارا نہیں کرتے تھے،

دوسرا گروہ احرار یا طبقۂ مجددین کا تھا، اس کے کارکن زیادہ تر وہ اشخاص تھے جنھوں نے جدید تعلیم حاصل کی تھی وہ اس قدیم سرمایہ کا احترام نہیں کر سکتے تھے جو حریتِ فکر اور آزاد خیالی کو مقید کرتا ہے اور ترقی کو محال قرار دیتا ہے۔

لیکن محمد عبدہ قدیم و جدید کے مابین ہمزۂ وصل تھے، آپ دونوں فریقوں کے پیش رو و قائد تھے، آپ ایک ایسا نشانِ رہ منزل تھے، جس کی رہنمائی میں رجعت پسندوں کا وہ گروہ ہدایت پا رہا تھا، جو آپ کو اسلامی مبلغ اور مخالفین اسلام کی مدافعت کرنے والے شمار کرتا تھا۔

اگرچہ وہ آپ کے تجدیدی رجحانات و جذبات سے رضامند نہ تھا ادھر مجددوں کا طبقہ بھی آپ کو ایک ایسا زعیم و مفکر سمجھتا تھا جس کے بنیادی خیالات و تعلیمات سے عہد جدید کی صبح نمودار ہونے کی امید کی جاتی ہے۔

بہر حال رجعت پسندوں کے گروہ میں سارے افراد نیک نیت اور مخلص نہ تھے ان میں بعض وہ اہم ارباب اقتدار تھے، جنھیں آپ کی سرگرمیوں اور بنیادی تحریکات میں ایسی چیزیں نظر آتی تھیں، جو ان کے مرکز کے لئے نقصان رساں تھیں یا ان کو بعض مشکلات میں مبتلا کر دینے کا موجب تھیں۔ بعض افراد تو موجودہ حالت کو باقی رکھتے ہوئے کسی شکل و صورت سے مستفید ہونا چاہتے تھے اور چند دیگر ایسے غرضمند اصحاب تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ آپ کی پارٹی میں شریک ہو جائیں، تو اپنے اغراض تک نہ پہنچ سکیں گے۔

باقی رہے وہ لوگ جو اسلامی ممالک کو ایک ایسی سیاسی وحدت میں، جو ایک مسلمان امیر کے زیر اقتدار ہو، منظم کرنے کے آرزومند تھے تو ان کو عوام کے مابین جدید تمدن و تہذیب کے رائج ہو جانے اور غیر اسلامی قوموں کے ساتھ روابط و تعلقات کے بڑھ جانے سے خوف دامنگیر تھا کیونکہ ایسا کرنے میں، ان کی ہوسناک تجاویز کو خطرہ لاحق ہو جائے گا لیکن اکثریت، جس نے آپ کے آراء و افکار اور بیشتر کارگزاریوں کی مخالفت کی، رجعت پسندوں کی تھی، خواہ یہ مخالفت جان بوجھ کر تھی یا بے جانے بوجھے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر کام کے لئے شرعی راستہ یہ ہے کہ اسلاف کی دینی روایات پر اعتماد رکھا جائے۔

یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ "یہ کیسا شخص ہے، جو فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتا ہے، انگریزوں کے ملکوں میں سیر و سیاحت کرتا، ان کی تصنیفات کو عربی میں ڈھالتا ان کے فلاسفہ و حکماء کے اقوال کو نقل کرتا، ان کے علماء سے بحث و مباحثہ کرتا ایسے فتوے دیتا ہے جو متقدمین میں سے کسی نے نہیں دیئے، رفاہ عام کی انجمنوں میں شریک ہوتا اور ناداروں اور غریبوں کے لئے مال جمع کرتا ہے؟"

ان افواہوں اور صریح بہتانوں نے عوام کو دھوکے میں مبتلا کر دیا اور ان کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع نہ دیا، وہ ان حقیقی مقاصد کو سمجھنے سے قاصر رہے جن کی دعوت آپ

دیتے رہے وہ اپنے قائدین کے پیچھے اپنے رواج کے مطابق چلنے لگے یہاں تک کہ وہ یہ اعتقاد رکھنے لگے کہ آپ کافر ہوگئے یا کفر کی طرف مائل ہو رہے ہیں،

دوسری طرف ہم ان مجددین میں سے جنھوں نے امام کا راستہ اختیار کیا اور آپ کی قیادت پر رضامند ہوئے بعض ایسے افراد کو پاتے ہیں، جو یہ خیال رکھتے تھے کہ آپ نے تجدید کے لئے جو وسائل اختیار کئے ہیں وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچے یہ وہی لوگ تھے جو اس امر کے قائل تھے کہ اہل یورپ کے طریقوں اور ان کی عادتوں کو پورے طور پر اختیار کرلیا جائے اور اپنے معاشی حالات میں ان کے تمدن اور ان کے طور وطریق کو حاصل کرلیا جائے یہ لوگ یورپی طرز پر تعلیم پائے ہوئے تھے، جن پر امام نے اپنے ابتدائی ایام ہی میں نکتہ چینی کی تھی کیونکہ قوم کی ترقی و احیاء کے لئے ان کے جو آراء و خیالات تھے وہ بالکل سطحی تھے،

اس طرح محمد عبدہ اور آپ کے رفقاء کار نے ایک اوسط موقف اور معتدل مقام اختیار کیا، لارڈ کرومر کہتا ہے:

"مجددین کے طبقہ نے ان کو کفر کا الزام دینے پر حد درجہ غلو برتا یہاں تک کہ وہ رجعت پسندوں کی معلومات کو اکتساب کرنے سے عاجز رہے انھوں نے مغربی تمدن سے جو چیزیں حاصل کی تھیں وہ ان لوگوں کے اکتساب کے لئے کافی نہ تھیں، جو اہل یورپ کی تقلید کرتے تھے، یہ ایسی ہی مثال ہوئی کہ کوّا نے ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی، اسے ہنس کی چال تو آئی نہیں، اپنی بھی چال بھول گیا"

مگر ترقی و اصلاح کا قومی جذبہ زور دل پر رہا اور نہایت وسعت سے پھیلتا رہا، جس پر یہ امر شاہد ہے کہ بہت سے لوگوں نے شیخ عبدہ کی کھلم کھلا امداد کی اور ان کے جھنڈے تلے جمع ہوئے، یہاں تک کہ ازہر میں بھی ایسے لوگوں کی

ایک بڑی تعداد ہوگئی جو اصلاح کی ضرورت کو تسلیم کرتے اور اُن مساعی تحریکات کی تائید کرتے تھے جنھیں آپ اس راہ میں صرف کیا کرتے تھے، بیرونِ ازہر میں ایسے بیشمار اشخاص تھے جو اندرونِ ازہر رہنے والوں کے مقابلہ میں آپ کے اغراض و مقاصد کے بے پناہ جذبات کو اپنے دل میں پرورش کرتے تھے، لیکن اپنے خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنے سے گھبراتے تھے، اندرونِ ازہر موثر افراد نے آپ کی تحریکات کی اعانت سے پس و پیش کیا، جس کا بیرونِ ازہر بھی بہت اثر پڑا، اس کی وجہ سے آپ کے مددگاروں کی آوازیں کمزور پڑ گئیں اور ان کی کوششیں ایگاں ہوگئیں حالانکہ وہ اکثریت میں تھے، بخلاف اس کے مخالفین پیہم اپنی کوششیں جاری کئے ہوئے تھے اور ان کی آوازیں کسی طرح کمزوری واقع نہیں ہوتی تھی، اصلاح کے راستہ میں امام نے جن مشکلات و مصائب کا سامنا کیا، غالباً اس کی وجہ آپ کے مددگاروں کی کمزوری اور آپ کے ہمدردوں کا تذبذب تھا، بخلاف اس کے آپ کے دشمنوں اور مخالفوں کی پیش قدمی جاری رہی اور اپنی مخالفت پر وہ ثابت قدم رہے

آپ کا نفوذ و اثر اور آپ کی شہرت نہ صرف مصر تک محدود رہی بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے مسلمانوں نے آپ کے نام خطوط لکھے، آپ کی حب وطنی اور دینی حمیت نے ان کو اپنی طرف جذب کرلیا، انھوں نے آپ سے اپنے دینی و شرعی معاملات میں مشورہ و فتویٰ لیا اور آپ کے علم سے استفادہ کرتے رہے، اپنی امور و مسائل میں ہندوستان و مراکش تک کے ممالک اسلامیہ کے اونچے درجہ کے عہدہ داروں مسلمان امراء و سلاطین اور علماء و فضلاء نے آپ سے خط و کتابت کی:

مشرق میں آپ کے نام کی جو شہرت و عزت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ شام وغیرہ دیگر عثمانی شہنشاہیت کے خطوں میں بادشاہ نے اخباروں میں آپ کی وفات کی خبر یا تعزیت نامے یا آپ کی سیرت پر گفتگو کرنے کو منع کردیا تھا اس سے

بیشتر بھی آپ کا تذکرہ ممنوع قرار دیا گیا تھا، کیونکہ آپ کا مجرد نام ظاہر کر دینا ہی اصلاحی تحریکات کے تذکرہ کو مستلزم تھا۔

آپ کی شہرت کی حدو وسعت کا اندازہ ان تعزیتی خطوط و بیانات سے کیا جا سکتا ہے جو آپ کی وفات کے وقت آپ کے رشتہ داروں اور آپ کے مددگاروں کی طرف شام، ہندوستان، بحرین، سنگاپور، جاوا، ایران، روس، تیونس اور الجزائر وغیرہ ممالک اسلامیہ سے بھیجے گئے تھے۔

مزید برآں وہ رسائل و جرائد اخبارات اور مجلات بھی قابل ذکر ہیں، جنھوں نے آپ کے حالات زندگی شائع کئے اور آپ کی سیرت اور آپ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی، یہ نہ صرف مذکورہ بالا ممالک کے اخباروں تک محدود تھے بلکہ ساؤ پاولو برازیل اور نیویارک کے عربی اخباروں نے بھی آپ کے متعلق بہت کچھ تحریر کیا ہے اور آپ کے اور جمال الدین کے نام کو ترکی کے بہادرانِ حریت مدحت پاشا اور فواد پاشا کے ناموں کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔

پروفیسر براؤن عالم انگلیسی نے جو خط مرحوم کو لکھا ہے اس سے آپ کے احترام و بلند پایہ مقام کا پتہ چلتا ہے، جو یورپ کی نظر میں تھا اور مورخ جمال الدین محمد عبدہ کی موت پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

"میں نے اپنی تمام زندگی میں بہت سے ملک اور بہت سے انسان دیکھے ہیں، لیکن میں نے کبھی کسی کو مرحوم کی طرح نہ مشرق میں دیکھا اور نہ مغرب میں پایا۔ بخدا آپ علم و ادب میں یگانہ، زہد و تقویٰ میں یکتا، ظاہری و باطنی امور پر آگاہی و بصیرت میں تنہا، صبر و عزیمت اور خلوص نیت میں فرد واحد اور فصاحت و بلاغت میں آپ اپنی مثال تھے، عالم باعمل، خدا ترس، راہ خدا کے مجاہد، علم کے شیدائی اور مسکینوں اور فقیروں کا ماویٰ و ملجا تھے

آپ کی اکثر و بیشتر تصنیفات سے جو دوسری زبانوں میں منتقل کی گئی ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اثر و نفوذ مصر سے باہر مشرقی ممالک میں زیادہ قوی رہا ہے محمد رشید رضا صاحب المنار نے بیان کیا ہے کہ شیخ عبدہ کا گراں قدر رسالۃ التوحید اور وہ تمام تعلیمات، جن کی طرف آپ دعوت دیتے تھے اردو زبان میں منتقل ہو گئی ہیں اور جامعہ علیگڈھ اور ہندوستان کی دیگر جامعات میں درسی کتابوں میں شامل ہو گئی ہیں، ڈاکٹر احمد محی الدین ترکی کے دور جدید کی تاریخ میں بیان کرتے ہیں کہ ایم عاکف نے محمد عبدہ کی چند کتابوں کو ترکی زبان میں منتقل کیا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ محمد عبدہ کی تعلیمات اور ترکی کے جدید مصلحین و مفکرین کے آراء کے مابین اسی طرح ان کے اور ترکوں کے وطن پرست طبقوں کے نظریات و افکار کے درمیان قریبی تعلقات کے وجود کا امکان ہے، اگرچہ یہ تعلق آپ کے اور ان طبقات کے درمیان کم از کم خود اسی مولف کا بیان ہے کہ صاحب المنار نے توحید مذاہب میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا ترجمہ ترکی میں احمد حمدی نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ایچ کریمر جو ہولندی عالم ہے جس نے مشرقی ہالینڈ کے ہندی جزائر میں اسلامی حالات و واقعات کا نزدیک سے مطالعہ کیا ہے، بیان کرتا ہے کہ محمد عبدہ کی تعلیمات ملایا کے طول و عرض پر چھائی ہوئی ہیں، وہ کہتا ہے کہ "محمد عبدہ کا نفوذ و اثر مشرقی ہالینڈ کے ہندی جزائر میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کئے ہوئے ہے، آپ کی تفسیر کے کئی حصے ملائی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، انجمن محمدیہ (جس کی غرض و غایت مسلمانان ملایا میں تعلیمی اصلاح و دینی اصلاح کو عام کرنا ہے) آپ کی تعلیمات کو "لوجی اکارتا" میں پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے، ملایا کے مسلمان مغربی طرز پر جو ترقی اور پیش قدمی کر رہے ہیں، اس کے اہم عناصر و اجزاء نوجوان داعیوں کے ذریعے سے حفظان صحت کے اصول کی طرف توجہ اور تعلیم و تربیت کی نشر و اشاعت ہیں۔

اس مقصد کے لئے وہ تبشیری جماعتوں کے تمام طریقوں کا اتباع کرتے ہیں انجمن محمدیہ لپالیا اور عرب میں اپنی تبلیغ وارشاد کی تحریک کو تیز کر رہی ہے یہ ایک اصلاحی تحریک ہے جس کو شیخ احمد سورکاتی لوپا تاخیا کے رہنے والے ہیں سرانجام دے رہے ہیں یہ با اقتدار آدمی ہیں، اہل سنت یا ان کے مخالفین کی کوئی قابل تذکرہ تحریکات ہمیں نظر نہیں آتیں، وہاں ایسی بیشمار تحریکات برپا ہیں جو معمولی اور غیر منظم ہیں بہت سی ایسی ہیں جو مصلحین کے خلاف علم مخالفت برپا کرتی رہتی ہیں، لوگوں میں اکثر تشدد پسند اہل سنت کی ہے، یہ لوگ دین کے ٹھیکہ داروں کے ماتحت ہیں، اور یہ سخت قسم کے رجعت پسند ہیں اور رامنی کے دامن کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں۔

ایک اور مستقل تحریک ہے، یہ الحاج سالم کی تحریک ہے یہ شخص بہت عجیب و غریب اور نڈر ہے، شرکتہ اسلام (یہ ایک سیاسی انجمن ہے جس کو انڈونیشیا کے مسلمانوں نے ۱۹۱۲ء میں قائم کیا تھا، اس کی غرض وغایت اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں سے وطنیوں کے مرکز کو مضبوط کرنا ہے) اور منری اسلامی انجمنوں میں یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وہ لوگوں کے اذہان وعقول کو جامعہ اسلامیہ کی طرف موڑ دیں، لیکن اہل سنت بالخصوص عرب، جو ان سے جہاد کر رہے ہیں وہ مجددین پر سخت غضبناک ہیں اور ان کو وہابیوں سے موسوم کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد عبدہ ہی کی ایک ایسی ممتاز و منفرد شخصیت تھی جس نے گذشتہ صدی میں اپنے افکار و آراء کی تمام کے دلوں پر دھاک بٹھا دی تھی آپ نے بحیثیت ایک عالم، محب وطن اور قومی کارکن کے اپنے زمانے کو اپنے مزاج میں رنگ دیا ان تمام امور میں اگر آپ کا موازنہ دوسرے ملکوں کے معاصرین زعماء و مفکرین کے ساتھ کیا جائے تو آپ باعتبار ایک مصلح کے عظیم الشان قدر و منزلت کے مستحق نظر آتے ہیں، کیونکہ جیسا کہ جرجی زیدان نے ملاحظہ کیا ہے، کسی قوم

کی تاریخ میں چند ہی ایسے افراد پائے جاتے ہیں، جو آپ کی طرح اصلاحی کوشش کر سکتے ہیں آپ اپنی زندگی میں اپنی کوششوں کے نتائج وثمرات کو اپنی نظر سے نہ دیکھ سکے، لیکن آپ نے جن آثار وتحریکات کی یادگاریں چھوڑیں وہ آپ کے بعد تابندہ ودرخشاں ہوگئیں

ایک معاصر مصنف کہتا ہے کہ:

"آپ کا انتقال عہد جدید کی ایک ایسی صبح میں ہوا جس کے طلوع و نمودار ہونے کا سہرا عالم اسلامی میں آپ کی تعلیمات کے سر باندھا جائے گا"

لیکن یہ درخشاں وتاباں صبح آپ کی وفات کے بہت مدت بعد نمودار ہوئی، یہ آپ کی دوربین نگاہوں کا ثبوت ہے اور آپ کے اس بلند مرتبہ ومقام کی پیش گوئی کرتا ہے جو زعماء مصلحین اسلام کے درمیان آپ کو حاصل ہے
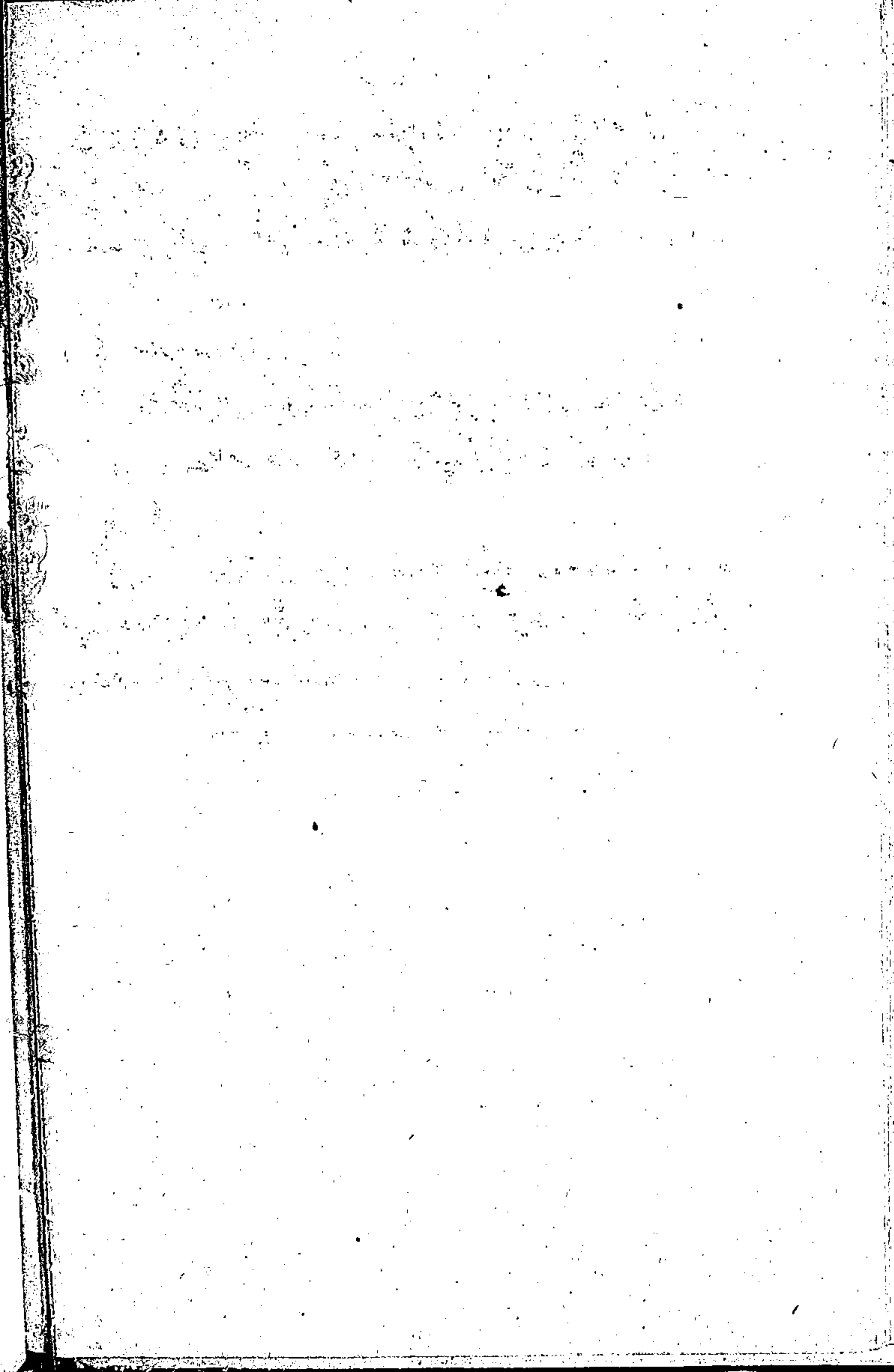
پانچواں باب
تعلیماتِ محمد عبدہ

بنیادی رجحانات

ہم نے گذشتہ صفحات میں محمد عبدہ کے بعض اہم آراء و نظریات پر بحث کی تھی بالخصوص آپ کی کوششوں کے مختلف پہلوؤں اور آپ کے طرز فکر کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا تھا، اس کے علاوہ مجمل طور پر آپ کی تعلیمات اور افکار کو مرتب شکل میں اور واضح طور پر پیش کر دینا ضروری ہے، تاکہ ہماری نگاہوں کے روبرو آپ کے طرز فکر و نظر اور آپ کی اسلامی سرگرمیوں کا منظر کھنچ جائے، یہی بحث اس باب کا موضوع ہوگی

ہم نے کتاب کے آخر میں اُن ماخذات کو بیان کر دیا ہے، جن سے ہم نے خوشہ چینی کی ہے، ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہماری یہ کتاب محمد عبدہ کے افکار کو واضح کرنے کے لئے پہلی کوشش ہے، کیونکہ اس کتاب سے پہلے تین کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

گولڈ زیہر (GOLD - ZIHER) نے اپنی کتاب "تفسیر قرآن میں مسلمانوں کے مسالک" میں ایک باب منعقد کیا ہے، جس کا نام "اسلامی تجدید اور تفسیر قرآن" رکھا ہے (صفحہ ۳۱۰ - ۳۷۰) اس باب میں محمد عبدہ کے تفسیر قرآن کے طریقہ اور اس کے بعض ان نتائج پر بحث کی ہے، جہاں تک آپ پہنچ چکے تھے۔

رسالہ توحید کے مقدمہ میں جس کا فرانسیسی ترجمہ مسیو برنار میشیل اور شیخ مصطفیٰ عبدالرازق نے کیا ہے، محمد عبدہ کے آراء کے دو گراں قدر خلاصے ہیں، پہلے میں اسلام کے متعلق آپ کے عمومی نظریہ کا اظہار ہوتا ہے، دوسرے میں ان آراء

نکار کو سمویا گیا ہے جن پر رسالۂ توحید مشتمل ہے (صفحہ ۴۴ - ۷۵)

پھر استاد ایم ہورتن نے اپنی بحث کے دوسرے حصہ میں جس کا نام "محمد عبدہ کی زندگی اور ان کا دینی و فلسفیانہ مذہب" رکھا ہے، محمد عبدہ کی نوعیت فکر پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کو رسالۂ (Beitrage - zur - Kenntniss des Orient) (جلد ۱۳ "۱۹۱۷" صفحہ ۷۴ - ۱۲۸) میں نشر کیا اس سے پیشتر کے شمارہ میں اپنی بحث کا پہلا حصہ شائع کیا اور اس میں محمد عبدہ کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں۔

پروفیسر ہورتن نے اپنی بحث کو شیخ کے نظریۂ کائنات پر محدود کر دیا ہے گو وہ اس کا قائل ہے اگر شیخ کو ایک مرشد دینی اور ایک اجتماعی مصلح کی حیثیت سے دیکھا جائے اور آپ کے کارناموں پر بحث کی جائے تو بہت بڑے نتائج تک پہنچنے کی توقع ہو سکتی ہے (جلد ۱۳ صفحہ ۸۵)

ہم نے ان تمام دیرینہ مباحث کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے بعض پہلوؤں پر اعتماد کیا ہے لیکن ہماری اس بحث میں عربی ذرائع معلومات اور ماخذات ہی اولین اساس و بنیاد ہیں۔

ہورتن کی رائے محمد عبدہ کے بارے میں

تینوں مباحث میں، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، استاد ہورتن کی بحث اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس نے محمد عبدہ کے طرز افکار کو بیان کرنے کی طرف توجہ کی ہے، یہ فطری امر تھا کہ وہ آپ کے طرز فکر میں اپنی رائے کو بھی منسوب کر دے اور ان کوششوں کے مضمرات کا اظہار کرے جنھوں نے آپ کو توحید و فلسفہ کے میدان تک پہنچا دیا۔

مجمل طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہورتن محمد عبدہ کو بلند پایہ اسلامی مفکرین کی صف
میں جگہ نہیں دیتا، اس نے ایک ایسے مغربی عالم کے نقطۂ نظر سے آپ کی تصنیفات کا
مطالعہ کیا ہے جو اسلام کا مطالعہ کرتا ہے اور یہ رائے رکھتا ہے کہ اسلام کے عہد
تبدل کے دقیق موضوع میں علمی نقد و نظر کی تخلیق و ایجاد کے لئے موقع دستیاب ہو،
یہ دقیق علمی تحقیق و جستجو کے ذریعہ مسلمانوں اور بالخصوص علم توحید کے مابین فلسفیانہ زا
نگاہ رکھتا ہے تاکہ اسلام کی اصلاح کرے اور اس کو از سر نو جدید ماحول کے سانچے
میں ڈھال دے اور عصر حاضر کی بعض فکری مشکلات کے حل کرنے کے لئے ہر ممکن اضافہ
کرے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد عبدہ ہورتن کی امید کو پورا نہ کر سکے، کیونکہ اس نے
یہ ثابت نہیں کیا کہ آپ ارتقا و بیداری کے کفیل تھے جیسا کہ آپ کے علاوہ بعض دیگر
اسلامی جلیل القدر مفکرین تھے

ہورتن کہتا ہے کہ "مغربی مورخین کو، جنھوں نے مشرق کے عقلی تغیرات و ادوار
کا اس اعتبار سے تتبع کیا ہے تاکہ وہ نئی تہذیب و ثقافت کے اس ہنگامہ آرا
دور میں اسلامی ارتقاء کا نشان معلوم کریں، بدقسمتی سے ابن سینا جیسا کوئی بلند
فکر مفکر نظر نہیں آیا، جو ثقافتِ جدیدہ کی مشکلات پر غالب آجائے، پرانی چیزوں
میں سے لغویات کا خاتمہ کردے اور ان میں پسندیدہ امور کو جاگزیں کرے، دنیا کے
جدید اہم مسائل کا واضح طور پر ادراک کرے اور ان کو حل کرنے کی تدبیر سوچے"
(جلد ۴، صفحہ ۱۲۸)

شیخ عبدہ کے طریقے کافی مقدار میں موضوعی علمی نہ تھے اس لئے جن نتائج پر آپ
پہنچے وہ نقص سے خالی نہ تھے، آپ نے ایک مرتبہ بھی تنقید متن کی کوشش نہ کی
(نفس المصدر صفحہ ۱۲۸) ہم کو آپ کے پاس ایسا علم نظر نہیں آتا جو شائبوں سے خالی ہو

فلسفہ کے متعلق آپ کی رائے تقریباً یہ تھی کہ فلسفہ میں انہماک مذہب کے حدود سے باہر کر دیتا اور مذہب کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتا ہے' آپ کے نزدیک ایک ایسے کائناتی عمومی نظریہ کو تلاش کرنا ہمارے لئے بیکار ہے جو علمی اساس پر قائم ہو (جلد ۲ صفحہ ۸۵) لے دے کے ہم آپ کے پاس صرف اس قدر پاتے ہیں کہ آپ ان تمام چیزوں کو منہدم کر دینا چاہتے ہیں جو ارتقائی روح کا خاتمہ کرتی ہیں' لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ عالم فکر کی کوئی نئی عمارت نہیں پاتے (جلد ۴ صفحہ ۱۲۸) ہورتن کی رائے یہ ہے کہ محمد عبدہ نے جب دینی و فلسفیانہ مسائل کو ثابت کرنے کی کوشش کی تو صرف جزئی طور پر آپ کو کامیابی حاصل ہوئی' کیونکہ آپ نے جب پرانی چیزوں اور پرانے اصولوں میں درماندگی و کوتاہی کے آثار دیکھے' تو علمی تفکیر اور جدید علمی ثقافت کے لئے ایک تمہیدی راستہ پیدا کر دیا۔

ہورتن کہتا ہے کہ

"آپ کے اس طرزِ عمل سے ہمیں اس بات کا اندازہ کرنا آسان ہے کہ آپ نے بہت سی اچھی چیزوں کو منہدم کر دیا' جن قدیم آراء و افکار کو باقی رہنے دیا ان میں اتنی وسعت باقی نہ رہی جو گذشتہ زمانہ میں تھی' ہمارا فرض یہ ہے کہ ان اکثر و بیشتر امور کا ہم اعادہ کریں جنھیں آپ نے منہدم کر دیا۔" (جلد ۴ صفحہ ۸۲ - ۸۳)

آگے چل کر کہتا ہے:

"آپ کی فکر نے بہت سے غیر مسلمہ آراء و نظریات کو تسلیم کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک بہت سا ایسا بوسیدہ انبار جمع ہو گیا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے تاکہ جدید عمارت کے لئے گنجائش نکل سکے" (نفس المصدر صفحہ ۱۲۸)

مجموعی طور سے یہ حکم محمد عبدہ کے سرخرو کارناموں پر نہیں لگایا جا سکتا
درحقیقت یہ محض آپ کے ایک رخ پر روشنی ڈالتا ہے، ہورتن کا فرض تھا کہ آپ
کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، چنانچہ آپ نے دیگر گوشوں کی طرف بھی اشارہ
کیا۔ جس سے ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ محمد عبدہ نے صالح کارنامے انجام دیئے۔
ہورتن کہتا ہے:

"آپ کی حقیقی قدر و قیمت علمی میدان میں نہ تھی بلکہ وہ آپ کے دینی
جذبہ کی نشوونما و احیاء میں تھی (جلد ۱۳ صفحہ ۸۵) آپ کی زندگی میں
ہم ایک اور اہم عنصر کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے یہ تسلیم
کیا کہ متکلمانہ (سکولاسٹک) فلسفہ میں خامیاں ہیں اور وہ اپنے مدعا
و مقصد میں پہنچنے سے درماندہ و عاجز ہے نیز آپ نے مشاہدہ کیا
کہ جدید فلسفہ کے اصول مقرر کرنے کا وقت اب قریب آگیا ہے"
(نفس المصدر صفحہ ۸۶-۸۷)

اسی مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے موجودہ اسلامی فکری تعمیر کو لوٹانے کا
فرض ادا کر دیا جس کی امید بہت کم تھی چنانچہ ہورتن کہتا ہے:-

"مگر یہ بہت بڑا غبن ہوگا کہ ہم ایک مشرقی سے مختلف میدانوں میں
کامل نتائج کی توقع رکھیں حالانکہ مغرب بذات خود مختلف شعبوں میں
ان نتائج تک پہنچنے سے کوسوں دور ہے۔ محمد عبدہ بے چین تھے کہ
اس ماحول پر غالب آجائیں جس میں آپ نے زندگی بسر کی اور اس
سے متاثر ہوئے اس لئے یہ شدید پس ماندہ ماحول اور درماندہ سرزمین
آپ کے کارنامہ وجدوجہد پر تیز روشنی ڈال رہی ہے اور ہمیں اس امر
کے لئے آمادہ کر رہی ہے کہ ہم آپکی اکثر فروگذاشتوں کو درگذر کر دیں"
(جلد ۱۴ صفحہ ۲۸)

پھر ہورتن اپنے اس بیان میں منصفانہ رویہ اختیار کرتا ہے کہ "آپ نے جب تفکیر کا وہ جدید طریقہ معلوم کر لیا جو قرون وسطیٰ کے متکلمانہ طریقہ کے مقابلہ میں تھا تو آپ کا اکثر قدیم اصول کو منہدم کر دینا بہت بڑی غلطی نہ تھی (نفس المصدر صفحہ ۸۲) اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ بحال رہتی ہے، وہ یہ کہ آپ اسی دور میں پہنچے جس کا تقاضا ہی یہی تھا کہ آپ نے تفکیر جدید اور ثقافتِ جدیدہ کے لئے ایک معقول اساس مقرر کرنے کی کوشش کی (نفس المصدر صفحہ ۸۲) آپ نے منطق، فلسفہ اور توحید میں محکم اور متین تصنیفات کے لئے اسی وقت قلم اٹھایا جب کہ ثقافت جدیدہ کو اسلام میں پورے طور پر جذب کر لیا" (نفس المصدر صفحہ ۷۸)

ہم نے ہورتن کی رائے کو مختصر طور پر پیش کر دیا ہے، کیونکہ یہ ایسے مشہور عالم و محقق کی رائے ہے جس نے اسلام کا دینی و فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا اور طویل بحث و نظر کے بعد اس حکم پر پہنچا ہے، اس سے بڑھکر یہ کہ یہ رائے شیخ عبدہ کی تصنیفات پر حکم لگانے کے لئے ممکنہ نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے۔ ہورتن آپ کی قدر و منزلت پر ایک ایسے عالم و مفکر کی حیثیت سے بحث کرتا ہے جس کے لئے اسلام کے عہد تبدل کے دقیق ماحول میں اس امر کا موقع ملا ہے کہ مسلمانوں کی دیرینہ صدیوں کی فکر و بصیرت کو جدید علمی معرفت کی میزان میں وزن کرے اور اس کو جدید فکر و نظر کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے اور اس کی چھان بین کرے اور اس کے صالح عناصر کو باقی رکھے اور مغرب کے جدید ثمرات کو ہضم کرلے، قدیم و جدید افکار کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے اور ان تمام کو ایک ایسے عقلی و فکری نظام میں منظم کر دے جو جدید و قدیم کی بہترین چیزوں کو جمع کرتا ہے۔ اس کے اس قسم کے طرز عمل اور جد و جہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست عقل و بصیرت والا شخص ہے۔

غرض کہ اسلامی فکر کے اس انقلاب کی صلاحیت کو بیان کرنے کا جو

ارادہ رکھتا ہے، اس کے لئے بحث کی وسیع جولاں گاہ ہے، اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا کام یا تو ایک شخص یا مسلسل کئی اشخاص کے ذریعہ ضروری ہے تاکہ اسلام کو ایک نظامِ فکر و فلسفہ پر باقی رکھا جائے، جس میں اتنی قدرت و صلاحیت ہو کہ جدید علمی آزمائشوں کی مشقتوں کو برداشت کرلے۔

جن لوگوں نے محمد عبدہ کی ان کوششوں کا اندازہ لگایا ہے، جن کو آپ نے اسلام کے راستہ میں خرچ کیں، تو اس رائے کو ترجیح دیں گے کہ آپ اپنے مقصد تک پہنچنے میں ناکام رہے اور آپ کو بہت کم کامیابی نصیب ہوئی۔

محمد عبدہ کے افکار و اعمال کے مابین تعلق

اس کے باوجود جب ہم مجموعی طور پر محمد عبدہ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ آپ کی تصویر کا جو خاکہ ہم نے کھینچا ہے وہ ایک خاص قسم کو پیش کرتا ہے خصوصاً جب کہ ہم محمد عبدہ کے افکار کے درمیان بحیثیت ایک مصلح شخص کے، اور آپ کے اعمال کے مابین جوہری تعلقات پر بخوبی توجہ کرتے ہیں تو ہمیں خاص طور سے شک و شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی فکر کے بڑے انقلاب کی وجہ سے محمد عبدہ ایسے عالم یا مفکر نہ تھے، جو جماعت سے الگ ہوکر گوشہ نشینی میں زندگی بسر کریں۔

درحقیقت ابتداءً آپ کی زندگی پر ایسے تصوف کا اثر غالب تھا، جو فلسفہ و توحید سے مخلوط ہے، اسی طرح آپ ان مسائل میں منہمک رہے، جن میں اکثر حکماء و فلاسفہ کا ذہن و دماغ مشغول ہوا کرتا ہے اگرچہ ان میں سے اکثر و بیشتر مسائل جدید علم و حکمت کے مسائل سے واقفیت اور دلچسپی کی بنا پر تھے، اگر آپ بغیر کسی رکاوٹ کے اسی زندگی کو مسلسل جاری رکھتے تو آپ کو اتنا دسترس حاصل ہو جاتا کہ آپ ایک جدید فلسفیانہ مدرسہ ایجاد کر دیتے جو کامیابی کے ساتھ گذشتہ صدیوں کے افکار اور

عہد جدید کے آراء و نظریات کے مابین ہم آہنگی و اعتدال پیدا کر دیتا، لیکن قومی زندگی نے آپ کو اپنی طرف جذب کر لیا، آپ نے اپنے آپ کو اس کی آغوش میں دے دیا، بہت سے کارہائے نمایاں میں مصروف ہو گئے، اس طرح آپ کو درس و تدریس کا بہت کم موقع ملا۔

آپ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی تصنیفات اور تعلیمات آپ کی قومی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو چلتی رہیں، ہر ایک نے دوسرے پر اثر ڈالا یا یا زیادہ تر صحیح توجیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اس بلند مقصد سے اثر پذیر ہوا جس کو آپ نے اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا اور وہ اسلام کی اصلاح اور اس کو قوت و حیات کا بہم پہنچانا اور اسلامی جماعتوں کو ان کے گذشتہ شرف و وقار کی طرف لوٹانا تھا۔

دوبارہ ہم اس موثر مقام کی طرف اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، جس کی طرف محمد عبدہ نے رخ کیا، اصلاحی مشکلات کو جیسا کہ آپ کے سامنے ظاہر ہوئیں ہموار کرنا آسان کام نہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان انتہائی پسماندگی اور زوال کی حالت میں تھے۔ سیاسی اعتبار سے تو ان کی بیشتر آبادی ایسی حکومتوں کے فرمانرواؤں کے ماتحت ہے، جو دین و مذہب کے سراسر مخالف ہیں ان میں سے جو لوگ اپنی ہمسایہ اجنبی حکومتوں کی اطاعت سے آزاد ہیں، تو غیروں کے اثر و نفوذ سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے، اس لئے اب سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ ان پسماندہ قوموں میں از سر نو زندگی کی روح پھونکی جائے ان کے اندر باہمی اتحاد و الفت کے جذبہ کو بیدار کیا جائے اور ان کو ایک وحدت میں منظم کیا جائے، تاکہ وہ اخوت اسلامیہ کی قوتِ اجتماعیہ کا شعور کر لیں اور اپنے عظمت و وقار کی میراث میں اشتراک کریں۔

دوسری طرف مسلمانوں کی اجتماعی، اخلاقی، اور فکری زندگی افسوسناک اور درد انگیز حالت میں تھی، ان میں بہت سی بیماریاں جڑ پکڑ گئی تھیں وہ ایسی بیشمار ناشائستہ رسوم وعادات کے غلام ہو چکے تھے، جن کا اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں بلکہ یہ صحیح اسلام کے مقابلہ میں جہل وگمراہی کی پیداوار اور اسلامی احکام واصول سے مسلمانوں کی بے خبری اور ان کی پیروی سے بیزارگی کا نتیجہ تھے۔

شیخ عبدہ کا عقیدہ یہ تھا کہ ان تمام امراض وعلل کا علاج صحیح اسلام کی طرف اسلامی جماعتوں کو دعوت دینی چاہئے؟ محمد عبدہ نے اس امر کا ادراک کر لیا کہ مسلمان مختلف گروہوں میں منقسم ہیں، ہر فریق کا یہ دعویٰ ہے کہ وہی تنہا حق پر ہے۔ مزید برآں اس کو یہ احساس ہے کہ اسلام جیسا کہ اس کو فقہا نے سمجھایا ہے اس قدر وسیع اور گنجلک ہے کہ ہر کس وناکس کو پوری طرح اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے، بالخصوص جب کہ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہو۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا، تو اسلام کے احیاء اور اس کے ارتقاء کی صرف ایک امید تھی، جس کا انحصار اسی دین کے اصول کو از سر نو زندہ کرنے پر تھا، یعنی وہ اصول عقائد جس کے بغیر کوئی مسلم مسلمان نہیں، یہی وہ صحیح اسلام ہے جس کا سبھوں کو اعتراف ہے اور تمام اسی پر یک زبان ہیں۔

اس سے بڑھکر یہ امر ضروری ہے کہ قوم کے درمیان تعلیم وتربیت کی نشر واشاعت کے ذریعہ اور جدید علمی تحقیقات سے انہماک کے واسطہ سے فکری بیداری کو تیز تر کیا جائے تاکہ امت اسلامیہ دوسری قوموں کے مقابلہ کی تاب رکھے جدید تمدن کی روح میں یا جدید علم کے ثمرات میں کوئی ایسی شے نہیں جو صحیح اسلام کے خلاف واقع ہوتی ہے، جب کہ اسلام کو خوش اسلوبی سے سمجھا جائے اور اس کی وضاحت وتشریح حسین پیرایہ میں کی جائے، اسلام کی ایسی تصویر پیش (۱)

(۱) طرف رجوع کرنے میں مضمر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ صحیح اسلام کیا ہے جس کی ۴

کرنے کی ضرورت کا احساس جو جدید علم کی شکل و صورت سے مشابہت رکھے اس امر کو بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ اسلام کے جوہری اصولوں کا اعادہ کیا جائے، اس کے مزاج کا خاصہ اور اس کی طبیعت کا تقاضہ کسی زمان اور کسی مکان سے قائم نہیں خاص طور سے نظام شریعت (قانون) میں، جو اسلام کا ایک اہم جزو ہے دوبارہ نظر دوڑانے کی ضرورت دامنگیر تھی تاکہ عملی طور پر یہ ثابت کرکے دکھلایا جائے کہ شریعت جدید حالات میں حکومت و عدالت کے لئے صالح ذریعہ ہے۔

اس طرح کام کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ محض ان مفاسد اور خرابیوں میں جو اسوقت عام تھیں ظاہری اصلاحات کے ذریعہ سے تخفیف کردے، جیسا کہ بعض مصلحین کا طریقہ ہے، نیز یہ کام فلسفہ و توحید کو محض جدید صورت میں رنگنے کا نہ تھا، جیسا کہ مذاہب کا شیوہ رہا ہے، بلکہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا اور دشوار گذار بھی، ایک طرف دینی اصلاح تھی اور اس کو اس کی دیرینہ سادگی اور اثر آفرین تاثیر کی طرف لوٹانا تھا اور دوسری طرف جمہور عوام کو خالص دین کو قبول کرنے اور والہانہ طور پر اخلاص کے ساتھ اسلامی احکام کے اتباع کے لئے آمادہ کرنا تھا اس لحاظ سے یہ کام ایک نئی قوت میں اسلام کا احیا رتھا، تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی زبون حالی سے نجات دلائی جاسکے اور ان کو ان کے دیرینہ مجد و شرف کی طرف لوٹایا جاسکے،

مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کی اصلاح کن وسائل کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے؟ جمال الدین سیاسی انقلابات برپا کرنے کی دعوت دیتے تھے، ان کے علاوہ دوسروں کا نظریہ یہ تھا کہ اصلاح کے پورا ہونے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ مغربی علم و حکمت اور تہذیب و تمدن اور مغربی عادات و اطوار کو اختیار کرلیا جائے لیکن محمد عبدہ کا عقیدہ یہ تھا کہ واحد وسیلہ جس کے ذریعہ کامیابی کی امید کیجا سکتی ہے وہ یہ ہے

کہ ہر اسلامی ملک میں اسلامی جذبہ کو زندہ و بیدار کیا جائے۔

محمد عبدہ مسلمانوں کے امراض اور ان طریقہ ہائے علاج پر بحث کے دوران میں جہاں ایران، ہندوستان، عرب ممالک اور مصر میں ترقی پسندوں اور روشن ضمیروں کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ تمام کا مقصد ایک ہے "اس کا انحصار اس پر ہے کہ مسلمان اپنے دینی اعمال کو اپنے تمام حالات اور زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح و درستگی میں کام میں لائے" پھر آپ اپنے اس قول کی تشریح اپنے اس بیان سے کرتے ہیں:

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مقصد و مدعا، جس کی طرف تمام اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں، محض یہ ہے کہ دینی احکام و نصوص کے سمجھنے میں جو غلطی واقع ہو گئی ہے اس کو دور کیا جائے اور عقائد کو درست کیا جائے کیونکہ جب عقائد بدعتوں اور من گھڑت اصولوں سے پاک اور صحیح سالم ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام کام خلل و اضطراب سے محفوظ رہیں گے، افراد کے حالات درست ان کی بصیرت دینی و دنیوی حقیقی علوم سے روشن اور ان کے اخلاق فطری خوبیوں سے آراستہ ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ افراد کے سنبھلنے سے امت بھی سنور جائے گی"

جب تم کسی داعی کو سنو گے کہ وہ علم دین حاصل کرنے کی طرف دعوت دے رہا ہے تو اس کا یہی مقصد ہے، یا کوئی مبلغ دینی تربیت پر زور دے رہا ہے، تو یہی اس کی غرض و غایت ہے، یا کوئی مقرر مسلمانوں کی موجودہ برائیوں اور خرابیوں کا ببانگ دہل انکار کر رہا ہے، تو یہی اس کا منتہائے نظر ہے، غرض کہ مسلمانوں کی اصلاح کا ارادہ کرنے والوں کا یہی طریقہ ہے، جس کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں کیونکہ ان کے ادب و حکمت کے طریقوں کیلئے، جو دینی رنگ

سے خالی ہیں ایک جدید بنیاد قائم کرنے کی ضرورت ہے اس قسم کے مصلحین کے پاس اپنا کوئی مواد و مسالہ نہیں اور نہ اُسے کوئی کارکن یا مزدور آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے ہیں، جو اس کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ جب اسلام تہذیب اخلاق اور عملی صلاح و فلاح کا کفیل ہے، سعادت و خوشحالی کے دروازوں کو تمام کے لئے کھولے ہوئے ہیں '' اپنے پیروؤں پر اُسے کافی اعتماد ہے ان کے پاس وہ ہر وقت موجود رہتا ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے دامن سے برگشتہ ہو کر اوروں کا سہارا کس لئے ڈھونڈا جا رہا ہے؟

آپ کی تفسیر قرآن کا نہج

اوپر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی مہم کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اور جو وسائل انتخاب کئے وہ آپ کی تمام تصنیفات میں جا بجا روشن نظر آتے ہیں، اس کے باوجود ہم اس قاعدہ کلیہ سے آپ کے اولین رسالہ فلسفہ کو مستثنیٰ قرار دیسکتے ہیں وہ رسالہ واردات ہے، درحقیقت آپ اس کے انتظار میں تھے کہ آپ کے وہ تمام علمی مقاصد منظر عام پر آجائیں، جنھیں آپ مصر و شام کے اخباروں، وقائع مصریہ، جریدہ العروۃ الوثقیٰ اور اپنے مناظروں میں وقتاً فوقتاً تحریر کرتے رہے، اسی طرح وہ خیالات و افکار اپنی تفسیر قرآن میں پیش کرتے رہے، کیونکہ تفسیر بھی آپ کے خیالات کے اثر سے خالی نہ رہی،

گولڈ زیہر لکھتا ہے:-

"آپ کی تفسیر اُن دینی تعلیمات کے جواہر کا آئینہ دار ہے، جن کی طرف

آپ اور جمال الدین دعوت دیتے رہے"

اگر ہم یہ دعویٰ کریں تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی اس تفسیر کے لئے ایک روحانی و علمی رنگ آشکار ہے محمد رشید رضا، جنھوں نے محمد عبدہ کے دروس و اسباق کو تفسیری شکل میں نشر کیا کہتے ہیں:

"محمد عبدہ روحانی و عمرانی طریقہ سے استدلال کیا کرتے تھے کہ قرآن حکیم ہر دور میں دینی و دنیوی سعادتوں اور خوشحالیوں کا سرچشمہ ہے"

رشید رضا تفسیر کی پہلی جلد کے مطبوعہ تنقیح پذیر مقدمہ میں فرماتے ہیں

"تفسیر کی اکثر و بیشتر کتابوں میں پڑھنے والے کا ذہن شان نزول، ترتیب و ربط کے فائدہ، قرآنی علم و حکمت، ہدایت و رحمت اور پند و عبرت میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن محمد عبدہ کا طرز ان تمام کے برعکس ہے آپ نے اپنے دروس میں قرآنی ہدایت کو اس طور پر بیان کرنے کی طرف توجہ کی ہے، جو ان آیات کریمہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے، جو انذار و تبشیر اور ہدایت و اصلاح کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر اتاری گئی ہیں .... پھر آپ نے ان تمام کو موجودہ دور کے حالات کے حسب اقتضا پیش کیا اور مختلف پڑھنے والوں کی سمجھ کو ملحوظ رکھا"

علم توحید میں آپ کا موقف

اگر ہم آپ کے فلسفہ و توحید کے مسلک اور نقطہ نظر کی تفصیلات سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہم پر ضروری ہے کہ ان تمام کو رسالہ توحید میں تلاش کریں لیکن اگر آپ کے اس رسالہ سے آپ کے طرز فکر کی تفصیلات کو واضح کرنا چاہیں تو یہ رسالہ اس قدر مختصر اور مجمل ہے کہ ان تمام کی توضیح کے لئے ہماری دہشت و حیرت حق بجانب ہے اس کے علاوہ شیخ عبدہ اپنے رسالہ کے مقدمہ میں اس رسالہ کو تحریر کرنے کا سبب اور وہ مقصد بیان کرتے ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر اس کی تصنیف کی گئی چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"جب مجھے بعض علوم و فنون کو پڑھانے کے لئے، جن میں سے علم توحید بھی تھا، مدرسہ سلطانیہ بیروت میں دعوت دی گئی، تو میں نے دیکھا کہ اس فن میں جو مختصر کتابیں ہیں اُن سے طالب علموں کو خاطر خواہ فائدہ کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، جو بسیط اور طویل کتابیں ہیں، وہ ان کی فہم و فراست سے بالاتر ہیں، متوسط کتابیں ان کے دور کے علاوہ کسی اور زمانے کے لئے لکھی گئی ہیں، چنانچہ میں نے زیادہ لائق و سزاوار یہی سمجھا کہ ان کی ضروریات و حالات کے مدنظر ان کو درس دوں۔ میرے درس و خطبات مختلف اور گوناگوں رہے، طلبا کی جماعتوں اور ان کے اذہان کے درجات کے مطابق باہم دیگر مختلف و متغایر رہے، میں نے پہلی جماعت کے روبرو جو لکچر دیئے وہ ہر طالب علم کی سمجھ اور اس کی فہم و فراست سے قریب ترین تھے، ان کا سمجھنا اس کے لئے زیادہ دشوار نہ تھا اگرچہ مطالب تک پہنچنے کے لئے اس کو تمہیدی مقدمات کی ضرورت نہ تھی اور نہ میں نے اس کا التزام کیا۔ زیادہ تر مطمح نظر دلیل و برہان کی درستگی ہی پر تھا۔

اگر ہیئت ترکیبی کے خلاف کوئی بیان آجاتا تو اس کی پروا نہیں کی جاتی بلکہ دور ہی سے اختلافی مسائل کی طرف اشارہ کردیا جاتا ..... تاکہ اس اختلافی مقام کا ایک سمجھدار شخص ہی ادراک کرے"

لیکن شیخ عبدہ کے پاس کوئی نسخہ اپنے ان دروس و خطبات کا محفوظ نہ رہا، اس کے بعد کئی سال یوں ہی گذر گئے، آپ اسی طرح تعلیمی کاموں کے علاوہ دوسرے مشاغل میں مصروف رہے، جب آپ کو ازہر میں علم توحید کا درس دینے کا موقعہ دستیاب ہوا تو آپ نے اپنے بھائی حمودہ بک عبدہ سے، جو بیروت میں ان خطبات و دروس کی تلقین کے وقت پہلے گروہ کے طلباء میں سے تھے، مطالبہ کیا کہ آپ کو وہ نسخہ فراہم کریں جس میں آپ نے توحید پر لکھچر دیئے تھے، جب آپ نے اس کا مطالعہ اور اس پر نظر ثانی کی تو اپنی پسند کے مطابق پایا، "گاہے ایک کوتاہ فہم بھی اس کا محتاج ہے، بسا اوقات وسیع معلومات رکھنے والا بھی اس سے بے نیاز نہیں رہتا، کیونکہ اس میں اختصار کے پیرایہ میں مقصد و مدعا کو واضح کیا گیا اور محدود معلومات سے آگاہ کیا گیا ہے، عقائد میں مصنف نے مسلکِ سلف کا راستہ اختیار کیا ہے اور دوران ردیہ میں متاخرین کے آراء و نظریات کی پروا نہیں کی اور مذہبی اختلافات میں اُلجھنے سے اپنے دامن کو بچائے رکھا"

چنانچہ آپ نے ان دیرینہ یادداشتوں کو اپنے دروس کی اساس قرار دیا، ان کو ایک معتدل نظام میں ترتیب دی بعض عبارتوں کو پھیلا دیا اور دیگر بعض بیانات کو مختصر مقامات کے موزوں حذف کردیا، آگے آپ فرماتے ہیں کہ "مجھے توقع ہے کہ اس رسالہ میں اختصار بیان کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں جو اس سے غفلت برتنے یا اس کی قدر و قیمت کو نظر انداز کرنے کے لئے آمادہ کرے"

آپ نے اس کتاب کی تالیف کی غرض و غایت پر جا بجا اکثر مقامات پر روشنی

ڈالی ہے، چنانچہ آپ نے اپنے رسالہ میں جہاں انسانی ضرورت (صفحہ ۹) سے بحث کی ہے فرماتے ہیں "ہم نہ قدما، کے اقوال و بیانات کو پیش کرنے کے درپے ہیں اور نہ متاخرین کے نظریات کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، لیکن ہم نے ان مختصر صفحات میں جو اصول مقرر کر رکھا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھائینگے یعنی ہم نے التزام کر رکھا ہے کہ ہم مخالفین کے میلانات و رحجانات پر نظر کئے بغیر یا موافقین کے اقوال و استدلال کو پیش کئے بغیر اپنے معتقدات و خیالات کو واضح انداز میں اور نہایت قریبی طریقوں سے پیش کریں گے، البتہ ہم اس دوران میں خفیہ اشارے کر دیں گے یا ایسی روشنی ڈالیں گے جس سے مقصد و مدعا پورے طور پر واضح ہو جائے"

آپ نے جہاں اسلام پر (صفحہ ۱۶۸) بحث کی ہے فرماتے ہیں: "میں قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے اس باب کو مجمل پیرایہ میں بیان کروں گا، ارباب فکر و بصیرت کا فرض ہے کہ وہ اس کی تشریح و توضیح کرلیں"

افعال عباد میں جہاں آپ نے مسئلہ جبر و اختیار پر بحث کی ہے اپنے اس بیان پر اس باب کو ختم کیا ہے "مجھے اس بارے میں سیر حاصل بحث کرنے سے یہ امر مانع ہے کہ ایمان کے صحیح ہونے کے لئے اس مسئلہ کی ضرورت نہیں ہے نیز اس مسئلہ کی حقیقت دیکھنے کے ادراک سے عوام کی عقول عاجز و درماندہ ہیں اگرچہ اس کی توضیح پیش کرنے والوں نے مبالغہ سے کام لیا اور اکثر خاص لوگوں کو تقلید کے مرض میں مبتلا کر دیا"

محمد رشید رضا نے نہایت خوبی کے ساتھ اس رسالہ کی نوعیت بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ: کئی صدیاں گذر گئیں، لیکن کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو علماء کلام کے شروط کے مطابق اسلامی دعوت کو اصلاحی طور پر پیش کرے، چنانچہ محمد عبدہ نے اس قسم کی کتاب رسالۃ التوحید تصنیف کی" اس کے بعد آپ فرماتے ہیں "اگر اس رسالہ کا نام

نہ ہوتا اور اس کے شروع میں علم کلام کی مختصر اصطلاحات نہ ہوتیں تو اس کی نشر واشاعت موجودہ سے کئی گنا بڑھ جاتی، ہر ملک میں اس سے عام فائدہ اٹھایا جاتا، لیکن کوئی دور دراز کا باشندہ جب رسالہ توحید کا نام سنتا تو اُسے گمان ہونے لگتا کہ یہ سنوسیوں کی طرح کا کوئی عقیدہ ہے...... یا یہ رسالہ اُس علم الکلام کے مسائل کے بارے میں ہے، جس کو بڑے بڑے علماء ہی حاصل کر سکتے ہیں" آگے چل کر لکھتے ہیں "محمد عبدہ نے ارادہ کیا تھا کہ ان مقدمات کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کریں، اور نبوت وغیرہ اس قسم کے دیگر موضوعات پر عقل ووجدان کی روشنی میں بحث کریں نہ کہ مجرد دلائل وبراہین ہی ثابت کرتے جائیں"

ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ محمد عبدہ اپنی تفسیر کے لکھنے کے وقت عملی مقاصد سے متاثر تھے، آپ تفسیر کو ایسی سہل اور عام فہم عبارت میں لکھنا چاہتے تھے جو ان طبقات کے سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے جن میں اثر پذیری کا آپ ارادہ کر چکے تھے آپ نے اس مقصد کے لئے نہ صرف رسمی طور پر اقدام کیا بلکہ آپ اپنے دل کی گہرائیوں اور طبیعت کی جولانیوں کے ساتھ اس کی کوشش کرتے رہے، آپ فرماتے ہیں کہ لبسا اوقات آپ جمال الدین پر اس اعتبار سے رشک کرتے تھے کہ اُن کو ہر کس وناکس کے روبرو فلسفہ وحکمت پر گفتگو کرنے کی قدرت حاصل تھی، خواہ وہ اس کا ارادہ کرے یا نہ کرے۔

لیکن آپ اس خصوصیت کے برعکس تھے، آپ پر ماحول، وقت اور مجلس کے حالات اثر انداز ہوا کرتے تھے، آپ ٹھیک موقع ومحل ہی پر گفتگو کرنے کی طرف متوجہ ہوتے، یہی خصوصیت آپ کی تحریروں اور تصنیفات پر صادق آتی ہے، لبسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کسی موضوع پر کچھ لکھنا چاہتے اور جس وقت اپنے خیالات وافکار کو حسین پیرایہ میں منظم کرنے کی طرف توجہ کرتے، تو بیشمار

خیالات و افکار کی آمد ہی آمد ہو جاتی اور بحث کے لئے مختلف و متعدد گوشوں کا ہجوم ہو جاتا" آپ فرماتے ہیں "پھر میرے جی میں آتا کہ میں یہ مضمون کس کو سناؤں؟ کون اس سے مستفید ہوگا؟ پھر میں قلم کو روک لیتا اور مشاہدہ کرتا کہ میں نے جن خیالات و افکار کی شیرازہ بندی کی تھی وہ پھر پراگندہ اور منتشر ہو گئے ہیں اور ایک ایک کرکے دھندلے ہوئے اور پھر غائب ہو گئے اسکے بعد کوئی چیز نہ لکھتا"

شیخ عبدہ اپنی تدریس میں ایک ایسی خصوصیت سے ممتاز تھے جس نے آپ کو بلند فکر اور جلیل القدر معلم بنا دیا، اس خصوصیت کو آپ اپنے ہی لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "استاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ایسی میزان رکھے جس کے ذریعہ سے طالب علم کے ذہن کا وزن کر لے اور اس کی استعداد کے درجہ کو معلوم کر لے کہ آیا وہ اپنے استاد کی تقریر اور اس کے بیان کو قبول کر سکتا ہے یا نہیں"

ہمارے گذشتہ بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ آپ نے دین اسلام کے اصول و نظامات کو جس نظر سے مشاہدہ کیا ہے، ان کی تصویر کو بسیط انداز اور واضح طور پر مسلمانوں کے روبرو کھینچ دیں، آپ نے اسی جذبہ کے ساتھ مذہب و کلام کے متعلق جن آراء و نظریات کی تصویر کھینچی وہ نہایت موثر تھی۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں کہ آپ نے بالکلیہ ان مختلف ادوار و حالات کا انکار کیا، جن سے اسلام اپنے انقلابی زمانوں کے دوران میں گذر چکا ہے، کیونکہ یہ صحیح نہیں تھے یا اس لئے کہ ان حالات پر بجز مرکح مسامات کے زیادہ توجہ نہیں دی جا سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ، جیسا کہ ہم پہلے ملاحظہ کر چکے ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ ان ہی عقائد پر مجمل بحث کرتے ہیں، جن کو ناگزیر اصول کے طور پر معتبر سمجھتے تھے، ان میں تفصیلی بحث اور تشریح کو دین کے ارباب فہم و بصیرت کے حوالے کرتے ہیں آپ کا نظریہ

یہ ہے کہ جب پڑھنے والے کو اس طول طویل جدال و نزاع کا علم نہیں ہے، جس سے علم کلام کا ایک بڑا حصہ مرکب ہے، تو اس کو صحیح اسلام سمجھنے کے لئے متکلمین کی تعلیمات اور ان کے مباحث و آراء کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

شیخ محمد عبدہ کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اہل سنت کے آراء و معتقدات پر کافی عبور اور احاطہ تھا آپ اس مسلک کی نہ صرف اُن کتابوں سے واقف تھے، جن کو اہل سنت کے علماء کبار نے تصنیف کیا تھا، بلکہ ان علماءِ صغار کی کتابوں کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا جن کی کتابوں پر اعتماد کیا جاتا تھا اور اہل سنت کے مباحث میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، الحاصل جب ہم یہ ذکر کرتے ہیں کہ اسلامی علم کلام اکثر و بیشتر آراء پر مشتمل ہے، تو ہمارے لئے یہ کہنا بھی روا ہے کہ محمد عبدہ نے علم کلام میں جو رائے و نظریہ پیش کیا ہے وہ اپنے جوہری اعتبار سے مسلمہ آراء و نظریات سے کوئی بڑا اختلاف نہیں رکھتا،

برنارمیشیل کہتا ہے "آپ ہمیشہ اسلام کے دائرہ میں بلکہ اہل سنت کی رائے کی حدود میں داخل رہے، اس اعتبار سے کہ ان کا مسلک ان تمام مدارس مکاتبِ خیال کو شامل ہے جو اکثر نصوص شرعیہ کی قیود میں محصور ہیں انھوں نے مختلف عجیب و غریب رجحانات کے مابین اپنی فہم و بصیرت میں ایک اوسط اور معتدل مسلک اختیار کیا"

اگر شیخ عبدہ کے آراء میں اہل سنت کے نظریات سے کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تو یہ لفظی اختلاف ہے جس سے آپ کا منشا ان کے آراء کی توضیح اور مزید تشریح کرنا ہے، چنانچہ ہم آپ کے بعض آراء میں آپ کو ایک تجدد پسند سُنی پاتے ہیں، اس کا مشاہدہ آپ کے ان خیالات و نظریات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، جنھیں آپ نے وحی اور آنحضرت کی فضیلت و کرامت کے بارے میں پیش کئے، ——— پھر ہم آپ کو اس حیثیت میں بھی جلوہ گر دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے لئے بعض مسائل کے سمجھنے اور ان کی تاویل

کرنے میں عظیم الشان حریت کو روا قرار دیتے ہیں، مثلاً کرامات اولیاء کے موضوع میں اور اُخروی زندگی کے بعض خصوصی تفصیلات میں اور اسی طرح بعض ان مسائل میں جن میں صحیح اور قاطع دلائل واسناد پر اعتماد کیا جاتا ہے، اپنی آزادانہ رائے پیش کرتے ہیں لیکن آپ فقہ اسلامی کے مقام و موقف میں عام و مشہور رائے کی کھلم کھلی مخالفت کرتے ہیں،

ہم نے گذشتہ بیانات میں آپ کے جن آراء و خیالات کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے ان سے آپ کے عام دینی جذبہ و رجحان پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے، آپ کو یہ محسوس کر کے بہت کوفت ہوتی تھی، کہ مسلمان عام طور سے عربی زبان سے ناواقف ہیں، یہی وہ جہل و ناواقفیت ہے، جس نے ان کی دینی کتابوں کے مطالب و معانی کو سمجھنے سے روکے رکھا ہے، اس مقصد کے پیش نظر شیخ عبدہ نے عربی زبان کے احیاء اور اس کی ترقی کو، بلحاظ دینی اصلاح کے وسیلہ کے اپنا مقصد اولین قرار دیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مسلمان کو عقائد ایمان سے واقف ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عقائد سنوسیہ کے سمجھنے پر قادر ہو اور وہ کم از کم بیس صفات باریتعالیٰ کو یاد رکھے!

لیکن آپ اس کے سخت مخالف تھے کہ علم الکلام کی کتابیں ہی دینی معرفت کا واحد ماخذ اور سرچشمہ ہوں، آپ کبھی اس پر رضامند نہ تھے کہ یہی دین کے افہام و تفہیم کے لئے اہم مصادر و ماخذات بھی ہوں، آپ دوسری سورۃ آیت نمبر ۲۱ کی تفسیر میں علماء دین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

"رسم و رواج کی پابندی کرنے والو اور علم و ادب کی کتابیں پڑھنے والو! اللہ کی کتاب نے راستبازوں اور دروغوں کے لئے میزان مقرر کر رکھی ہے تمہارا فریضہ ہے کہ تم اس سے نصیحت حاصل کرو اور اپنے مسلمان بھائیوں

کو اس کی نصیحت کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم عربی کی مبسوط اور طویل کتابیں پڑھ کر فقہی احکام کے سمجھنے میں سالہا سال صرف کر کے اور عقائد سنوسیہ و نسفیہ جیسی کتابوں پر اکتفا کر کے اللہ کی آیات اور کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کر لو کیونکہ ایمان کا سرچشمہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں ایمان پر جس قدر آیات و فروع ہیں ان کا شمار کرو اور عدل کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور میزان میں کسی قسم کی کمی نہ کرو"۔

آپ کے علم توحید پر مجمل بحث کرنے کا سبب یہ ہے کہ آپ کا اعتقاد یہ تھا کہ علم توحید میں طول طویل جدل اور مباحثہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام میں گروہ بندی اور تفرقہ لازمی پیدا ہو گئی، آپ اپنے گہرے دل سے اس بات کے متمنی و آرزومند تھے کہ تمام اختلافات و مناقشات کو دور کر کے ان کی بجائے ایک دینی وحدت پیدا کر دیں اکثر و بیشتر مقامات پر اپنے رسالۂ توحید میں اس جدل و نزاع پر نفرت و ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جس سے کوئی سود و بہبود نہیں۔

افعال عباد کے باب میں آپ مختصر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ انسان اپنے اختیاری افعال اور اکتساب سے بخوبی واقف ہے لیکن اس کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اللہ کی قدرت انسان کی قوت سے بڑھ کر ہے اور یہ قدرت انسان کے تمام اعمال پر محیط ہے، آخر میں آپ اس بحث کو اس طرح ختم کرتے ہیں:

"باقی رہی اس سے آگے کی یہ بحث کہ اللہ کے علم اور اس کے ارادہ کے احاطہ کی کھلم کھلا دلیلوں کے درمیان اور انسان کے اختیاری افعال کے بدیہی مشاہدوں کے مابین ہم آہنگی کی کیا صورت ہے؟ تو یہ تقدیری اسرار

ہیں جن میں ہم کو غور و خوض کرنے اور ایسے امور کا کھوج لگانے سے منع کیا گیا ہے جہاں تک ہماری عقلوں کی رسائی ناممکن ہے' ان میں ہر مذہب و ملت کے غلو پسند اشخاص خصوصاً بعض مسیحی اور مسلمان طبقہ کے لوگوں نے اس وادی خارزار میں قدم رکھا' مگر وہ طویل نزاع و جدال کے بعد اسی نقطہ پر پلٹ آئے جہاں سے انھوں نے ابتداء کی تھی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور ان کے اجزاء منتشر و پراگندہ ہو گئے"

یہی طریقہ آپ اُن لوگوں کے لئے اختیار کرتے ہیں' جن کے مابین اس موضوع میں کہ "اللہ تعالیٰ بندہ کی مصلحت کے لئے اپنے افعال میں رعایت کو واجب گردانتا ہے یا نہیں" طویل جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا' چنانچہ آپ ان کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ "چند بھائیوں نے ایک ہی منزل کی طرف کوچ کرنے کے لئے الگ الگ راستے اختیار کر لئے' جب وہ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آپس میں مڈبھیڑ ہوئے' تو ہر گروہ نے چلانا شروع کر دیا' ہر ایک نے گمان کیا کہ دوسرا فریق دشمن ہے جو اس کا تمام سرمایہ لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہے دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی' لڑائی کا بازار گرم ہو گیا' بلا حاصل اکثر و بیشتر ہلاک ہو گئے' جب صبح نمودار ہوئی اور چہروں کی شناخت کی گئی' تو باقی ماندہ اشخاص کی عقل بحال ہو گئی' اگر وہ پہلے ہی سے باہم متعارف ہو جاتے تو بہ تمام مل کر اپنے منتہائے مقصود تک پہنچنے کے لئے باہمی تعاون کرتے اور آپس میں بھائی بن کر لوزاید دی کے ذریعہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے"

جانچ پڑتال اور حزم و احتیاط میں محمد عبدہ کی شہرت' جو کبھی کبھی شک اور توقف کے مقام تک پہنچ گئی تھی' ان اہم اسباب میں سے تھی' جنھوں نے آپ کے علم الکلام کے مناقشات پر اثر ڈالا اور اس کو ایک معین صورت میں قرار دیا ایک

طرف آپ عقل کو دین میں ایک اولین مقام عطا کرتے ہیں جیسا کہ ہم بعد میں ملاحظہ کریں گے، تو دوسری طرف آپ کا خیال یہ ہے کہ حکمت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ انسانی عقل بعض حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی یہ حدود بعض مسائل میں انتہائی تنگ و کوتاہ ہیں۔

آپ کا یہ رجحان خاص طور پر صفات باریتعالیٰ کی بحث میں اجاگر نظر آتا ہے کیونکہ آپ نہایت شان کے ساتھ ایک حدیث کو ذکر کرکے بحث کرتے ہیں، اگرچہ یہ حدیث صحیح نہیں تاہم کتاب اللہ کے جملوں اور اس کی تفصیل سے حدیث کے مفہوم و معنی کی تائید ہوتی ہے، آنحضور اکرمؐ کا قول ہے " تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی ذاتہ فتہلکوا" تم اللہ کی مخلوق اور اس کی قدرت میں غور و فکر کرو، اس کی ذات میں سوچ بچار نہ کیا کرو کیونکہ تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے" پھر آپ اس حدیث کی تصدیق اور ذات الٰہی کی معرفت کے محال ہونے پر مشہور فلسفیانہ نظریہ جزء لایتجزا (ذرہ غیر انقسام پذیر) پر اعتماد کرتے ہوئے استدلال کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

"جب ہم انسانی عقل کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کے انتہائی کمال کا مقصد کائنات عالم کے بعض معین اشیاء کے عوارض و آثار تک پہنچنا ہے، جو انسانی ادراک میں، خواہ حس کے ذریعہ سے ہو یا وجدان و شعور کے لحاظ سے وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں پھر اس کے ذریعہ سے اشیاء کے وجود میں آنے کی معرفت، ان کے گوناگوں انواع کے لئے کلیات کی تحصیل اور بعض اصول و قواعد کا احاطہ کرنے کے لئے رسائی حاصل کرنا ہے لیکن کسی حقیقت کی کنہ اور اس کی گہرائی تک پہنچنا انسانی عقل کی قوت اور اس کی دسترس سے باہر ہے، کیونکہ مرکبات کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان مرکبات کے اجزاء

ترکیبی کی حقیقت اور گہرائی معلوم کی جائے اس تحقیق و انکشاف کا سلسلہ جزءِ بسیط تک منتہی ہوتا ہے، جس کی حقیقت کو معلوم کرنا ضروری ہے الحاصل انسانی عقل کا مقصد محض عوارض و آثار کا عرفان ہے،

" اس کو ہم ایک بدیہی مثال کے ذریعہ سے واضح کرتے ہیں، روشن ترین شے مثلاً روشنی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، ارباب فکر و نظر نے روشنی کے بیشمار احکام و اصول پیش کئے ہیں، ان تمام کو انھوں نے ایک خاص علم میں ترتیب دیا ہے، لیکن کوئی مبصر اور سائینسدان یہ نہیں معلوم کرسکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور نہ بذات خود روشنی کے معنی کی گہرائی تک پہنچ سکتا ہے، اس کو وہ اس قدر معلوم کرسکتا ہے جتنا کہ دو آنکھوں سے دیکھنے والا، پھر اللہ تعالیٰ نے انسانی حاجت کے لئے یہ ضروری قرار نہیں دیا کہ وہ اس کو کائنات کی کسی حقیقت میں اور اس کی گہرائی میں پہنچنے کی دعوت دیے بلکہ اس کی ضرورت صرف اس قدر ہے کہ وہ عوارض و خواص کو پہچانے، اگر انسان سلیم الطبع ہے تو اس کی عقل کی لذت اور ذوق وجدان صرف اسی میں ہے، کہ وہ ان خواص و آثار کی اس نسبت کو تلاش کرے، جو کسی ہستی کے ساتھ مخصوص ہے اور ان اصول و قواعد کا ادراک کرے جن پر ان نسبتوں اور علاقوں کی بنیاد ہے، اس لحاظ سے حقیقت کی گہری خاردار وادیوں میں الجھنا وقت کو رائیگاں کرنا اور غیر ضروری چیزوں میں قوت و توانائی کو خرچ کرنا ہے "

دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو انسان اپنے اردگرد کی قریب ترین چیزوں میں سے خود اپنی ذات میں ایک محدود علم رکھتا ہے کیونکہ " جب وہ اپنے

نفس کے بعض عوارض و خواص کو معلوم کرنا چاہے کہ، آیا وہ عرض ہے یا جوہر، کیا وہ جسم سے پہلے بنایا، اس کے بعد، کیا وہ جسم کے اندر ہے یا اس سے علیحدہ، تو ان تمام سوالات میں اُسے محسوس ہوگا کہ یہ ایسی صفات ہیں کہ انسانی عقل ان میں سے کسی ایک شے کو بھی ثابت نہیں کرسکتی جس پر تمام کا اتفاق ممکن ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا منتہائے مقصود یہ ہوگا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ وہ موجود ہے، زندہ ہے، اس کیلئے شعور ہے اور ارادہ، اس کے بعد جن ثابت حقائق کا احاطہ کرے گا، وہ تمام ان عوارض و آثار کا نتیجہ ہوں گے جہاں تک اس نے اپنے بدیہی مشاہدہ سے رسائی حاصل کی ہے، باقی رہا یہ امر کہ ان چیزوں کی گہرائی اور حقیقت کا معلوم کرنا یا اس کے بعض صفات کی کیفیت کا پتہ چلانا یہ انسان کے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے نزدیک تاریکی میں ہیں اور ان کے معلوم کرنے کا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔

"یہ حال ہے انسانی عقل کا اُن موجودات کے ساتھ، جو انسان کے درجہ میں برابر ہیں یا اس سے کم درجہ میں ہیں، بلکہ یہی حال اُن افعال و آثار کا بھی ہے جن کے بارے میں انسان خیال کرتا ہے کہ وہ اس سے صادر ہوتے ہیں مثلاً فکر، نقل و حرکت اور گویائی، جب انسان موجوداتِ عالم کی کنہ و حقیقت تک پہنچنے میں سرگرداں و حیراں ہے تو وجودِ اعلیٰ کے بارے میں اس کا کیا حال ہوگا؟ جب وہ غیر منتہی وجود ازلی و ابدی میں فکر و نظر صرف کرتا ہے تو اس کی دہشت و حیرت کی انتہا کیا ہوگی؟"

شیخ عبدہ نے اس موضوع میں اپنی بحث کو حدیث کی اس عبارت پر ختم کیا ہے جس کی طرف آپ نے پہلے باب میں اشارہ کیا ہے، آپ ان منافع و فوائد پر بحث کرنے کے بعد، جو اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کرنے سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

"خالق کائنات کی ذات میں اس حیثیت سے فکر و غور کرنا کہ اسکی حقیقت وکنہ کو تلاش کیا جائے تو وہ انسانی عقل وبصیرت کے دائرہ اقتدار سے بیرون ہے کیونکہ وجود خالق اور وجود کائنات کے مابین کوئی نسبت ہی نہیں، نیز ذات باریتعالیٰ کا تجزیہ محال ہے، دوسری طرف ایسی اشیاء کے حصول کی کوشش کرنا، جو انسانی قوت و طاقت سے باہر ہے، تو یہ نہ صرف فعل عبث ہے بلکہ اس میں ہلاکت کا بھی اندیشہ ہے، عبث اس لئے ہے کہ اس نے غیر مدرک چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، موجب ہلاکت اس لئے کہ اس قسم کا خیال اعتقاد کو بگاڑنے کا موجب ہوتا ہے کیونکہ اس سے ایسی تحدید لازم آتی ہے جس کو کوئی روا نہیں رکھتا اور ایسا حصر ہے جو صحیح نہیں"

پھر شیخ عبدہ صفات کے باب میں اس طرح فرماتے ہیں:

"صفات کے متعلق ہمیں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف ہے اس سے بڑھکر جو چیز ہوگی، اس کا علم اللہ ہی کو ہے، ہماری عقلیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں، اسی لئے قرآن مجید نے اور نہ سابقہ کتابوں نے محض مصنوعات خداوندی اور مقدرات ازدی میں توجہ کرنے کو پیش کیا ہے، تاکہ ان کے ذریعہ وجود صانع اور اس کے صفات کمالیہ کی معرفت تک پہنچا جائے، لیکن یہ فکر و غور کرنا کہ ذات باری تعالیٰ ان صفات سے کس طرح متصف ہے، ان کی نوعیت و حقیقت کیا ہے، تو یہ ہماری بحث و جستجو سے باہر ہے ...."

"صفات کا ذات پر زاید ہونا، کلام کا ایسی صفت ہونا، جو آسمانی کتابوں کے معانی کے مشمولہ علم سے جداگانہ ہو اور سمع و بصر کا علم مسموعات و مبصرات

بغیر ہونا اسی قسم کے دوسرے وہ حالات جن میں مختلف زوایائے نظر اور گوناگوں مذاہب ہو گئے ہیں یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں غور و خوض کرنا جائز نہیں، کیونکہ انسانی عقول وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں صحف سماویہ میں مذکورہ الفاظ کے ذریعہ ان کی کسی چیز پر استدلال کرنا عقل کی کمزوری اور شرعی خود فریبی ہے کیونکہ کسی زبان میں حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، اگر وہ حقیقت میں محصور ہوا کرتی تو زبان میں موجودات کی گہرائی کو ملحوظ نہیں رکھتی، یہ فلسفیانہ مذاہب ہیں اگر ان جیسے اشخاص ان میں گمراہ نہ ہوتے تو دوسرا فریق کس طرح ان کی طرف رہنمائی حاصل کرتا، جب ہماری عقلیں کسی شئے تک نہیں پہنچتی ہیں تو ہم کو وہیں اپنی سپر ڈال دینی چاہئے اور اللہ سے یہ التجا کرنا چاہئے کہ وہ اللہ پر اور ہمارے پیش رو ابنیاء پر ایمان لانے والے کو بخش دے"

شیخ محمد عبدہ قضا و قدر پر بحث کرنے میں بھی کافی احتیاط برتتے ہیں۔ ہم اس سے پہلے اس بارے میں آپ کی رائے کو بیان کر چکے ہیں کہ یہ موضوع ایک طویل معرکہ آرائی کا مقتضی ہے، جس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں، اس سے اس امر کا بھی بظاہر پتہ چلتا ہے کہ آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ اس مسئلہ میں صحیح دینی رجحان فکر اس میں غور و خوض کرنے سے باز رکھتا ہے اسی لئے ہم آپ کو سورۂ عصر کی تفسیر (ص۱۳) میں یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں:

"اس قسم کے مسئلہ میں غور و خوض کرنے کا جذبہ بینائی کی کمزوری یا فقدان بصر کی ایک قسم ہے"

آپ ان احکام کو جن کی اتباع ضروری ہے، بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"میں اس مسئلہ میں اس سے زیادہ بحث کرنا پسند نہیں کرتا ورنہ میں گروہ صابرین میں شمار نہ ہوں گا اور قضا و قدر کے اعمال میں اور لوگوں کے ساتھ جنہوں نے غوطہ زنی کی غلطاں و پیچاں ہو جاؤں گا"

محمد عبدہ کے فلسفہ کا موقف

شیخ محمد عبدہ کے دینی آراء و افکار کی ممتاز خصوصیات آپ کے فلسفیانہ موقف میں نہایت واضح طور پر نمایاں ہیں، آپ کے اس فلسفیانہ موقف پر عملی مقاصد کا بہت گہرا اثر ہے، مورخین نے مشاہدہ کیا ہے کہ آپ کے عملی مقاصد ہی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کا دامن فکر منطق کی خارزار وادی سے نہیں الجھا یا آپ نے فلسفہ کے کسی شعبہ میں بھی منظم علمی طور پر مصروف نہ ہوئے،

درحقیقت آپ نے کوئی ایسا گرانقدر اثر نہیں چھوڑا، جس کی بنا پر ہم آپ کو آپ کے طریقۂ بحث اور آپ کے طرز فکر کے مشمولات میں خالص فلسفی شمار کر سکیں، لیکن آپ کے رسالہ "واردات" میں، جس کو آپ نے اپنے پہلے دور میں تصنیف کیا تھا فلسفہ کے بہت سے مباحث نظر آتے ہیں، محمد رشید رضا کہتے ہیں "اس رسالہ میں آپ علم کلام کے حقائق میں الٰہی واردات کو تحریر کرتے ہیں اور عرفان صوفیا اور براہین فلاسفہ کے مابین ترکیب و آمیزش کی کوشش کرتے ہیں"

اس کے علاوہ اس مختصر رسالہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ عبدہ نے رسالہ توحید کے پہلے صفحات کے سوائے فلاسفہ کا راستہ اختیار نہیں کیا، بہرحال ہم یہاں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ نے منطق کے ساتھ اہتمام کیا ہے، چنانچہ اس فن کی ایک گراں قدر اور دشوار گذار کتاب پر حاشیہ بھی لکھا۔

یہ بھی اشارہ کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ کے ابن خلدون پر

محاضرات ہیں اور وحدۃ الوجود میں ایک رسالہ ہے، جو آپ کے بعد شائع نہ ہو سکے
ان تمام آثار و تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو فلسفہ سے کافی معرفت تھی جس
میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ ہوگا کہ آپ نے نظام
فلسفہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن اگر ہم یہ تسلیم کریں تو بیجا نہ ہوگا کہ آپ نے
فلسفہ کے مطالعہ و تحقیق میں کوئی منظم علمی طریقہ اختیار نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو فلسفہ سے اس لئے شغف نہ ہوا کہ وہ خامیوں اور
کمزوریوں سے خالی نہیں، آپ کو فلسفہ سے اس لئے نفرت تھی کہ اس سے دینی مدافعت
کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا، ہورتن نے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ فلسفہ کے ساتھ شغف
اور دلچسپی آپ کے نزدیک دین پر بغاوت کرنے کے مترادف ہے، وہاں اسی رائے
کو ثابت کیا ہے:

آپ نے جہاں صفات باریتعالی پر بحث کی ہے۔ وہاں یہی طرز فکر آشکار ہے
آپ کا مسلک یہ ہے کہ صفات باری تعالی انسانی عقل کی حدود سے ماورا ہیں
فلاسفہ بھی بذات خود ان صفات کی کنہ و حقیقت کو معلوم کرنے کی قدرت نہیں
رکھتے، باوجودیکہ آپ فلاسفہ کی روش پر اس موضوع میں اعتراض کرتے ہیں لیکن
اس کے ساتھ ساتھ حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کو محال و ناممکن ثابت کرنے کے
لئے فلسفیانہ نظریہ ہی سے دلیل پیش کرتے ہیں اور یہ حقیقت ظاہر کرتے ہیں کہ
اگر ذات خداوندی تک پہنچنے کا ارادہ فلسفیانہ طریقوں سے کیا جائے تو وہ طریقے
منہدم ہو جاتے ہیں،

لیکن اگر آپ کی حقیقی رائے یہ ہو کہ فلسفہ کے ساتھ انہماک دینی بغاوت
کے مشابہ ہے، تو آپ کی اس جرات و نشاط کی تعبیر و تعلیل ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت
مشکل ہے کہ کس طرح آپ نے خالص فلسفیانہ رنگ کا رسالہ تصنیف کیا،

ف بہت دشوار ہے جو آپ کے اولین عہد میں اور خصوصاً جمال الدین سے آپ کے تعلق و اتصال کے زمانے میں
تھا یا ہمارے لئے۔

محمد عبدہ اور جمال الدین کے بارے میں نگران کاروں نے شک و شبہ کیا اور ان کی دشمنی و زیادتی پر کمربستہ ہو گئے، اس کا ایک سبب یہ تھا کہ فلسفہ کے احیاء یا کم از کم اس کے کسی شعبہ کی تجدید و ارتقا کا رجحان ان دونوں میں پایا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کے عقیدت مندوں اور آپ کے ساتھ حیرت و استعجاب کرنے والوں نے آپ کو اس دور کے فلسفہ کا مؤید و مددگار شمار کیا۔

اس طرح آپ کو ہم آپ کے ان اولین مقالات میں جن کو آپ نے اہرام میں "علوم عقلیہ اور علوم عصریہ کی طرف دعوت" کے نام سے نشر کیا، اس حیثیت میں جلوہ گر دیکھتے ہیں کہ منطق اور فلسفہ پر محاسبوں اور نگران کاروں نے جو اعتراضات پیش کئے تھے آپ ان کی مدافعت کرتے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"منطقی علوم اس لئے وضع کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے برہانوں اور دلیلوں کو درست و استوار کیا جائے، افکار و آراء کو صحیح پیمانہ پر جانچا اور پرکھا جائے، یہ بیان کیا جائے کہ بیان کے بعد مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لئے کون سے مقدمات کو ترکیب دیا جائے، کونسا مقدمہ صحیح ہے جس کو بیان میں پیش کیا جائے، اور کونسا مقدمہ قابل تردید ہے، یہ علم اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو تمام علوم کے لئے زینہ قرار دیا جائے، ظالم و جاہل اور کندۂ ناتراش ہی اس علم کی طلب سے روگردانی کرتا ہے، باقی رہا علم کلام تو اس کی غرض و غایت محض یہ ہے کہ اس کو عقلی قطعی دلیلوں کے ذریعہ مذہبی اصول و قواعد کو محکم اور استوار کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ان علوم میں مشق و مزاولت اور مہارت رکھنے والے شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان برہانوں اور دلیلوں کے ذریعہ مطالب کے نور کا اقتباس کرے اس کے ذریعہ تلاش و

جستجو اور بحث وتحقیق کے دلدادگان کی تشفی کی جائے اور مخالفوں اور منکروں کی تردید کی جائے،

یہ کس قدر تعجب کی بات ہوگی اگر ہم اپنی عنان فکر و توجہ کو دلائل و براہین کی درستگی و استواری اور حقائق و واقعات کی آگاہی اور ان کی حد بندی کی طرف موڑ دیں؟ اس کے علاوہ ہم اپنی فکر و نظر کی توانائی کو آخر کس میں صرف کریں؟ کیونکہ اگر ہم اصل جادۂ فکر سے بھٹک جائیں اور عقل و بصیرت کی کسوٹی ہماری نظر سے اوجھل ہو جائے تو کیا سوائے کسی دلیل و رہبر کے ہم اس کو پہچان سکتے ہیں؟"

شیخ محمد عبدہ نے اپنے رسالہ توحید کے مقدمہ میں اسلامی عقائد کے انقلاب و تغیر کو مختصر مگر بلیغ تاریخی واقعات کی روشنی میں لکھا ہے، جو جدید ناقدانہ نہج کی رو سے علماء اسلام کی تحریروں کے مابین ممتاز ہے، اس مقدمہ میں آپ نے فلسفہ کے عہد بعہد کے انقلاب و تغیر سے جو بحث کی ہے، اس میں آپ کی رائے پورے طور پر واضح اور نمایاں ہے نیز ہمارے روبرو آپ کی فکر و بصیرت کے عام رجحان کی تصویر کھنچ جاتی ہے، چونکہ آپ کی رائے اس موضوع میں نہایت اہم ہے اس لئے ہم یہاں اس کو پیش کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں:

"فلسفیانہ مذاہب کے آراء و نظریات فکر محض کا نتیجہ تھے، اہل نظر فلاسفہ کا منتہائے مقصود تحصیل علم اور نامعلوم اشیاء کا انکشاف یا معقول حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے جذبہ عقل کی تکمیل کرنا تھا، ان کے بس کی بات تھی کہ وہ اپنے مطالب میں جہاں تک چاہیں پہنچ جائیں، جمہور اہل دین ان کو اپنی حمایت میں پناہ دیتے تھے، ان کے لئے مطلق آزادی رائے دے دی تھی کہ وہ اپنے عقول کی لذت کی تحصیل سے

محفوظ ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو اپنے قول "خلق لکم مافی الارض جمیعاً" میں عقول و افکار کے لئے مباح قرار دیا ہے اس سے کائنات کے سربستہ رازوں کا انکشاف کر کے صنعتی فائدہ پہنچائیں اور ارکانِ نظامِ بشری کو تقویت دیں، کیونکہ اس آیت میں کسی ظاہری و باطنی چیز کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا، مسلمانوں کا کوئی عقلمند شخص ان کی راہ میں روڑے نہیں اٹکا سکتا کیوں کہ قرآن نے ان کی شان بلند کی ہے اور اس کو ایسے مقام پر رکھا ہے کہ سعادت کا معاملہ اسی حد تک پہنچتا ہے حق و باطل اور نفع و نقصان کے درمیان تمیز کا انحصار اسی پر ہے نیز آنحضرت کا یہ قول بھی درست ہے "انتم اعلم بشئون دنیاکم" یعنی تم اپنے دنیوی معاملات کو خوب جانتے ہو نیز غزوۂ بدر میں آنحضرت نے تجربہ کار اشخاص کے تجربات اور صحیح آراء کو قبول فرما کر ہمارے لئے ایک نمونہ پیش کیا۔

لیکن بادی النظر میں دو چیزیں ان کی اکثریت پر چھا گئیں ایک فلاسفۂ یونان خصوصاً ارسطو و افلاطون کی طرف سے آئی ہوئی ہر رطب و یابس چیز پر خوش عقیدگی اور ان کی تقلید میں لذت یابی، دوسری چیز روح عصری کی کارکردگی، یہ دونوں میں حد درجہ بدشگون تھی، ان فلاسفہ نے ان منازعات میں گھر کر لیا جو دین کے اہل نظر کے درمیان برپا تھے انھوں نے اپنے علوم سے ان کی ٹکسالی عقائد کے حامیوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی، امام غزالی اور آپ کے پیروکاروں کا ظہور ہوا، انھوں نے فلاسفہ و حکماء کی ان تمام چیزوں کی گرفت کی جو الٰہیات سے متعلق اور امور عامہ سے متصل تھے، یا جواہر و اعراض

کے احکام سے ملحق اور مادہ اور اجسام کی ترکیب سے متعلق ان کے مذاہب، نظریات پر اور علم کلام سے شغف رکھنے والوں کے ان تمام مظنونات و خیالات پر جو قدرے دینی بنیادوں سے مس رکھتے، ہدف اعتراض بنایا اور ان پر سخت تنقیدیں کیں، متاخرین نے ان سے اثر پذیری میں بہت غلو برتا یہاں تک کہ وہ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے، ان کی قدر و منزلت دلوں میں کم ہوگئی، عوام نے ان کو ٹھکرا دیا، خواص نے ان کی طرف توجہ نہ کی، اور زمانے نے اُن کی سعی و محنت کو جس کا عالم اسلامی منتظر تھا، بیکار کر دیا۔

کتب متاخرین میں مسائل کلامیہ کو فلسفہ کے مذاہب و نظریات کے ساتھ خلط ملط کرنے کا یہی بڑا سبب تھا، جیسا کہ ہم اس آمیزش کو بیضاوی اور عضد وغیرہ کی کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ ان میں مختلف نظریات کو جمع کرکے ان تمام کو ایک علم بنا دیا گیا ان کے مقدمات و مباحث ہی کی نظری تقلید پر اکتفا کیا گیا، علم کی پیشقدمی رک گئی

مختلف نسلوں کے افراد کی طرف سے ملک گیری کے فتنے برپا ہوئے جہلا کے ہاتھوں میں زمام حکومت آگئی، انھوں نے علم نظری کے باقیماندہ آثار کو جو دین اسلامی کے سرچشموں سے ابھرے تھے، مٹا دیا، رہروان مسلک ہدیٰ راستہ کترا گئے، متقدمین کی کتابوں میں دیکھنے والوں کے لئے لفظی بحثیں، اسلوب پر جدل و مناقشہ کے سوا اور کیا باقی رہ گیا، لیکن معدودے چند ایسی کتابیں رہ گئیں جن میں کمزوری کے آثار نمایاں ہوئے، پھر مسلمانوں کے درمیان جاہل سیاسی اشخاص کی زیر حمایت عقلی جنگیں شروع ہوئیں ایک جماعت آئی، جس نے اپنے نزدیک ایسے نظریات اور خیالات گھڑ لئے جن کی علم کبھی اجازت نہیں دیتا انھوں نے ایسے احکام وضع کئے

جن کو اسلام کبھی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے ناقص معلومات کے موئدین پالئے اور دین کے سرچشموں سے کوسوں دور رہنے والے اشخاص کو اپنا محدود معاون بنا لیا، اس طرح انھوں نے عقلی قوتوں کو ان کے اصل مقام سے برگشتہ کر دیا، اور گمراہی پھیلانے اور کفر کا فتویٰ دینے کا فیصلہ صادر کیا، اس میں یہاں تک غلو برتا کہ انھوں نے علم و حکمت اور دین کے درمیان تناقض اور عداوت کے دعوے میں گذشتہ قوموں کی تقلید کی، اور جب ان کی زبانیں جھوٹ کا اچھی طرح تختۂ مشق بن چکیں تو کہنے لگے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، یہ کفر ہے اور یہ اسلام، حالانکہ دین ان کے توہمات سے ماورا، اور اللہ جل شانہ ان کے مظنونات اور صفات سے مافوق و برتر ہے، لیکن اس طویل خبط اور کثرت خلط کے بعد عوام الناس کے عقائد کو کیا آفت پیش آئی اور ان کے کردار اور ان کی سیرت کا چشمہ کس طرح رہا، اس کا جواب شر و فساد کے طوفان اور نادانی و جہل کے سیلاب کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے؟

یہ اس علم کی مجمل تاریخ ہے اس سے بخوبی پتہ چلے گا کہ یہ علم کس طرح قرآن مجید کے اصولوں پر تعمیر کیا گیا اور کیونکر انجام کار دریا برد کر دینے والے ہاتھوں کے حوالے لگ کر دریا برد ہو گیا، یہاں تک کہ وہ لوگ اس کے اعتدال کے دائرہ سے نکل گئے اور اس کی حدود سے کوسوں دور ہو گئے۔"

اس تاریخی بیان کا خلاصہ ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ محمد عبدہ کا نظریہ یہ تھا کہ صحیح میدان جس میں ہم فلسفہ کی عظیم الشان خدمات انجام دے سکتے ہیں یہ ہے کہ ہم مظاہر طبیعت اور آثار قدرت میں بحث و جستجو کریں، یا آپ کے قول کے مطابق

"کائنات کی گہرائیوں یا اس کے پوشیدہ اسرار کا انکشاف ہے" آپ دوسرے مقام میں فلسفہ کو ایک وسیع جولانگاہ تصور کرتے ہیں اور اس کو انسانی طبیعت کے حقائق اور انسانی تاریخ کا ایک وسیع موضوع قرار دیتے ہیں ان مسائل کے مطالعہ سے بعض علمی منافع خاص کر صناعات کی ترقی اور نظام اجتماعی کے ارکان کے استحکام میں متحقق ہوتے ہیں ان علمی منافع کے بردئے کار نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے فلاسفہ وحکماء نے دینی منازعات میں اپنے آپ کو محصور کر دیا اور اپنے علوم وفنون کو دین کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔

محمد رشید رضا نے اس بیان پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "کہ اگر فلاسفہ اپنے فنون کو دین سے آمیز نہ کرتے اور اپنے آپ کو دینی اختلافات ومناقشات میں مصروف نہ کرتے بلکہ بحث ومباحثہ کو چھوڑ دیتے تو ان کے علوم وفنون میں نمایاں ترقی ہوتی اور اس کے ذریعہ صناعات کی رفتار تیز اور عمرانی ذرائع وسیع ہو جاتے۔"

پھر آپ فرماتے ہیں کہ محمد عبدہ کا خیال یہ تھا کہ فلسفہ اور دنیوی علوم کو مسائل دینیہ سے آمیز نہ کیا جائے۔

یہ اسی حد تک نہ تھا کیونکہ محمد عبدہ کا اعتقاد یہ تھا کہ دین اور فلسفہ میں باہمی عداوت ہے۔ اکثر اوقات بحث کا خاتمہ اس امر پر ہوتا کہ دین اور فلسفہ میں ہم آہنگی اور موافقت ہے، دوسرے مقامات میں اس کی تردید میں آپ نے تفصیل سے کام لیا،

اس کے علاوہ آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ دین ودانش کو ایک دوسرے سے متمیز ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ دین کے میدان کے چند معینہ حدود ہیں جس سے عقل متجاوز نہیں ہو سکتی، خصوصاً ذات باری تعالیٰ سے متعلقہ امور میں کسی قسم کی زیادتی روا نہیں اس قسم کے حدود ہم عالم طبعی میں نہیں پاتے۔

علاوہ بریں دینی اور مذہبی تعصب نے بحث و تحقیق میں استقلال اور حریت کی روح کا گلا گھونٹ دیا، جیسا کہ یہ تاریخ اسلام میں ظاہر ہوا۔

اگر محمد عبدہ فلسفہ کی ترقی کی راہ میں مرتب علمی روش اختیار نہ کر سکے تو اس کا کچھ سبب یہ تھا کہ آپ اہم حدود پر چلنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ جہاں آپ کا نفس توقف کر گیا اور وہ نہضت دینیہ کا احیا ہے۔

چھٹا باب
معتقداتِ محمد عبدہ

موقفِ دانش وحکمت

دین ودانش

یہاں دو معرکۃ الآراء مسائل ہیں، جن کا ذکر گذشتہ بیان میں آچکا ہے، لیکن اس مقام پر ان کی تھوڑی بہت توضیح وتشریح ضروری ہے، تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ محمد عبدہ کے نزدیک اسلام کا کیا تصور ہے اور آپ نے "جہان نو" کے روبرو اپنا کیا عمومی نظریہ پیش کیا؟

وہ دو مسائل حسب ذیل ہیں :-

پہلا ـــــ دین ودانش یا خصوصی طور پر عقل ودانش اور دین اسلام کے درمیان کیا ربط وتعلق ہے، جس کے وجود کا تصور کیا جا سکے؟

دوسرا ـــــ دین وحکمت کے مابین کیا علاقہ ہے؟

چونکہ ان دونوں مسئلوں میں آپ کی جو رائے ہے وہ مزاج دین اور مزاج علم وحکمت کی رائے کو بھی شامل ہے اس لئے ہمارا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ ہم اس سلسلہ میں آپ کی تحریروں سے دین ودانش کے موضوع کے تحت اکثر وبیشتر اقتباس کریں،

آپ نے مجمل طور پر دین ودانش کے درمیان کے تعلقات کو اپنے اس بیان

میں اُجاگر کیا ہے، جہاں آپ نے کوشش کی ہے کہ اسلام کو ایسے رنگ میں نمایاں کیا جائے، جو عوام کے درمیان پھیل سکے، یہ اسلامی رنگ ہر اُس آمیزش سے پاک اور خالص ہوگا، جو اس میں گذشتہ صدیوں میں دخل پا چکی ہے، نیز اس میں اختلافی مسائل کو جگہ نہ ہوگی آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اسلام کے بارے میں ایسا تصور کرنا واجبی ہے کہ وہ۔

"انسانی عقل کی ایک ایسی میزان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے تاکہ اس میں کچھ کمی بیشی نہ ہو اور ہر قسم کے خبط و خلط سے پاک ہو"

اس بنا پر ہمارے لئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام محمد عبدہ کی نظر میں عقل کی تکمیل کرتا اور اس کو استوار و پائدار کرتا ہے، نیز یہ کہ عقل و دانش دینی امور و معاملات میں حکم و منصف کا درجہ رکھتی ہے آپ کہتے ہیں:۔

"عقل و دانش بغیر کسی مرشد الٰہی کے بذات خود ایسی منزل تک نہیں پہنچ سکتی جس میں قوموں کی سعادت مضمر ہے جیسا کہ حیوان محض حاسّہ بصر سے بذات خود تمام محسوسات کا ادراک نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر وسائل و ذرائع مثلاً مسموعات کے ادراک کے لئے قوت سماعت کی ضرورت ہے یہی حال دین کا ہے، یہ ایک عمومی حاسّہ ہے اُن سعادتوں کے وسائل کے انکشاف کا، جو عقل بشری پر شبتہ ہوتے ہیں، عقل ہی اس قوت مدرکہ کی پہچان اور اس کے الٹ پھیر میں حکمران ہے، اسی کے ذریعہ مکشوفہ معتقدات اور حدود و اعمال کا یقین و اذعان حاصل ہوتا ہے عقل کے ان حقوق کا کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے حالانکہ عقل ہی ان عقائد و اعمال کے دلائل میں فکر و نظر کرتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ اُن کو پہچان سکے اور یہ معلوم کر سکے کہ یہ تمام اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں"۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہر چیز سے قبل عقل و دانش پر اعتماد کرتا ہے اور اسی سے سب سے پہلے اپیل کرتا ہے، قرآن مجید نے بھی عقل کی شان

کو دوبالا کیا ہے اور اس کو ایسے مقام پر رکھا ہے، جہاں تک سعادت کا معاملہ حق و باطل کے درمیان تمیز اور ضرر و نفع اور سود و زیاں کے مابین تفریق کا سلسلہ پہنچتا ہے"

اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان عقل کے ذریعہ معرفت خداوندی تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہے اسلام خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کے اعتقاد کے لئے انسانی عقل کو بیدار و برانگیختہ کرنے اور اس کو کائنات میں فکر و نظر صرف کرنے، قیاسِ صحیح کو استعمال کرنے اور کائنات عالم کے نظام، اس کی ترتیب اور اسباب و مسببات کے ملاپ کی طرف رجوع کرنے میں توجہ کرنے کیلئے دعوت دیتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہو، کہ کائنات کے لئے ایک واجب الوجود صانع ہے، جو علم و حکمت والا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، نیز یہ کہ یہ صانع تنہا اور اکیلا ہے کیونکہ تمام جہان کا نظام ایک وحدت میں مربوط ہے، اسلام نے عقل بشری کو پوری آزادی دی کہ وہ فطری قوانین کی راہ میں تگ و دو کرے، اس نے عقل انسانی کو مخلوقات میں نظر کرنے اور کائنات کی ان نشانیوں پر فکر و غور کرنے کے لئے برانگیختہ کیا، جو اللہ کی قوت اور اس کی حکمت پر دلالت کرتی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ معرفت الٰہی تک پہنچے"

عقل کی نسبت محمد عبدہ کا یہ موقف فکر و نظر کے لئے عموماً اور بحث و تحقیق کے لئے خصوصاً ایک وسیع جولان گاہ ہے، مخلوقاتِ عالم میں فکر و غور کرنے کے لئے دینی دعوت نہ کو کسی حد و غایت پر محدود رہی اور نہ کسی شرط سے مشروط کیونکہ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ ہر نشانہ اس نظر صفات خداوندی تک پہنچانے والی ہے نہ تو تجرید میں کوئی غلو ہو گا اور نہ تحدید کے نزدیک،

چونکہ وجودِ خدا کا اعتقاد ایمان کا اولین رکن ہے، اور اس اعتقاد کا دار و مدار عقل و دانش پر ہے اس لئے اسلام میں عقل کی اہمیت کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں، اس نظریہ کو شیخ عبدہ اس طرح پُر زور الفاظ میں ادا کرتے ہیں :-

"اسلام اللہ پر ایمان لانے اور اس کی وحدانیت کے اس مطالبہ و دعوت میں سوائے دلیل عقلی اور اس فکر انسانی کے، جو فطری نظام پر جاری و ساری ہے، کسی اور چیز پر اعتماد نہیں کرتا، اس لحاظ سے کوئی معجزہ تمھیں حیرت میں نہ ڈالے، غیر معتاد اطوار و حوادث تمھاری آنکھ پر پردہ نہ ڈال دیں، کوئی آسمانی کڑک تمھاری زبان کو گونگی نہ کر دے اور کسی الٰہی تجلی کے ذریعہ تمھاری فکری حرکت موقوف نہ ہو جائے، مسلمانوں کا، بجز معدودے چند کے، جن کی رائے قابلِ اعتنا نہیں ہے، اس امر پر اتفاق ہے کہ اللہ کا اعتقاد نبوتوں کے اعتقاد پر مقدم ہے، رسولوں پر ایمان لانا ممکن ہے تاوقتیکہ پہلے اللہ پر ایمان نہ لایا جائے، محض رسولوں کی بات پر اور آسمانی کتابوں کے کہنے سے اللہ پر ایمان لانا صحیح نہیں اس لئے کہ یہ کسی طرح قرین عقل و قیاس نہیں کہ تم اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تاوقتیکہ تم اس سے پہلے اللہ کے وجود کا اقرار اور اس کی وحدانیت کی تصدیق نہ کر لو نیز یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے کوئی کتاب اتاری ہو یا کوئی رسول بھیجا ہو"

اس بنا پر عقل شیخ عبدہ کے نزدیک نبوت کو صحیح قرار دینے کے لئے حکم اور منصف ہے، یہاں ایک اور چیز ہے جس کی شان و عظمت کسی طرح کم نہیں وہ یہ کہ آپ نے عقل کو آسمانی کتاب کے سمجھنے خود مختار حکمراں قرار دیا ہے،

دوسرا اصول جس کو اسلام تسلیم کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب عقل و نقل میں تعارض واقع ہو تو عقل کو نقل پر مقدم رکھا جائے، اسی نظریہ کی تشریح آپ اپنے اس

بیان کرتے ہیں :

"تمام اہل ملت کا، بجز چند افراد کے، جو ناقابل توجہ ہیں، اس بات پر اتفاق ہے کہ جب عقل و نقل کے مابین تعارض رونما ہو جائے، تو وہی بیان قابل تصدیق ہوگا، جو عقل کی روشنی میں حاصل کیا جائے، نقل میں دو طریقے باقی رہ جائیں گے (۱) بیان منقولہ کی صحت کو تسلیم کرنا اس اعتراف کے ساتھ کہ عقل انسانی اس کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز ہے اور معاملہ اللہ کے علم کے تفویض کرنا، (۲) قوانین لغت کی پابندی و نگرانی کرتے ہوئے نقل کی تاویل کرنا، یہاں تک کہ اس کے معنی عقل کے ثابت کردہ معنی کے ہم آہنگ ہوں"۔

آپ نے رسالہ توحید میں جہاں نبوت پر بحث کی ہے، وہاں بعینہ اپنے مذکورہ بالا نظریہ کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ثابت کیا ہے، غالباً یہ کم و بیش اختلاف نبوت کی بحث میں آپ کی محتاط عبارت آرائی کی حاجت کے شعور کی طرف راجع ہے کیونکہ نبوت فقط آسمانی کتاب کے نص سے مستند ہے، حالانکہ شریعت نے نص کتاب کے علاوہ دیگر سرچشموں سے بھی استدلال کیا ہے،

محمد عبدہ فرماتے ہیں کہ عقل کا بس اتنا کام ہے کہ وہ نبی کی رسالت کو صحیح ماننے کے بعد نبی کی تمام لائی ہوئی چیزوں کی بھی تصدیق کرے، اگرچہ وہ نبی کی کتاب کی بعض چیزوں کی گہرائی اور ان کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے عقل پر یہ فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نبی کی پیش کردہ محال چیزوں کو بھی قبول کرے جن کا نتیجہ مثلاً دو نقیضوں کے درمیان یا دو متضاد اشیاء کے درمیان ایک ہی موضوع اور ایک ہی آن میں جمع کرنا ہوگا کیونکہ اس قسم کی چیزوں کو پیش کرنے سے انبیاء پاک ہیں اگر ان کی زبانی بعض ایسی چیزیں صادر ہو جائیں جن کے ظاہر سے نبی کے متعلق وہم و گمان ہونے لگے تو عقل

کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھے کہ یہاں ظاہری بیان مقصود نہیں، اس کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ وہ یا تو پیش کرنے والے کے بقیہ متشابہ کلام کی روشنی میں تاویل کرے یا اس کا معاملہ اللہ کے علم کے سپرد کر دے"

جب محمد عبدہ نے اس نظریہ کو تسلیم کرلیا اور اسلام کی نظر میں عقل کی یہ تمام شان و منزلت ٹھہرائی، تو درحقیقت ایک ایسا راستہ اختیار کیا، جو اس راہ کے خلاف تھا جس پر صدیوں سے مسلمان چل رہے تھے، یعنی مسلمان تقلید کے قائل اور بلا مناقشہ واعتراض بقول عقائد میں روایت سلف کو حاصل کر لیتے تھے یہ فطری امر تھا کہ عوام الناس تقلید کو اختیار کرلیں، کیونکہ وہ عقلی طریقہ سے عقائد کو سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، علماء نے بھی دینی امور اور علمی مسائل میں یہی طریقہ پسند کیا، جیسا کہ ہم اس سے پیشتر ملاحظہ کر چکے ہیں، محمد عبدہ نے اسی روح کا شدت سے مقابلہ کیا، اور اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے اس سے نبرد آزمائی شروع کر دی، پھر اپنی زندگی بھر اس کی برابر مقاومت کرتے رہے فرماتے ہیں:

"میں نے تقلید کی زنجیروں سے فکر و فہم کو آزاد کرانے کے لئے صدائے احتجاج بلند کی"

"اسلام نے ببانگ دہل اس کا اعلان کیا ہے کہ انسان اس واسطے نہیں پیدا کیا گیا کہ اس کو لگام کے ذریعہ کھینچا اور چلایا جائے بلکہ اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ علم و حکمت کی روشنی میں، کائنات کی نشانیوں کی رہبری میں اور حادثات روزگار کی رہنمائی میں ہدایت حاصل کرتا رہے، علماء تو غلطیوں سے آگاہ کرنے والے، رشد و ہدایت کی طرف بلانے والے اور بحث کے طریقوں تک رہبری کرنے والے ہیں"

آیت ۲۴۳ سورۃ ۲ اس ارشاد خداوندی (کذالک یبین اللہ لکم آیاتہ لعلکم تعقلون) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قرآنی ہدایت کی تقلید کرنے والے کہاں ہیں؟ قرآن تو ہماری عقل کو بیدار

کرتا، ہمیں فکر و بصیرت کی دعوت دیتا اور اندھی تقلید سے روکتا ہے لیکن اہل تقلید ہمیں یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم ان کے اور ان کے ابنائے جنس کی باتوں پر اندھے اور گونگے بن کر اپنا سر تسلیم خم کر دیں، جو کوئی ہم میں سے قرآن عزیز سے رہبری حاصل کرنے کا قصد اور آثار سنت کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ لوگ سختی سے اس کی نگرانی کرتے ہیں یہ شخص کفر و بدعت کے فتوے سے بھی غالباً نہیں بچتا، ان لوگوں کا زعم ہے کہ وہ اپنی اس روش سے دین کی حفاظت کر رہے ہیں، اسلام کو ان ہی چیزوں نے سخت نقصان پہنچایا ہے اگر ہم ان تقلیدی زنجیروں میں جکڑے رہیں، تو کوئی بھی اس دین پر باقی نہ رہے گا، ہم لوگوں کو دیکھ رہے ہیں، کہ چپکے سے کھسک رہے ہیں، اگر ہم اس عقل و فکر کی روشنی کی طرف رجوع کریں، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیتوں میں اشارہ کیا ہے، تو ہمیں توقع ہے کہ ہم دین کو زندہ کریں گے، عقل و حکمت کی روشنی سے حاصل کیا ہوا دین ہی تمام قوموں کا مرجع اور سرچشمہ ہوگا۔

اسلام نے اس طرح حاکم عقل کو اس کی تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا اور اس کو ہر اس تقلید سے رہائی دلائی جس نے اس کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور اس کو اپنی مملکت کے تخت پر لا بٹھایا، جس میں وہ اپنی حکومت اور سیاست و حکمت کے ذریعہ فیصلہ صادر کیا کرے، اس کے ساتھ ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کی تابعداری کرے اور قانون خداوندی سے باخبر رہے، اس کے منطقۂ حدود میں عمل کی کوئی حد نہیں۔"

کورانہ تقلید کے دعویدار شیخ عبدہ کی تنقید سے نہ بچ سکے آپ فرماتے ہیں۔

"بہت سے خاص لوگوں کے دل میں تقلید کا مرض جڑ پکڑ گیا ہے، وہ کسی

ایک شے کا اعتقاد کر لیتے ہیں، پھر اس پر دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اس دلیل کو وہ اپنے اعتقاد کے موافق ہونا ضروری خیال کرتے ہیں، اگر ان کے مخالف وہ دلیل پیش کی جائے، تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر بیٹھتے اور اس کا مقابلہ کرنے پر اڑ جاتے ہیں، خواہ یہ عقل کے انکار تک ہی پہنچا دے ان میں سے بیشتر حضرات تو پہلے اعتقاد کر لیتے ہیں، پھر اس پر استدلال پیش کرتے ہیں، بہت کم لوگ ایسے پائے جائیں گے جو استدلال کرتے ہوں پھر اعتقاد"

آپ نے اپنی تفسیر قرآن میں اکثر و بیشتر مقامات پر تقلید، اس کے ماننے والوں اور اس کی طرف دعوت دینے والوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہر اس آیت سے کام لیتے ہیں، جو حریت فکر کی تائید کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ حریتِ فکر کا مقابلہ کرنے والوں کی نکتہ چینی کرنے سے نہیں چوکتے۔

اس پر بیشمار شواہد ہیں، جن میں سے ہم مثال کے طور پر آپ کی وہ تفسیر پیش کرتے ہیں جو ۱۶۶ آیت سورہ ۲ کی فرمائی ہے قرآن مجید کی آیت یہ ہے "وَمَثَلُ الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاءً و ندآءً صم بکم عمی فہم لا یعقلون" یعنی ان کافروں کی کیفیت اس کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا یہ کفار بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں، سمجھتے کچھ نہیں،

آپ اس آیت کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:

"آیت میں صاف اور واضح بیان ہے کہ بغیر سمجھے بوجھے تقلید کرنا کافروں کا شیوہ ہے، انسان مومن اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے دین کو سمجھے اور اپنے نفس کو پہچانے، اگر کوئی شخص بغیر عقل و فکر کے کسی چیز کو تسلیم کرے

اور بغیر سمجھے بوجھے عمل کرے، خواہ وہ نیک ہی ہو، تو وہ مومن نہیں ہوگا کیونکہ ایمان کی غرض وغایت یہ نہیں کہ انسان بھلائی اور نیکی کا اس طرح مطیع ومنقاد ہو جائے جیسا کہ حیوان ہوتا ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنے نفس کو علم وعرفان کے ذریعہ بام ارتقا تک پہنچا دے، اور بھلائی کے کام انجام دے، کیونکہ اس کو اب شعور واحساس ہوگا کہ بھلائی پسندیدہ ونفع بخش چیز ہے اور اللہ کی خوشنودی کا باعث برائیوں کو ترک کر دے، کیونکہ وہ ان کے انجام اور نقصان کو سمجھتا ہے اس سے بڑھکر یہ کہ وہ عقل وبصیرت کی روشنی میں دیکھکر کسی چیز کا عقیدہ رکھے، محض وہ اس عقیدہ کو اس لئے تسلیم نہ کرے کہ اس کے آبا ؤ اجداد نے اس کو اختیار کیا تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کافروں کا وصف اپنی تمثیل کو بیان کرنے کے بعد پیش کیا ہے کہ وہ بہرے ہیں فہم وتدبر کے کان سے حق بات کو نہیں سنتے، گونگے ہیں علم اور اعتقاد کے ذریعہ نہیں بولتے، اندھے ہیں نہ تو یہ اللہ کی نشانیوں میں نظر کرتے ہیں اور نہ اپنے نفسوں میں، اسی لئے وہ عقل وفکر سے بے بہرہ ہیں"

تقلید کے حامیوں کی اصل بنیاد ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی اسلاف کا احترام ضروری ہے، ان کا گمان ہے کہ تنہا وہی دین کی تفسیر کے ٹھیکہ دار ہیں اس لئے انھوں نے آنے والی نسلوں کے حق میں اجتہاد کے دروازے بند کر دئے یعنی انھوں نے اس پہلو ہی سے انکار کر دیا کہ دین کے کسی معاملہ میں رائے زنی کرنے کے لئے مستقل بحث کی جائے، بخلاف اس کے محمد عبدہ تمام صدیوں کے لئے مساوی حصہ کے حق دار قرار دیتے اور گذشتہ نسلوں کی طرح موجودہ نسل کو بھی اجتہاد کا حق دینے کی طرف دعوت دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اسلام نے دلوں سے اُس تعلق کو دور کر دیا جس پر باپ دادا تھے اور جس کو ان کی اولاد نے بطور میراث پایا تھا، ان لوگوں کو احمق اور نادان ٹھرایا ہے جو اگلوں کے اقوال کو اندھا دھند مان لیتے ہیں، اس بات سے آگاہ کیا کہ زمانے میں پیش قدمی کرنا کوئی عرفانی نشانی نہیں، نہ کسی کی عقل کو کسی کی عقل پر برتری ہے نہ کسی کے ذہن کو کسی کی ذہانت پر ترجیح و فوقیت حاصل ہے، بلکہ تمیز و فطرت سے ہم آہنگ ہونے والا اور اس میں سبقت کرنے والا یہ دونوں برابر ہیں، لیکن تمیز اور فطرت پر رسائی کرنے والے کے لئے گذشتہ کے حالات کا علم اور ان میں فکر و نظر صرف کرنے کی استعداد اور کائنات کے آثار سے فائدہ اٹھانے کی ایسی صلاحیت پائی جائے گی جو اس کے اسلاف اور اخلاف میں گذرے ہوئے لوگوں کیلئے نہیں ہوگی"

محمد عبدہ اور آپ کے تلامذہ شرع کی تفسیر و توضیح میں خاص طور پر اجتہاد کے حق کی دعوت دیتے ہیں، دوسرے مقام پر ہم اسی موضوع میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے، محمد عبدہ نے جا بجا سلطان عقل کے احترام اور لوگوں کے لئے اس کے احکام و اوامر کی اطاعت لازمی و واجبی گردانی ہے، نیز آپ نے مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان اور اسی طرح مسلمانوں اور دیگر مذہب و ملت کے افراد کے مابین رواداری کی دعوت دی ہے، آپ اکثر دینی امور میں تاویل کو جائز قرار دیتے ہیں،

رسالۂ توحید کے آخر میں فرماتے ہیں:

"جو شخص کتاب اللہ اور اس کے علمی قوانین پر اعتقاد رکھے، اس کے لئے غیب کی خبروں کا سمجھنا دشوار ہو، وہ ایسے حقایق سے اپنی عقل و فہم کے ذریعہ تاویل کرے، جو ان پر دلیل لاکر تے ہیں، نیز اس کے ساتھ ساتھ وہ حیات بعد الموت، اعمال و عقائد کے ثواب و عقاب پر ایسا اعتقاد

رکھے کہ اس کی تاویل وعدہ وعید کی قدر و قیمت کو کچھ بھی نہ گھٹائے اور نہ کوئی شرعی بنیاد منہدم ہو، تو وہ حقیقی مومن ہوگا۔ اگر اس کی تاویل کو اور لوگ صحیح نمونہ نہ بنا سکیں، کیونکہ شرائع الٰہیہ کے پیش نگاہ وہ چیزیں ہیں جہاں تک عوام کی رسائی ہوتی ہے نہ کہ وہ جو خاص عقول کی مرضی کے مطابق ہوں، اس میں اصل الاصول یہ ہے کہ ایمان نام ہے اس یقین کا جو اللہ اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھا جائے اس میں کسی کی تخصیص یا قید نہیں بجز اس احترام کے جو انبیاء کرام کی زبانی ارشاد ہوا۔"

بیان بالا کی مزید تائید آپ کے اس قول سے ہوتی ہے جس کو آپ نے علماء یتولنس کے روبرو اپنی تقریر کے خاتمہ میں کہا تھا:

"یہ میرا اپنا دعوٰی ہے، میں اس سے یہ نہیں چاہتا کہ سننے والا لامحالہ اس کو قبول کرے، اگر وہ میرے کہنے سے مجبور ہو کر استقلال فکر اور حریت رائے کی دعوت کو قبول کرتا ہے تو میں اس کی مخالفت کروں گا، اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ سامعین میں سے کوئی ایسا شخص بھی ہوگا، جو اس کو ماننے پر مجبور ہو جائے اگر میں اس کا مطالبہ کروں، لیکن یہ ایک مشورہ ہے جس کو میں حاضرین کے سامنے پیش کر رہا ہوں، اگر سننے والا اس کو درست پائے تو قبول کرلے، ورنہ اس کو کوئی خوف نہیں"

دین وحکمت

محمد عبدہ فطرت پرست تھے، آپ کا عقلی موقف، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ تھا کہ مسلمانوں میں تمام علوم و فنون کی نشر و اشاعت پر عملی اقدام کیا جائے، کیونکہ آپ یہ تسلیم کرتے تھے کہ جب عقل کو مظاہر قدرت اور آثار طبیعت کے مطالعہ میں استعمال کیا جائے گا، تو اس سے ایک طرف معرفتِ خداوندی تک رسائی حاصل ہوگی، جس میں بہت سے دینی منافع ہیں اور دوسری طرف فطرت کے سربستہ رازوں کا انکشاف ہوگا۔ جس سے بیشمار علمی منفعتیں وابستہ ہیں'

اسی لئے آپ فرماتے ہیں:

"مظاہر قدرت میں نظر و تفکر سے لازمی طور پر دنیوی منافع حاصل ہوتے ہیں نفس انسانی کے اندر ان آثار کی وجہ سے معرفت ربانی کی کرن جگمگا اٹھتی ہے اور اس پر انوار و تجلیات کی بارش ہونے لگتی ہے"

آپ اپنے اس نظریہ و رائے کا دارو مدار آیت ۲۷ سورہ ۲ پر ٹھراتے ہیں، باریتعالیٰ کا ارشاد ہے "ہو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" یعنی وہی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' آپ نے اپنی تحریروں اور تصنیفوں میں اسی آیت کی طرف جابجا اشارہ کیا ہے، جس کا تھوڑا بہت تذکرہ اوپر ہو چکا ہے

آپ رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بحث میں اسی آیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کہ

"رسالت نبوی کا مقصد انسانوں کو اس امر کی دعوت دینا ہے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے تمام جہانوں کو پیش کر دیا ہے، ان کو سمجھنے کا نفیس

مکلف ٹھرایا اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ان کو مختار بنایا، اس کے لئے اعتدال پسندی اور شریعت عادلہ کے حدود پر وقوف کرنے کے سوا کوئی اور قید اور شرط نہیں عائد کی"

آگے فرماتے ہیں :

" قرآن مجید کائنات اور مخلوقات کے بارے میں اسی قسم کی دعوت دیتا ہے، یعنی وہ عقل انسانی کو مطلق العنان تصور کرتا ہے تاکہ وہ متعدد جہانوں تک پہنچنے کے لئے راستہ کو ہموار کرے، ....

قرآن عقل کو کبھی مقید نہیں کرتا، وہ اپنی اکثر آیات میں انسان کو آیات کون میں نظر کرنے کی دعوت دیتا ہے ....

اگر اس قسم کی جملہ آیات کو شمار کرنا چاہو گے تو میں تہائی قرآن بلکہ نصف قرآن سے زیادہ پیش کر سکتا ہوں"

اب دین وحکمت یا مذہب اور سائنس میں کوئی تعارض نہ رہا، کیونکہ یہ ہر دو عقل پر اعتماد رکھتے اور ایک حد تک مظاہر قدرت کا درس دیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص غرض وغایت ہے، جو اس کی توجہ کا مرکز ہے،

چوں کہ قرآن عزیز نے کائنات فطرت کے آثار اور مظاہر قدرت کے درس و مطالعہ کی ترغیب دی ہے، اور اس کے لئے کوئی حد و منتہا نہیں ٹھرایا، اس لئے لابدو لازمی ہے کہ دین سائنس کا ہمنوا ہو، اسی مقصد کو شیخ محمد عبدہ اس طرح ثابت کرتے ہیں۔

"دین عقل بشری کا وہ میزان ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ اس کی کمی بیشی کو درست کیا جائے وہ اس اعتبار سے علم وحکمت کا ہمنوا شمار کیا جاتا ہے اسرار کائنات کے لئے بحث وجستجو کی ترغیب دینے

والا، حقائق ثابتہ کے احترام کی دعوت دینے والا اور ان کے ذریعہ سے
آداب نفس اور اصلاح عمل کا مطالبہ کرنے والا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"اللہ نے اپنے تمام نور کا وعدہ کیا ہے ...... تاوقتیکہ وہ اپنا وعدہ پورا نہ
کرلے اور دین اپنے ہاتھ میں علم وحکمت کی زمام تھام لے اور دونوں (دین و
دانش) یکساں عقل و وجدان کی تقویم و استواری پر باہمی امداد و اعانت نہ
کرلیں، دنیا ختم نہ ہو گی۔"

شیخ محمد عبدہ علم وحکمت کو بڑی حد تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، حتیٰ کہ
آپ اپنی تمام تصنیفات اور تحریرات میں مسلمانوں کو لازمی طور پر ان علوم وفنون کے حاصل
کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جن میں مغربی قوموں نے شہرت حاصل کی تاکہ مسلمان ان
قوموں کے دوش بدوش ہو سکیں اور ان کا مقابلہ کر سکیں۔

آپ اپنے ایک مقالہ میں، جسے آپ نے اپنے ابتدائی دور میں، جریدہ الاہرام میں
شائع کیا، فرماتے ہیں:

"مغربی اقوام کی ثروت و قوت کی ترقی کا سبب صرف وہ ارتقاء ہے جس
کو انھوں نے علوم و معارف میں حاصل کیا .... اس لئے ہمارا پہلا
فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملکوں میں ان علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں پوری
سعی اور جہد و اجتہاد خرچ کر دیں۔"

اس کے علاوہ آپ کا نظریہ ہے کہ دیگر قوموں کی ہمنوائی میں مسلمانوں کی
کامیابی کی کوئی توقع نہیں، تاوقتیکہ صحیح اسلام کی طرف رجوع کرکے ان کے دل پاکیزہ
ان کے نفوس بلند اور ان کے اخلاق شائستہ نہ ہو جائیں،

محمد عبدہ اور آپ کے شاگردوں نے بالخصوص مجلہ "المنار" میں اسی نظریہ پر بحث کی

ہے مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کے اخلاق جب دینی صیقل سے چمک اٹھیں تو وہ اکتساب علوم اور تحصیلِ معارف میں اہلِ مغرب سے پیش پیش ہوں گے اور تہذیب و تمدن میں ان کے برابر"

قرآن مجید میں مظاہر قدرت اور آثار کائنات کی طرف جو اکثر و بیشتر اشارات وارد ہوئے ہیں ان کی تفسیر کے دوران میں محمد عبدہ کو ایک نہیں موقعہ مل گیا کہ علوم طبعیہ کے مطالعہ کو لازمی گردانیں۔

چنانچہ آیت ۱۵۹ سورہ ۲ کی تفسیر میں آپ ان اشخاص پر تنقید کرتے ہیں، جو دین کا نام لے کر علم الکون کی مخالفت کرتے ہیں پھر آپ توضیح کرتے ہیں کہ آثار کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کس طرح جدل و کلام کی بہ نسبت بہت بڑی حد تک معرفت خداوندی تک پہنچا دیتا ہے، آگے چل کر آپ فرماتے ہیں:

"تمھارے پیش نگاہ دو کتابیں ہیں ایک کتابِ مخلوق جو کائنات ہے، دوسری کتاب منزل جو قرآن ہے، قرآن عزیز ہی ہماری عقلی و فکری قوتوں کو کتاب فطرت کے ذریعہ علم و حکمت کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس کی اطاعت کرے گا تو وہ کامیاب اور جو اس سے اعراض کرے گا تو وہ خائب و خاسر ہوگا"

علوم طبعیہ پر بحث کرنے کے دوران میں آپ مختلف صناعات میں مہارت و کمال حاصل کرنے کی ترغیب دینے لگتے ہیں، تاکہ مسلمان جنگ چھڑ جانے کے وقت اپنے حقوق کی مدافعت کے لئے مستعد و آمادہ رہیں،

حسب ذیل آیات ——— آیت ۲۰۰ سورہ ۳ ——— آیت ۶۰-۶۶ سورہ ۸ ——— میں غور کیجئے،

واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیھم علی سواء ان	اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ وہ عہد انکو اسطرح واپس کر دیجئے کہ آپ اور

اللہ لا یحب الخائنین، ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا انھم لا یعجزون واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم وما تنفقوا من شیئ فی سبیل اللہ یوف الیکم وانتم لا تظلمون۔"	وہ برابر ہو جائیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور کافر لوگ اپنے کو یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے یقیناً وہ لوگ عاجز نہیں کر سکتے اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اسکے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جنکو تم نہیں جانتے انکو اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کروگے وہ تمکو پورا پورا دیدیا جائیگا اور تمہارے لئے کچھ کمی نہ ہوگی۔"

شیخ محمد عبدہ مذکورہ بالا آیات سے ایک قاعدہ کلیہ مستنبط کرتے ہیں وہ یہ کہ کافروں سے لینہ انہی آلات و وسائل سے جنگ کرنا ضروری ہے جن کے ذریعہ وہ مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

> اس زمانے میں غیر مسلموں سے توپوں، بندوقوں، سمندری جہازوں دبابوں اور ہوائی جہازوں اور اسی قسم کے دیگر جنگی فنون و آلات کے ذریعہ سے مقابلہ کرنا ضروری ہے، ان تمام کا انحصار علوم ریاضیہ وطبیعیہ میں مہارت و کمال حاصل کرنے پر ہے، دور حاضر میں یہ تمام مسلمانوں پر واجب ہیں کیونکہ عسکری استعداد کی تکمیل ان کے بغیر ناممکن ہے۔

گو محمد عبدہ علوم جدیدہ میں ید طولیٰ نہیں رکھتے تھے ازہر میں جو شخص علم سیکھے اس کے لئے یہ امر فطری ہے لیکن آپ نے اپنے درسی مشاغل کے علاوہ اپنی خاص جد وجہد اور

جمال الدین افغانی کی رہنمائی کی روشنی میں نئے علوم سے بھی استفادہ کیا۔

اس کے باوجود آپ اکثر و بیشتر علمی میدانوں میں اور بالخصوص ان موضوعات میں جو آپ کی تفسیر قرآن سے متعلق ہیں یا اپنی کوششوں میں جو دفاع اسلامی سے علاقہ رکھتی ہیں نئے انقلابات اور جدید رجحانات سے واقف تھے۔

علاوہ بریں جیسا کہ ہورتن کی رائے ہے کہ آپ بعض علمی پہلوؤں میں پیچھے تھے مثلاً آپ کا یہ اعتقاد تھا کہ پہاڑ بنیاد ہیں جن پر زمین قائم ہے اور یہی اس کو مستقل اور ثابت قدم بنائے ہوئے ہیں اور بعض ان آتش فشاں مادوں کو جو زمین میں ہیں اوپر آنے سے روکے ہیں۔ مثلاً آپ کا قول ہے کہ سمندر جہنم کو پوشیدہ کئے ہوئے ہے

ہم آپ کے ان علمی مسائل اور اسلوب نگارش کے کمال کو جن کے ذریعہ آپ ان معلومات سے اپنی قرآنی تفسیر میں استفادہ کرتے ہیں ذیل میں چند مثالوں کے لئے پیش کرتے ہیں،

قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں۔

اوکصیب من السماء فیہ ظلمات ورعد وبرق - یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین' یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہ واذا اظلم علیھم قاموا ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم وابصارھم ان اللہ علی کل شئ قدیر (سورۂ آیت ۱۹ او

یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد و برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ اپنی انگلیاں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے اپنے کانوں میں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس

کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب ان
پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے
اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا تو ان کے گوش و
چشم سب سلب کر لیتا، بلاشک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"برق رعد، صاعقہ اور اس کے اسباب حدوث یہ تمام مباحث قرآن سے متعلق نہیں بلکہ یہ علم طبعیات سے علاقہ رکھتے ہیں کائنات جو کے حوادث و واقعات کو لوگ اپنے اجتہاد فکر سے معلوم کر سکتے ہیں، وحی پر ان کا انحصار نہیں ہے، قرآن مجید میں مظاہر طبیعت اور آثار فطرت کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ انسانی عقل کو، قوت استدلال کو اور نظر اعتبار کو بحث و جستجو کی طرف متوجہ کیا جائے جس سے دین اور فہم و فکر کو تقویت پہنچتی ہے، کائناتی علم انسانی طبقات میں گھٹتا بڑھتا اور ماحول اور زمانے کے تغیر و تبدل سے مختلف ہوتا رہتا ہے کسی زمانے میں علما، حکمت کا اعتقاد یہ تھا کہ بجلی اور کڑک مادی اجسام سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ بجلی کے گرنے کے مقام پر گندھک وغیرہ کی بو سونگھا کرتے تھے ایک دور ایسا آیا کہ جس میں علما، طبیعیات نے اپنی یہ رائے بدل دی، انھوں نے دیکھا کہ اسی قسم کی بو ہمیشہ بجلی کے گرنے کے مقام ہی میں نہیں ہوتی، اسی دور میں اس کا بھی انکشاف ہوا کہ کائنات میں ایک سیال چیز ہے جس کا نام محققین کہربا رکھتے ہیں، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، ٹراموے اور بازاروں اور گھروں میں یہ بجلی کے قمقمے جو لیمپ تن کے جلتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی بجلی کا کرشمہ ہیں"

پھر آپ اس سیال کے ذریعہ برقی روشنیوں کی تیاری اور ان کے استعمال کے طریقہ کو بیان کرتے ہیں اور برق و رعد کے حدوث اور برقی ستونوں کے استعمال پر گفتگو کرتے ہیں،

اسی طرح اس آیت کی تفسیر

الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس سورہ ۲ - آیت ۲۷۶	جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے مگر جسطرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر۔

میں محمد عبدہ طب جدیدہ کے بعض مسائل اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ :-

"سود کھانے والوں کا اس طرح کھڑا ہونا جیسا وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان لپٹ کر خبطی بنا دے ابن عطیہ نے اس کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس سے مراد سود خور کو دنیا میں مریض مرگی (صرع) سے تشبیہ دینا ہے مثلاً جو شخص مختلف حرکات کرتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مجنوں ہو گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اول نظر میں یہی سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن جمہور مفسرین کی رائے اس کے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہاں کھڑے ہونے سے مراد قیامت کے وقت قبر سے کھڑا ہونا ہے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن سود خوروں کی نشانی یہ بتائی ہے کہ وہ مریض مرگی کیطرح اٹھائے جائیں گے"

پھر آپ اس موضوع میں جو حدیث مروی ہے اس پر گفتگو کرتے ہیں اور اس حدیث کے مابین اور اپنی رائے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"یہ تشبیہ اس امر پر مبنی ہے کہ مرگی کا مریض جس کی تعبیر یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیطان کے چھونے سے وہ خبطی ہو گیا ہے لیے شیطان کے چھو جانے کی وجہ سے اس کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں، یہی چیز

عربوں کے نزدیک بھی مشہور و معروف تھی، اور ان کے کلام میں مثال کے طور پر جاری تھی۔"

بیضاوی اس تشبیہ کے متعلق کہتے ہیں:

"یہ تشبیہ عربوں کے خیال کے مطابق وارد ہوئی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ شیطان انسان کو خبطی بنا دیتا ہے تو اس کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔"

ابو سعود نے بھی اپنی حسب عادت بیضاوی کا اتباع کیا ہے اور بعینہٖ یہی عبارت نقل کی ہے۔ اس بنا پر اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مشہور صرع (مرگی) حقیقی طور پر شیطان کے فعل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ آیت اس کی نفی بھی نہیں کرتی اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے معتزلہ اور بعض اہل سنت نے اس کا انکار کیا ہے کہ شیطان انسان میں سوائے وسوسہ پیدا کرنے کے اور کوئی دخل اندازی کر سکتا ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ صرع کا سبب شیطان کا لپٹ جانا ہے، جیسا کہ تشبیہ سے ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ صراحۃً اس پر نص نہ ہو۔

دور حاضر کے اطباء کے نزدیک یہ مسلم ہو چکا ہے کہ صرع اُن عصبی امراض میں سے ہے جس کا علاج جڑی بوٹیوں اور اس کے علاوہ جدید طریقہ ہائے علاج سے کیا جاتا ہے، بعض تو ہمات کے ذریعہ اس کا علاج کیا جاتا ہے لیکن یہ اس پر قطعی دلیل و برہان نہیں ہے کہ اُن پوشیدہ مخلوقات کے لئے جن کو جن سے تعبیر کیا جاتا ہے، نا ممکن ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے اتصال رکھیں جو صرع کی استعداد رکھتے ہوں،

متکلمین کہتے ہیں کہ جن زندہ پوشیدہ اجسام ہیں جو آنکھوں کو نظر نہیں آتے، ہم نے المنار میں بارہا کہا ہے کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ زندہ خفی اجسام جو اس دور میں خورد بینوں کے ذریعہ سے دیکھے گئے ہیں اور جن کا نام جراثیم رکھا جاتا ہے وہ ایک قسم کے جن ہیں، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہی جراثیم اکثر امراض کے اسباب و علل ہیں،

یہی تاویل ہم نے طاعون میں پیش کی ہے کہ طاعون جن کے گھس جانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے علاوہ بریں ہم مسلمان ہیں، سائنس نے جس کو ثابت کیا ہے اور اطبا نے جسے تسلیم کیا ہے ہمیں اس میں نزاع واختلاف کی ضرورت نہیں یا اس پر ایسی چیزوں کے اضافہ کی حاجت نہیں جس کی دلیل علم وحکمت میں نہیں ہے، ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قرآن مجید علم وحکمت کے خلاف کوئی بات پیش نہیں کرتا، وہ اس سے بہت بلند وبالا ہے"

نیز شیخ محمد عبدہ نے علم جدید کے بعض مسائل پیش کئے ہیں مثلاً کائنات کی اصل اور حیات طبیعیہ پر روشنی ڈالی ہے۔ انسان کی اصل وحقیقت کے باب میں قرآنی نظریات کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کے موافق پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء سورۂ ۴- آیۃ ۱	اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

محمد عبدہ اس آیت کی تشریح کرتے ہیں اور یا ایھا الناس پر سب سے پہلے بحث کرتے ہیں، باوجودیکہ مفسرین کا اتفاق ہے کہ جن سورتوں میں اس قسم کے خطاب سے ابتدا کی گئی ہے وہ تمام مکی سورتیں ہیں، لیکن شیخ عبدہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "یہ خطاب عام ہے کسی قوم سے خاص نہیں"

آپ فرماتے ہیں:

"نفس واحدہ سے مراد آدم نہیں، نہ لفظ سے اور نہ ظاہری آیت سے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب تمام اقوام عالم کو اسلام کی طرف دعوت

دینے کے لئے کیا گیا ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قوم اس دعوت سے اپنے اعتقاد کے مطابق ہی سمجھتی ہے، جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں نفس واحدہ سے مراد آدم ہیں جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان کے ہر گروہ کے لئے ایک باپ ہے تو نفس کو وہ اپنے اعتقاد پر محمول کرتے ہیں

آگے فرماتے ہیں:

یہاں نفس واحدہ سے مراد آدم ہی نہ لینے کا قرینہ خدائے تعالیٰ کا یہ قول ہے "وبث منھما رجالاً کثیراً و نساءً" اس میں رجال و نساء کو نکرہ لایا گیا ہے، اگر آدم ہی اس سے مراد ہوتی تو اس توجیہ کے مطابق یہ کہنا مناسب ہوتا وبث منھما جمیع الرجال والنساء

ایک خاص نفس کی تشریح کیونکر کی جا سکتی ہے حالانکہ خطاب تمام قوموں سے عام ہے؛ یہ تخصیص تمام کے پاس معروف نہیں، بعض لوگ نہ آدم کو جانتے ہیں نہ حوا کو، اور نہ انھوں نے ان کے نام سنے ہیں، مثلاً نوح کی اولاد کا یہ مشہور نسب عبرانیوں سے ماخوذ ہے، کیونکہ انھوں نے ہی آدم سے متصل تاریخ انسان کے لیے بنائی اور نوح کے جانے کو آدم کے قریب کا دور ٹھہرایا،

چین والے انسان کے نسب نامہ کو کسی اور باپ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کے تاریخی دور کو عبرانیوں کے ٹھہرائے ہوئے دور سے بھی بعید ترین دور میں معین کرتے ہیں، انسانی آثار میں بحث و تحقیق عبرانیوں کی تاریخ کو مطعون کرتی ہے، ہم مسلمان یہودیوں کی تاریخ کو سچ ماننے کے مکلف نہیں ہیں خواہ وہ اس کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیوں نہ کریں کیونکہ ہمارے نزدیک یہ معتبر نہیں کہ وہ توراۃ سے ہے اور یہ بعینہ وہی ہے جس کو موسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں نفس کا معاملہ مبہم رکھا ہے، جس سے بہت سی مخلوق پیدا کی، پھر نفس کو نکرہ لایا، ہم اس کو مبہم ہی حالت میں چھوڑتے ہیں، جب افرنگی محققین کا قول ثابت ہو جائے کہ انسان کی ہر صنف کے لئے ایک باپ ہے، تو یہ ہماری کتاب کے مفہوم سے جداگانہ ہے، کیونکہ اس میں ان کے اعتقاد پر نص صریح آگئی ......"

آپ اپنا قول اس پر ختم کرتے ہیں

"کاش مجھے معلوم ہوتا کہ جو لوگ اس مسئلہ میں نص قرآن کی قطعیت کے قائل ہیں، اس شخص کا کیا جواب دیتے ہیں، جو اپنے دلائل کے ساتھ اس کا یقین رکھتا ہے کہ انسان متعدد اصول اور خاندانوں سے بنا ہے؟ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ جو شخص مسلمان ہونا چاہے اور اسے اس مسئلہ میں یقین کو چھوڑنے میں دشواری پیش آئے تو اس کا نہ ایمان صحیح ہوگا اور نہ اس کا اسلام قابل قبول ہوگا، اور اگرچہ وہ یہ یقین رکھے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس میں کوئی ایسی نص نہیں جو اس کے یقین کے معارض ہو"

اسی طرح شیخ محمد عبدہ کا یہ نظریہ ہے کہ قرآن میں اس "تنازع للبقا" اور "بقاء اصلح" کے دونوں نظریے ہیں، قرآن ان دونوں نظریوں کو کائنات میں الٰہی قوانین اور تاریخ انسان میں فطری اصولوں کو معتبر سمجھتا ہے،

ہمیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کلمہ "سنن" (قوانین) کے بارے میں کچھ کہیں جن کا تذکرہ اکثر محمد عبدہ اور آپ کے تلامذہ کی کتابوں میں آیا کرتا ہے،

جو لوگ فطرت پرستوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس علمی معنی کے اعتبار سے قانون طبیعی کا کوئی مقام نہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ارادۂ الٰہیہ قدرت مطلقہ کے ساتھ مختص ہیں اور یہی ہر وجود کے لئے علۃ فاعلہ ہے اور یہی وجود کائنات اور اس کے تسلسل وجود کا سبب ہے، جو مسلسل خلق کے واسطہ سے جاری ہے،

محمد عبدہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ مطلق ہے اور یہی تمام کائنات کیلئے علت فاعلہ ہے۔ لیکن محمد عبدہ قرآن مجید میں سنۃ اللہ کے الفاظ پاتے ہیں جو قانون طبعی کے نظریہ کی تعبیر میں وارد ہوتے ہیں اس موضوع میں واضح واہم نص اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (سورہ ۳۳، آیۃ ۶۲)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے فهل ینظرون الا سنۃ الاولین فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔ (سورہ ۳۵۔ آیۃ ۴۳)

یہ آیات خاص طور پر انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اگرچہ سنۃ کا لفظ طبیعۃ پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ محمد عبدہ کے اس بیان میں ہے کہ، "کائنات میں قیمتی پتھروں (ہیرے جواہرات) اور غیر قیمتی پتھروں مثلاً چٹانوں کی تکوین، نباتات کی نشوونما، حیوانات کی زندگی، اجسام کے ملنے جلنے ان کے جدا ہونے ان کی تحلیل وترکیب وغیرہ کے قوانین ہیں، یہی وہ ہیں جنہیں ہم نے اصل دوم سے تعبیر کیا ہے"

آپ نے جہاں طبعیات اور فلکیات پر بحث کی ہے انہی قوانین کو حقائق علمیہ شمار کرتے ہیں، جامعی قوانین پر بحث کرتے وقت ان پر بہت خصوصی توجہ کرتے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں،

"انسان کے لیے خاص آئین وقوانین ہیں، جو ان کی اجتماعی زندگی کیساتھ مخصوص ہیں، ان ہی پر وہ کاربند ہیں، انہی میں وہ ردوبدل کیا کرتے ہیں ان کی قوت وضعف، ان کا غنا وفقر، ان کی عزت وذلت، ان کی سیادت وعبودیت، ان کی موت وحیات، غرض کہ یہ تمام سنن الہیہ کے تابع اور قوانین قدرت کے ماتحت ہیں،"

قرآن وہ پہلی کتاب ہے جس نے ان سنن اجتماعیہ پر توجہ مبذول کی اس سے انکار کرنا یا انکے دائرہ حدود سے باہر ہونے کی کوشش کرنا ایک فعل عبث ہے جو قوم ان قوانین کے دائرہ سے نکل گئی اس پر زوال آگیا"

قرآن مجید کی آیت "ان اللہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" (سورہ ۱۳ آیت ۱۲) کی تفسیر میں آپ فرماتے ہیں،

"قومیں اپنے عرش عزت سے اس لئے گریں اور ان کا نام لوح وجود سے اس وجہ سے حرف غلط کی طرح محو ہو گیا کہ انھوں نے ان سنن الٰہیہ کے دائرہ سے اپنا قدم باہر نکالا جو حکمت بالغہ کی اساس پر قائم تھے' اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اس کی عزت وشوکت' اس کی آسائش وآرام' اس کے امن وراحت کو تبدیل نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنے آپ نہ بدلجائے' اس کی عقل کا نور اس کی فکر کی درستی' اس کی بصیرت کی روشنی' اور گذشتہ قوموں میں اللہ کے کردار کا اعتبار' اور راہ خدا سے منحرف ہو جانے والوں کے حالات میں فہم وتدبر میں تبدیلی پیدا ہو گئی' وہ ہلاکت کے گھاٹ اتر گئی عادلانہ قانون سے برگشتگی کی وجہ سے اس میں تباہی وبربادی پھیل گئی اور بصیرت وحکمت کے طریقہ کو چھوڑ دینے سے وہ زوال وانحطاط کے آخری سرے تک پہنچ گئی' یہ نکبت وذلت ان کو اس لئے بھی اٹھانی پڑی کہ انھوں نے حق کی نصرت وامداد کے مقابلہ میں باطل کی زندگی اختیار کی"

مسلمان جو غیر اقوام کا شکار ہو گئے اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے قرآنی احکام وتعلیمات کا اتباع کرنے سے غفلت برتی' انھوں نے ان سنن وقوانین الٰہیہ کا مطالعہ نہیں کیا جو راہ راست پر رہبری کرنے والے تھے' ان کو یہ دعویٰ کرنے میں کوئی فائدہ نہیں کہ وہ مسلمان ہیں یا وہ صالح مسلم ہیں' اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وما کان ربک لیھلک القری بظلم وا ھلھا مصلحون (سورہ ۳، آیۃ ۱۱۷)

قرآن مجید میں سورہ ۲ آیت ۲۴۹-۲۵۳ کی جو آیات ہیں، اور جن میں داؤد و جالوت کے قصہ اور بنی اسرائیل کی جنگ کا تذکرہ ہے، نوامیس اجتماعیہ کا ایک سلسلہ ہیں جو خاص کر قوموں کے سیاسی حالات اور ان کی عام ترقی اور پیش قدمی سے متعلق ہیں،

انہی میں سے ایک ناموس آیۃ ۲۵۲ سے اخذ کیا جا سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا قول ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض، شیخ عبدہ فرماتے ہیں:

"اللہ کا ایک دوسرے کی مدافعت کرنا عام قوانین میں سے ہے، وہ وہی ہے جس کو دور حاضر کے علماء حکمت تنازع للبقاء سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگ انسان میں ایک طبیعی چیز ہے، کیونکہ یہ عام تنازع للبقا کی فروع میں سے ہے۔"

پھر فرماتے ہیں:

"تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا قول 'ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض' نہ صرف بالخصوص حرب و قتال میں نص ہے بلکہ لوگوں کے مختلف تنازعات کی ہر نوع کے لئے عام ہے، جو مدافعت اور باہمی غلبہ کے مقتضی ہے،

اجتماع بشری کے قوانین و سنن کا سطحی علم رکھنے والوں کا خیال ہے کہ تنازع للبقا جس کے وہ لوگ قائل ہیں کہ وہ ایک عام قانون ہے یہ اس دور کے مادہ پرستوں کا رائج کردہ نظریہ ہے، یہ خیال ظلم و جور کی نبی ہے اور یہ دین کی ہدایت کے سراسر مخالف ہے، اس قسم کے دعوی دار انسان کے معنی سمجھتے یا اپنے نفوس کو پہچانتے تو اس قسم کا دعوی نہ کرتے"

محمد عبدہ اللہ تعالیٰ کے قول لفسدت الارض سے ایک دوسرا ناموس اخذ کرتے ہیں یہ وہی قانون ہے جو علماء اجتماع کے نزدیک انتخاب طبیعی یا البقاء اصلح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ماقبل کے لوازم میں سے گردانا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان حق اور مصلحت کی خاطر جو ایک دوسرے سے دافعت پر مفطور ہیں یہی چیز فساد فی الارض سے مانع ہے یعنی یہی لقاء حق اور بقاء اصلح کا سبب ہے"

محمد عبدہ نے بذات خود نہیں نوامیس وسنن اکو دوسری آیتوں سے مستنبط کیا ہے اور ان کو مختلف مقامات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً آپ فرماتے ہیں:

"کائنات میں مختلف نظریات ہیں ان کے تنوع اور زاویہ نگاہ کا اختلاف محض حق و باطل کی معرکہ آرائی پر مبنی ہے ضروری ہے کہ حق افکار ورجانات کے تعاون سے کامیاب اور باطل پر سربلند ہو یا قوی و طاقتور کو ضعیف و کمزور پر غلبہ ہو جائے"

محمد عبدہ کا یہ پختہ اعتقاد تھا کہ جب اسلامی روح کو صحیح پیمانہ پر سمجھ لیا جائے تو اس کا سینہ ہر علمی بحث کے لئے وسیع ہو جائے گا، آپ نے اپنے مقالات میں خصوصی آپنے دین کی مدافعت میں لکھے ہیں بیان کیا ہے کہ "اسلام گذشتہ دور میں عیسائیت کے مقابلہ میں بہت رواداری تھا"

آپ اپنے رسالۂ توحید میں ایک یورپی مصنف کی جس کا نام آپ نے بیان نہیں کیا ہے، ایک عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک واسطہ اور سبب تھا ساتویں صدی میں یورپ میں بحث و تحقیق کی روح بیدار کرنے کا یہ روایت اس کی پوری تائید

کرتی ہے۔

آپ دورحاضر کے مسلمانوں کے فکری و ذہنی جمود پر افسوس کرتے ہیں اور ان لوگوں کو نشانۂ ملامت بناتے ہیں جو جدید علوم کو اور جدید افکار کو حرام قرار دیتے ہیں آپ کا یہ خیال تھا کہ یہ حالت عنقریب ختم ہو جائے گی، چنانچہ آپ فرماتے ہیں

"یہ بلند و برتر کتاب (قرآن) جس نے مشرق و مغرب میں علم کی روشنی پھیلائی، لامحالہ اس کا نور دوبارہ ظہور پذیر ہوگا ان ظلمتوں اور گمراہیوں کے پردوں کو چاک کر دے گا، اپنے اصلی مقام یعنی مسلمانوں کے دلوں کی طرف لوٹے گا، پھر علم و حکمت ان کی طرف پناہ لینے آئیں گے، یہی وہ نور ہے جو واحد انیس ہے اسی سے انس رکھا جائے گا اور اسی پر اعتماد کیا جائیگا"

ساتواں باب
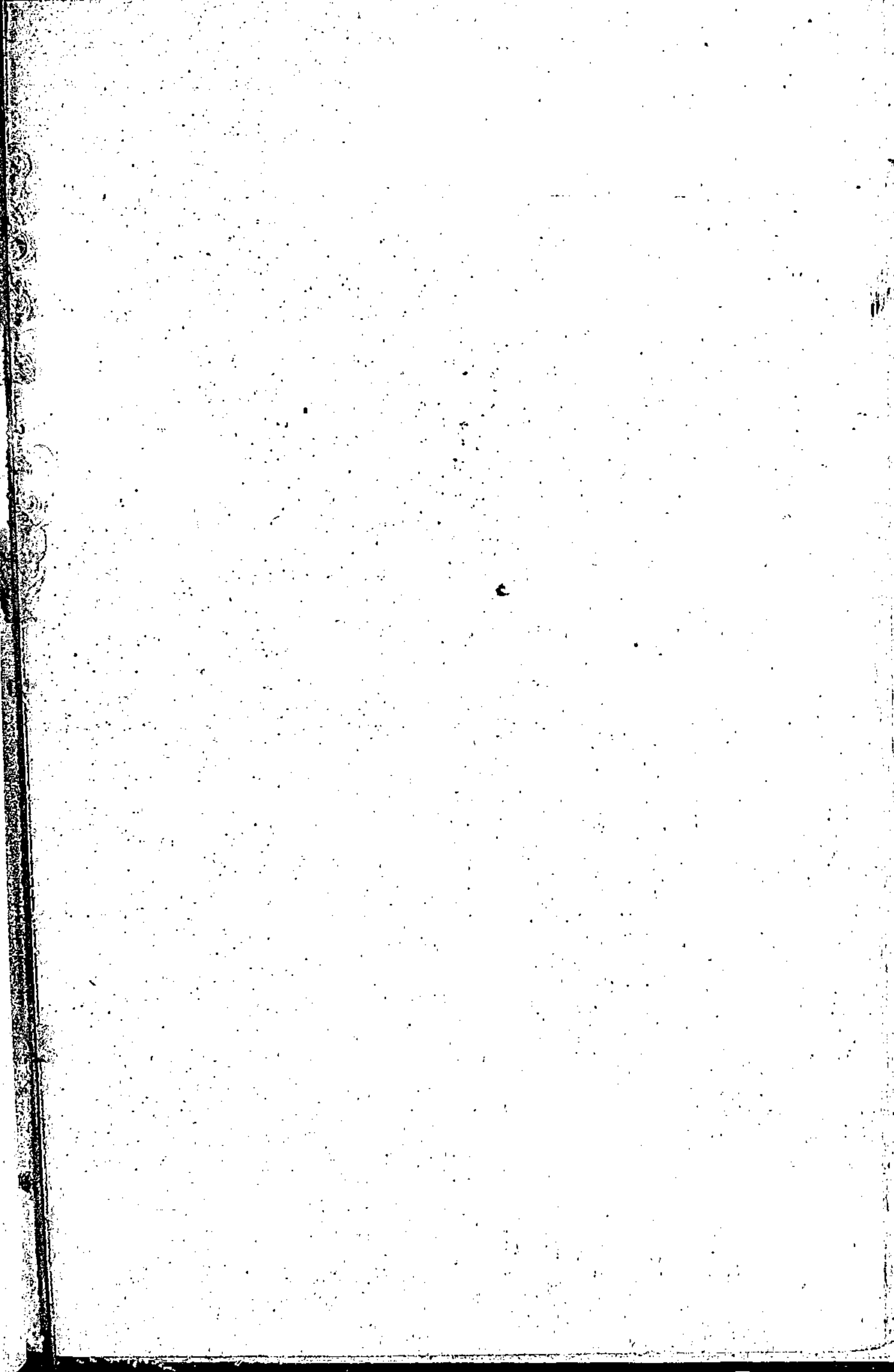
محمد عبدہ کے آراء و نظریات

ایمان باللہ

ہم اس سے پیشتر پڑھ آئے ہیں کہ محمد عبدہ اپنے ابتدائی دور میں ذات باری تعالیٰ پر بحث کرتے وقت وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اس کو آپ رسالہ "واردات" میں بیان کرتے ہیں کہ

"اس کو بعید از قیاس نہ سمجھ کہ حلول اپنی علت کی ایک شان اور کیفیت ہے کیونکہ تم اس حقیقت سے غافل نہیں کہ گھر اپنے اجزاء سے مل کر بنا ہے، درخت بیج ہی کی ایک کیفیت ہے، موجیں سمندر کی صفت ہیں، اور اسی کے حالات و کیفیات کا ایک عکس، اسی طرح تمام امور کا حال ہے، یہ تمام اپنی وجودی شکل و صورت میں اللہ کے وجود پر دلیل ہیں"

پھر آپ فرماتے ہیں:

"ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے وجود کے سوا کوئی وجود نہیں، اس کی صفت کے علاوہ کوئی وصف نہیں، پس وہی موجود ہے اور اس کے علاوہ ساری چیزیں معدوم ہیں...... جب وجود ہی کمال اور عدم ہی نقص ہے تو اللہ کی ذات سراپا کمال ہے، اس کے کسی جہت میں کوئی عدم کا شائبہ نہیں۔ ہر کمال اس کے کمالات کا مظہر ہے"

جب مظاہر ممکنات اللہ کی ذات و صفات کا طلسم ہیں اور نیز ظاہر و ممکنات تمہے معلوم اس کے علم حقیقی کے طلسم ہیں، تو تمہارا علم طلسم ہے اور اس کا علم اس کا باطن ہے، تمہارا علم اس پر شاہد ہے، غیر کا علم رکھنے والا اپنی ذات کو معلوم کرنے کا اولین حقدار ہے

نیز جب اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح موجود ہے، اور جہل عدم محض ہے تو حق تعالیٰ پر جہل کا شائبہ محال ہے اور اس کے لئے علم واجب ہے، لہذا وہ لذاتہ اپنی ذات کا عالم ہے اور اپنی ذات سے پیدا شدہ چیزوں کو جاننے والا ہے، ہمارے لئے یہ کہنا ضروری ہوگیا کہ اس کا علم اس کی عین ذات ہے اور وہ اس کا بذاتہ عین علم ہے ....

جس طرح اس کی ذات بالذات واحد ہے، اور کثرت عالم تجلیات میں وتنوع پذیر ہے۔ اسی طرح اس کا علم کلیات بالذات واحد ہے، اور اس کی کثرت عالم تجلیات میں ہے، تمہیں باریک بینی سے کام لینا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہجوم تجلیات اور یہ کثرت ذات وحدت تک پہنچنے سے مانع ہو کیونکہ اگر سمندر کا ذاتی علم حاصل ہو جائے تو اس کے امواج کو جاننے کے لئے دوسرے علم کی حاجت نہیں"

محمد عبدہ اسی رسالہ میں اشعری کی اس رائے کے مخالف نظریہ پیش کرتے ہیں، اشعری کا قول یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ اشیاء کا ذاتی علم رکھتا ہے کیونکہ وہ ان کے وجود کی علت ہے لیکن اللہ تعالیٰ اشیاء کے جزئی صفات کا علم نہیں رکھتا کیونکہ یہ علم ان کے وجود خارجی کے بعد حاصل ہوتا ہے"

آپ حکماء اور فلاسفہ اور ان کے مسلک رکھنے والوں کے بھی مخالف ہیں حکماء کا نظریہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ جزئیات کا علم رکھتا ہے نہ کہ کلیات کا"

آپ صوفیاء کے اس قول سے بھی انکار کرتے ہیں کہ "زمانہ اللہ کی ایک شان ہے تمام کائنات جو زمانہ کے حکم میں داخل ہے اللہ کے نزدیک حاضر ہے" آپ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ بذات خود اشیاء کا علم رکھتا ہے

پھر آپ نے حکماء کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ اللہ کو صرف جزئیات کا علم حاصل ہے یہ علم بذات خود صورتوں کے ارتسام سے حاصل ہوتا ہے، آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کا علم ارتسامی نہیں ہے آپ اس حقیقت کے قائل ہیں کہ اللہ کو جو ذاتی علم حاصل ہے وہ اس کا عین ذات ہے۔

علاوہ بریں ہمیں آپ کے رسالہ توحید میں جس کو آپ نے بعد میں تالیف کیا ان تعلیمات کا کوئی اثر نہیں پاتے جنھیں آپ نے اپنے عہد شباب میں پیش کیا اور جسمیں آپ نے وحدت الوجود کا مسئلہ ثابت کیا ہے، بلکہ آپ اپنی تعلیمات میں وجود باری تعالیٰ پر واجب و ممکن کے نظریہ پر اعتماد رکھتے ہوئے دلیل قائم کرتے ہیں یہی وہ نظریہ ہے جس کو علماء کلام نے مسلمان فلاسفہ سے حاصل کیا جس کو انھوں نے فلاسفۂ یونان سے اخذ کیا تھا،

اس دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر معلول کے لئے ایک علت ہے پھر اس علت کے لئے علت کا ہونا ضروری ہے لیکن عقلی طور پر یہ علتوں کا سلسلہ علۃ اولیٰ یا سبب اول کے وجود کو تسلیم کرنے کا موجب ہے، اور اس کا وجود ذاتی جو واجب الوجود ہے ازلی ابدی ہے اور یہی تمام کائنات کی علت ہے۔

اس نظریہ کی تائید ہمارے اس مشاہدہ سے ہو رہی ہے جو ہم کائنات کے اندر نظام و ترتیب اور اسباب و مسببات کے باہمی ارتباط میں دیکھ رہے ہیں یہ تمام مظاہر ہیں جو خالق کائنات کی حکمت اور اس کی تدبیر پر دلالت کرتے ہیں،

اب عقل کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ معبود خالق، واجب الوجود،

عالم، حکیم، قادر کے وجود کا اعتقاد رکھے اور یہ تسلیم کرے کہ کائنات میں جو وحدت نظام پایا جاتا ہے اس میں وہ واضح ہے۔

محمد عبدہ فرماتے ہیں۔

بدکیا مجرد اتفاق سے جس کا نام "اتفاق" رکھا جاتا ہے یہ ممکن ہے کہ وہ اس عظیم الشان نظام کا سرچشمہ ہو اور ان قواعد و ارکان کا واضع ہو جن پر کائنات کا ہر چھوٹا بڑا وجود مبنی ہے"

پھر فرماتے ہیں:

"خالق کے بعض صفات کا عقل کے ذریعہ معلوم کرنا ممکن ہے، اس کی تائید وحی سے بھی ہوتی ہے، یہ صفات قدیم ہیں یعنی ازلی وجود اور ابدی لقا ہیں۔ ذات باریتعالیٰ میں کسی قسم کی ترکیب نہیں ہے، حیات، علم، ارادہ قدرت اور وحدت ان تمام صفات تک ہم عقل و برہان کے ذریعہ رسائی حاصل کر سکتے ہیں مثلاً علم تک ہم اس طرح رہبری حاصل کرتے ہیں کہ بداہتہً علم ضروری ہے، اس کی تائید ہمارے اس مشاہدہ سے ہوتی ہے جو ہم نظام کائنات میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ استحکام، ترتیب اور ربط وضبط کا ایک مجموعہ ہے"۔

اللہ کی وحدانیت پر آپ اس طرح استدلال کرتے ہیں:

"اگر کئی واجب الوجود ہوتے تو ان کے افعال ان کے گوناگوں علوم اور ارادوں کی وجہ سے باہمی مخالف ہوتے ان کے علوم اور ارادوں کی رنگا رنگی و اختلاف کے اعتبار سے ان کے افعال ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے، اس طرح نظام کون فاسد ہو جاتا بلکہ اس کا ایک نظام میں ہونا محال ہو جاتا، نہ صرف یہی بلکہ ممکنات کا کوئی ممکن وجود ہونا باطل ہو جاتا، کیونکہ ہر ممکن کے وجود

کے لئے مختلف علوم اور ارادوں کے مطابق ایجاد کا ہونا ضروری ہے اس
حالانکہ یہ محال ہے، لوکان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا (سورہ ۲۱ آیۃ ۲۲)
لیکن فساد بالبداہۃ محال ہے، اللہ جل شانہ اپنی ذات و صفات میں
واحد ہے، نہ اس کے وجود میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کے افعال میں۔
"اللہ کی بعض صفات شرع کی زبانی ذکر ہوئے ہیں، اگر ان کو
واجب الوجود کی شان کے لائق محمل کیا جائے تو عقل اس کو محال
نہیں سمجھتی، لیکن اس کی طرف محض نظر ہی رہنمائی نہیں کرتی، بلکہ یہ
اعتقاد بھی واجب ہے کہ اللہ جل شانہ ان سے متصف ہے اس میں
شریعت کا اتباع اور اس کے اخبار کی تصدیق ضروری ہے الٰہی صفات
میں سے کلام، سمع اور بصر ہے،

جن چیزوں پر ہمیں ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ ہیں کہ پہلے ہم یہ جانیں
کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف ہے، لیکن یہ مسئلہ کہ صفات ذات
سے زائد ہیں یا وہ نفس ذات ہیں اور اسی قسم کے دیگر وہ مسائل جس
میں مختلف زاویائے نگاہ ہیں ان میں غور و خوض کرنا جائز نہیں کیونکہ
انسانی عقول کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں"

یہاں محمد عبدہ ان اہم مسائل میں بحث کرنے سے رک جاتے ہیں، جن
میں متکلمین اسلام نے اپنے آپ کو مشغول رکھا۔

آپ نے صفات کے بارے میں اہل السنۃ کی جو رائے ہے اس کی
تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ کی صفات، اگرچہ نام میں ان صفات کے مشابہ ہیں جن سے
انسان متصف ہے، لیکن اللہ اپنی مخلوق کی کسی چیز کے مشابہ نہیں

(حاشیہ: ... متعدد وجودوں کا ہونا لازم ... ہے)

نیز اس کے اور مخلوق کے درمیان کوئی نسبت نہیں سوائے اس کے کہ وہ ان کا موجد و خالق ہے"

"چہرہ، ہاتھ اور استواء علی العرش اس قسم کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کے معانی مراد ہیں، جن کو اہل عرب جانتے تھے جن سے قرآن نے خطاب کیا ہے"

آپ عقیدہ کی نہایت بسیط تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

" ہمیں جس چیز پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ کائنات کی کوئی شئے اس کے مشابہ نہیں وہ ابدی ہے اور ازلی، حی و عالم ہے، مرید و قادر ہے، اپنے وجوب وجود میں، اپنے کمال صفات میں، اپنی مخلوق کی صنعت گری میں منفرد ہے، وہی متکلم، سمیع، بصیر ہے، الغرض ان تمام صفات پر ایمان لانا ہمیں ضروری ہے جن کا نام شریعت اسلامیہ نے اللہ پر اطلاق کیا ہے۔

اللہ کا فعل ہمیشہ اسی کے اختیار سے صادر ہوتا ہے اسی کے علم و ارادہ و قدرت سے قائم و برقرار رہتا ہے، اس کی مخلوق میں اس کا جو تصرف ہوتا ہے اور اس کے جو افعال جاری ہوتے ہیں ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو علیتہ محضہ اور استلزام وجودی سے بلا شعور و بلا ارادہ اس سے صادر ہوتی ہو کائنات کے مصالح میں سے کوئی ایسی شئی نہیں جس کی رعایت رکھنا اللہ کے لئے ضروری ہے اس طرح کہ اگر وہ اس کو پیش نظر نہ رکھے تو اس پر نقد و جرح کی جائے پھر اس سے بچنے کے لئے اس کو ویسا ہی کرنا پڑے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے اعتقاد سے بہت بلند و بالا ہے، لیکن کائنات کا نظام اور اس کی بڑی بڑی مصلحتیں محض اس اعتبار سے قائم اور ثابت ہیں کہ وہ ایسے واجب الوجود کا اثر ہیں جو موجودات میں اکمل اور ممکنات میں

ارفع واعلیٰ ہستی ہے۔ کائنات کا کمال محض مکوّن، خالق حقیقی کے کمال کے تابع ہے"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مثلاً خلق، روزی رسانی وغیرہ اس کے لئے امکان خارجی کے ساتھ ثابت ہیں یعنی عقل ان کو محال نہیں سمجھتی، یہ افعال اس کی ذات سے صادر ہونا واجبی نہیں ہیں؟

محمد عبدہ نے خلق قرآن کے موضوع میں بحث کی ہے کیا قرآن قدیم ہے یا حادث یہ ایسا مسئلہ ہے جس نے مسلمانوں کے درمیان ایک ہنگامہ نزاع برپا کر دیا یہاں تک کہ اس میں ایذا رسانی تک نوبت پہنچ گئی رسالۂ توحید کی پہلی اشاعت میں محمد عبدہ خلق قرآن کے قائل تھے لیکن آپ کے رفیق محمد محمود شنقیطی نے ذکر کیا ہے کہ آپ کی یہ رائے اہل سنت کی رائے سے متفق نہیں جو اس نظریہ کے قائل ہیں کہ صفت کلام اللہ کی صفات قدیمہ میں سے ہے اور قرآن میں جس قدر صفات وارد ہوئی ہیں وہ اسی کی تعبیر ہیں لیکن ان صفات کے مظاہر جو الفاظ منطوقہ وغیرہ پر مشتمل ہیں وہ مخلوق ہیں۔ محمد عبدہ نے اس تنقید کا اقرار کر لیا اور دوسری اشاعتوں میں ایسی عبارت پیش کی جو ( ) سے متفق ہے لیکن پانچویں اشاعت سے اس موضوع سے تمام متعلقہ مباحث کو حذف کر دیا اور صرف آپ کا یہ قول باقی رہ گیا کہ

"قرآن یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے کلام کا سرچشمہ جو اللہ کی طرف سے صادر ہوا ہے اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہونا ضروری ہے نیز اس کے قدم ذات کی بنا پر اس صفت کا بھی قدیم ہونا لازمی ہے"

انسان کے متعلق آپ کا نظریہ

گزشتہ صفحات میں ہم نے انسان کی اصل پر محمد عبدہ کی رائے ذکر کی ہے آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اللہ نے صرف ایک ہی جوڑا پیدا کر دیا جس سے تمام انسانی نسلیں وجود میں آگئیں، آپ رسالۂ واردات میں بیان کرتے ہیں کہ نفوسِ جزئیہ نفوس کلیہ کی شعاعیں ہیں جو چار مرتبوں میں منقسم ہیں لیکن ہم اس قسم کا تذکرہ آپ کی آخری تصنیفات میں نہیں پاتے بلکہ یہ رسالۂ توحید میں ملتا ہے آپ فرماتے ہیں:

"انسان نے بیشتر اوقات قریب ترین اشیاء یعنی خود اپنے نفس کا علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے چاہا کہ اپنے نفس کے بعض عوارض و علامات کو پہچانے کیا وہ عرض ہے یا جوہر، کیا وہ جسم سے پہلے پیدا ہوا یا اس کے بعد، کیا یہ جسم کے اندر ہے یا اس سے علٰحدہ، یہ تمام وہ صفات ہیں جن کے کسی گوشہ کو ثابت کرنے کے لئے عقل کی رسائی عاجز ہے اس پر اتفاق کرنا ممکن ہے، لیکن تمام انسانوں کے خیالات کا بجز معدودے چند کے اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان کے نفس کے لئے بقا ہے وہ بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے وہ فنا کی موت نہیں مرجاتا، مقررہ موت تو ایک قسم کا روپوش ہو جانا اور نظروں سے اوجھل ہو جانا ہے اگرچہ اس بقا کی تصویر کشی میں انسانی طبقات کے خیالات مختلف اور گوناگوں ہیں"

یہ عام شعورِ عقلی گمراہی یا وہمی رجحان شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ تو ان الہامی کیفیات میں سے ہے جو اس نوع کے ساتھ خاص ہیں، اگرچہ بعض افراد انسانی اس نظریہ کے

کے مخالف ہیں وہ اس شعور کا انکار کرتے ہیں اسی طرح ان کے علاوہ ایک اور گروہ کا یہ خیال ہے کہ کسی کام کی رہبری کے لئے عقل اور فکر کافی نہیں ہیں، یا یہ کہ عقل کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی اعتقاد کا یقین رکھے بلکہ ان لوگوں کا دعوی ہے کہ عالم کا کوئی وجود نہیں ہے یہ ایک خیالی اختراع ہے ان کو اپنے اس شک وشبہ میں بھی شک ہے، ایسے اشخاص کے انکار کی وجہ سے اس عام الہام کی صحت میں نکتہ چینی کی گنجائش نہیں جو تمام افراد نوع میں یہ شعور واحساس پیدا کرتا ہے کہ فکر اور عقل ہی دونوں محدود مدت تک زندگی کے رکن اور بقار کی اساس وبنیاد ہیں، اسی طرح عقول ونفوس کے اندر یہ شعور وادراک پیدا کرایا گیا کہ یہ تھوڑی سی عمر انسانی وجود کا منتہی نہیں بلکہ انسان اس جسم عنصری سے اسی طرح نکل جاتا ہے جیسا کہ کپڑا بدن سے نکل جاتا ہے پھر دوسری ہیئت میں وہ زندہ اور باقی رہے گا اگرچہ اس کی حقیقت کا ادراک نہ ہوتا ہو۔

"ہر نفس یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر غیر متناہی معلومات کو بیشمار طریقوں سے قبول کرنے کی استعداد ہے۔ غیر محدود لذتوں سے محظوظ ہونے اور ایک حد وغایت تک رک نہ جانے کی اس کے اندر صلاحیت ہے، یہ کمال کے درجات تک جس کے گوشے وسیع اور جس کے حدود غیر محدود ہیں رسائی حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہے، مختلف خواہشات گوناگوں میلانات شہوات اور بیجا نات کا نشانہ ہے اس کے جسم پر مختلف امراض کے حملے ہوا کرتے ہیں، یہ متنوع حاجات وضروریات کی جولانگاہ ہے، غرض کہ اسی قسم کے بیشمار عوارض وکیفیات جن کی نہ حد ہے نہ گنجائش، اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں، یہ ایسا الہام ہے جس کو اس شعور کے بعد اس امر کی طرف متوجہ کر دیتا ہے کہ واجب الوجود نے مختلف انواع مخلوقات کے اندر بقار حیات کی حاجت کے مطابق استعداد مقرر کی ہے، اس استعداد کو اس نے اٹکل اور بیجا اندازہ سے تصور نہیں کیا جس نوع کے اندر غیر منتہی معلومات، لامحدود آلام ولذائذ اور وسیع کمالات کو قبول کرنے کی استعداد ہو یہ صحیح نہیں کہ اس کی بقار چند دنوں

یا محدود سے چند سالوں تک ہی ہو

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر حواس ودیعت فرمائے ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے نفس کی حفاظت اور جلب منافع اور اسی قسم کی اپنی ضروریات کا ادراک کرتا ہے، اسے ایسی عقل سے آراستہ کیا ہے جو حق و باطل اور نفع و نقصان کو تمیز کر سکتی ہے اُسے اپنے نفس میں پیدا ہونے والے میلانات اور خواہشات و جذبات کے ادراک کے لئے وجدان عطا کیا ہے انسان کو عقل اور وجدان دونوں کی حاجت ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مدد و معاون ہے علم صحیح وجدان کو سنبھالے رکھتا ہے اور وجدان سلیم علم کا قوی ترین مددگار ہے،

بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور وجدان کے درمیان تضاد اور اختلاف ہے، مثلاً تمھاری عقل کسی کام میں ضرر محسوس کرتی ہے لیکن تم اپنے ضمیر و وجدان کی اتباع کرتے ہوئے وہ کام کر دیتے ہو، مگر واقعہ میں تضاد و اختلاف موجود نہیں جو ظاہراً عقل میں جاگزیں ہو گیا تھا وہ صرف کسی اور کے قول کا ایک عکس تھا جو تمھارے سامنے پیش کیا گیا اور یہ علم صحیح کی بنیاد پر قائم نہ تھا یا یہ کہ تمھارے وجدان و ضمیر نے جو گمان کیا وہ محض ایک وہم تھا جو تم پر غالب ہو گیا، یا یہ موروثی عادت تھی،

انسان کی ضروریات اور اس کے قوائے مدرکہ مختلف قوموں اور افراد میں مختلف و متنوع ہیں جن کے درجات کی کوئی انتہا نہیں یہ تمام اختلافات جنس، ماحول، اور معاشی حالات کے تابع ہیں، مختلف قومیں اور افراد انسانی قوت ذاکرہ، خیال اور فکر میں باہم دیگر متفاوت ہوا کرتے ہیں۔

انسان کی فطرت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ زیادہ نفع بخش اور بہترین چیز کو پسند کرتا ہے، لیکن چونکہ وہ مدنی بالطبع پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ تدریجی عمل اور تعاون کے ذریعہ شخصی اور نوعی کمال کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے، عمل علم کے بغیر

ممکن نہیں، اور علم کسب ہی سے ہو سکتا ہے اب انسان کے سامنے اچھائیاں، برائیاں فائدے اور نقصانات موجود ہیں، اس میں افراد قومیں اور قبیلے برابر شریک ہیں، ان تمام میں انسان جہل کا نشانہ ہے اور جہل انسان کے لئے معیوب چیز ہے، افراد انسانی اور جماعتیں جرم کا ارتکاب کریں گی اور جہاں انھیں منافع حاصل کرنے کا گمان ہوگا یہ ایک دوسرے پر ظلم کریں گی لہٰذا ان کی فطرت حق و صداقت کی خواہش کرے گی جس میں ان کی بھلائی اور بہتری وابستہ ہو لیکن حق کی تحدید و تعیین میں اور نفع بخش حقوق کو ضرر رساں لبطلان خیز چیزوں سے تمیز کرنے میں ان کی عقلیں غلطی کر جاتی ہیں،

باطل فطرۃٔ انسان کی خصوصیات میں سے نہیں ہے لیکن وہ ان اعراض میں سے ہے جو اس کے اپنے افعال میں اور علم میں مختار اور ذی ارادہ ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف صورتوں میں وارد ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ دین کا محتاج ہے تاکہ وہ اس کی عقل اور فطرت کو مساعد اور ہم آہنگ بنا دے،

انسان دنیا میں ایسی حالت میں پیدا کیا گیا ہے کہ شہوات اس کو چار و لطرف سے گھیرے ہوئے ہیں، خواہشات و میلانات اس پر سائبان کی طرح مسلط ہیں، امیدوں اور آرزوں کا وہ پابند ہے، یہ جس چیز کو حسین ٹھرائیں وہ حسین سمجھنے لگتا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تقریباً فطری اور طبعی ہے اس پر انسان نہ غالب آسکتا ہے اور نہ اس سے رہائی پا سکتا ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی سطوت میں کمی اور اس کے غلبہ کی حد بندی ممکن ہے۔ علاوہ بریں یہ نہ تو کسی کے بس کی بات ہے اور نہ کسی شخص کے حد امکان میں ہے اس کی مدافعت کی وہی طاقت رکھتا ہے جو بلند ہمت اور فراخ حوصلہ ہو، اس پر وہی قابو پا سکتا ہے جو تیز فہم اور ذکی ہو تاکہ وہ حوادث کو زیر کر کے اپنے گوناگوں مقاصد کے مطابق مختلف وسائل کو اور اپنے متنوع اغراض کے لحاظ سے متعدد ذرائع کو استعمال کرنے پر قابو رکھے۔

انسان کی شان بھی عجیب ہے، وہ اپنی عقل کے زور سے ملکوت کے اعلیٰ مراتب پر چڑھ جاتا ہے، اپنی فکر کے بل بوتے پر عالم جبروت کے بلند مقام پر گام فرسا اور اپنی قوت کو اس درجہ بلند کر دیتا ہے کہ کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پھر جب اس کے سامنے کوئی ایسا امر پیش کیا جائے جس کے سبب سے وہ ناآشنا اور اس کے مقصد و منشا سے ناواقف ہے تو اس کے روبرو اپنی گردن جھکا دیتا ہے"

محمد عبدہ کا خیال یہ ہے کہ تمام انسان مورد تی لطائف و حقوق اور اللہ کیطرف منسوب ہونے میں بالکلیہ مساوی ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے بھی یہی فرمایا ہے، اس باب میں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں

"آیت فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ"
(سورہ ۳ آیہ ۱۹۷) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"عذاب سے نجات اور حسن ثواب کی کامیابی کا اعتبار محض حسن عمل اور خلوص کار میں ہے ان تمام امور سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد اور عورت اللہ کے نزدیک جزا میں یکساں اور مساوی ہیں جب کہ ان دونوں نے برابر کا عمل کیا ہے اعمال ہی ان دونوں کے درمیان فضیلت و ترجیح کا معیار ہیں۔

جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اسلام سے پیشتر تمام قومیں عورت کا حق ہضم کئے ہوئے تھیں اور اس کو ایک چوپایہ سمجھتی تھیں، جو مرد کی مصلحت اور اس کی شہوت کے لئے مسخر ہے، نیز اس کو یہ علم ہو کہ بعض مذاہب نے تو عورت کو مرد پر محض اس وجہ سے فضیلت دے رکھی تھی کہ مرد مرد ہے اور عورت عورت بعض لوگوں نے عورت کو دینی فرائض کا اہل نہیں شمار کیا تھا ان کا گمان تھا کہ عورت میں ابدی روح نہیں ہوتی جس کو یہ تمام معلومات ہیں وہ حقیقی طور پر اسلامی اصلاح کی قدر کرے گا اور قوموں کے

عقائد اور ان کے معاملات کے لئے اسی کو بیش قیمت قرار دے گا، اور اس کے روبرو واضح ہوجائے گا کہ اہل فرنگ عورت کی برتری اور مرد کے مقابلہ میں اس کی مساوات کے اعتراف کا جو دعوی کرتے ہیں وہ سراسر باطل ہے اس کا سہرا اسلام کے سر ہے ان کے دینی اور تمدنی قوانین اور رسوم میں اب تک عورت پر مرد کو ترجیح دی جاتی ہے، ہاں ان کے لئے یہ دلیل پیش کرنا جائز ہے کہ مسلمانوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کو اس کے حقوق و فرائض سے آشنا کرنے میں کوتاہی سے کام لیا ہم بھی معترف ہیں کہ ہم قصور دار ہیں اور ہم اپنی دینی ہدایت کو پس پشت ڈال بیٹھے ہیں۔"

محمد عبدہ نے جبر و اختیار کے موضوع میں اپنے قلم کی جولانی دکھانے میں بہت توجہ صرف کی ہے۔ اس اعتبار کے دو سبب ہیں جنھیں آپ نے اپنے مقالہ 'قضا و قدر' میں ذکر کیا ہے جس کو آپ نے جریدہ العروۃ الوثقیٰ میں نشر کیا۔

پہلا سبب یہ ہے کہ اہل فرنگ ممالک اسلامیہ کے موجودہ انحطاط و زوال کو اس امر پر محمول کرتے ہیں کہ عقیدہ قضا و قدر ان کے اندر جاگزیں ہوگیا ہے اور وہ اپنے تمام مہمات امور کو قدرت الٰہیہ کے سپرد کر بیٹھتے ہیں" آپ اس رائے کی قطعی تردید اس طرح کرتے ہیں کہ

"موجودہ دور میں کوئی مسلمان خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھے ایسا نہیں پایا جاتا جو جبر محض کے مذہب کا پیرو ہو اور سلب اختیار کا عقیدہ رکھتا ہو بلکہ یہ تمام مسلم فرقے اپنے اعمال میں جزئی اختیار کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کو وہ کسب سے موسوم کرتے ہیں، یہ کسب و اختیار ان کے نزدیک ثواب و عذاب سے متعلق ہے۔"

اس تردید کے خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرا سبب جس کا ذکر آپ نے اپنے مقالہ میں کیا ہے مسلمانوں کے پاس اس عقیدہ کے وجود کے اقرار پر مشتمل ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے بعض عوام کے نفوس میں

یہ عقیدہ جبر کے عقیدہ کے شائبوں کے ساتھ خلط ملط ہوگیا ہے بسا اوقات یہ ان کو بعض ان مصائب میں مبتلا کر دینے کا سبب تھا جنھوں نے آخری دور میں ان کو آگھیرا"

دوسرے مقام پر آپ فرماتے ہیں کہ "میں اس مسئلہ یعنی مسئلہ کسب و اختیار کا منکر نہیں ہوں اس کو اسلام میں بہت اہمیت حاصل تھی لیکن خوش قسمتی سے مرور زمانہ سے بعض ایسی حقیقتیں روشن ہو رہی ہیں جو لوگوں کو راہ حقیقت تک رہنمائی کرتی اور ان کو ان کے پروردگار کی کتاب اور ان کے نبی کی ہدایت کی طرف لوٹنے کی جانب پیشوائی کر رہی ہیں"

آپ اسی مقابل رائے پر توجہ دیتے ہیں چنانچہ ہم رسالۂ توحید میں دیکھتے ہیں کہ اسی عبارت کو بار بار دہراتے ہیں جس کو متکلمین نے پیش کیا ہے، جو اس امر کے قائل ہیں کہ انسان اپنے ایمان کا آپ مختار ہے اور اللہ نے جو اس کو دیگر اعمال کا مکلف بنایا ہے اس کا وہ ذمہ دار ہے آپ پوری قوت اور نہایت وضاحت کے ساتھ شعور انسانی کو بیدار کرتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں خود مختار اور آزاد ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جوابدہ، وہ خود اس کو محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے اختیاری اعمال کا مدرک ہے وہ اپنے افعال کے نتائج کا وزن کرتا ہے اور اپنے ارادہ سے ان کا اندازہ لگاتا پھر اپنی قوت کے بل پر ان کو ظاہر کرتا ہے، ان تمام پر ایک سلیم العقل اور باہوش و حواس انسان اپنی طرف سے گواہی دیتا ہے کہ وہ موجود ہے اس میں وہ کسی رہبر کا محتاج نہیں جو اسے اس کی طرف رہنمائی کرے اور نہ اسے کسی معلم کی ضرورت ہے جو اس کو یہ راز سمجھائے"۔

پھر آپ اس چیز کو ثابت کرتے ہیں کہ انسان مشاہدہ کے ذریعہ سے بھی جانتا ہے کہ کائنات میں ایک قوت ہے جو اس کی قوت و طاقت سے کئی گنا بڑھی ہوئی ہے لیکن اس کے باوصف وہ اپنے باقی حصہ کو فراموش نہیں کر سکتا شرائع و ادیان اسی پر قائم ہوئے اور اسی کی وجہ سے اس پر ذمہ داریاں عائد کی گئیں، جس نے اس میں سے ذرا برابر انکار کیا تو گویا اس نے اپنے ایمانی مقام کا بھی انکار کر دیا، یہی اس کی عقل

ہے جس کو اللہ نے اپنے اوامر و نواہی میں خطاب کرنے کا شرف بخشا"

محمد عبدہ نے سورۂ عصر کی تفسیر کے دوران میں اس موضوع سے متعلق اپنی رائے کو وضاحت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں

"وجدان گواہی دیتا ہے اور حس مشاہدہ کرتی ہے کہ انسان اپنے بعض افعال میں مختار ہے ...."

پھر قرآن نے اپنا قول پیش کیا "بما کنتم تعملون" اور کہا "وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم" ایک دوسری آیت میں ہے "واللہ خلقکم وما تعملون" اگر تسلیم کر لیا جائے کہ "ما تعملون" سے مراد بعینہٖ عمل ہے تو عمل کو ان کی طرف نسبت دی گئی، اسی اصول پر شریعت کے تمام احکام قائم ہیں،

اگر بندہ کے فعل کی کوئی حقیقت اور اس سے کوئی منفعت وابستہ نہ ہوتی تو اس کو اس فعل کا ذمہ دار ٹھہرانا اور اس کا مکلف قرار دینا باطل ہو جاتا، عقل، شرع، حس اور وجدان گواہ ہیں کہ انسان کا فعل خود اس کا فعل ہے، اور تمام اشیاء کائنات کا مرجع اللہ کی ذات ہے اور ممکنات کا وجود محض اس کی طرف نسبت دینے کے لئے ہے لیکن در حقیقت ان کا ذات باری تعالیٰ سے ہٹ کر کوئی اعتباری وجود متصور نہیں،

اسی قسم کی بحث قدرت خداوندی کی عظمت کے باب میں کی جاتی ہے اگر اللہ چاہے تو ہمیں عطا کردہ قدرت و اختیار کو سلب کر لے، چنانچہ یہ حقیقت ہے جس کو ہم روز مرہ مشاہدہ کرتے ہیں، ہم کسی چیز کی تدبیر کرتے ہیں پھر اس کے واقع ہونے میں ایسے موانع و مشکلات درپیش ہو جاتی ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا، ہم ایک کام شروع کرتے ہیں پھر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہم میں سکت باقی نہیں رہتی، یہ تمام اس وجہ سے ہے، جس میں نزاع کی گنجائش نہیں، کہ اللہ تعالیٰ کا علم گذشتہ و آئندہ کے امور کو شامل ہے، اس پر دلیل و برہان قائم ہو چکی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں

پھر محمد عبدہ اس سے ایک علمی نتیجہ پر پہنچے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"پس ہر مسلمان کے لئے یہ اعتقاد رکھنا واجب ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق ہر چیز کا خالق ہے اور اس کا اقرار کرے کہ یہ عمل اسی کی طرف منسوب ہے جیسا کہ وہ اس کے نزدیک بدیہی ہے اور اس کے حکم کے بموجب عمل کرے اور جن چیزوں میں اس کے اختیار کو جو خود اپنے نفس میں پاتا ہے استعمال کرنے سے منع کیا ہے اس سے پرہیز کرے"

محمد عبدہ کا نظریہ یہ ہے کہ اگر حادثات و واقعات کے لئے اللہ کی قضا و قدر کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس کا اخلاق پر عظیم الشان اثر ہو گا، لہٰذا قضا و قدر کا اعتقاد اگر جبریہ کے عیب سے علیحدہ ہو جائے تو اس سے جرات، اقدام اخلاقی شجاعت اور بسالت پیدا ہوتی ہے، اس کو خوفناک مقامات میں گھسنے پر آمادہ کرتا ہے جس سے شیروں کے دل لرز جاتے اور چیتوں کا پتہ پانی پانی ہو جاتا ہے، یہ اعتقاد نفوس کے اندر ثبات اور استقلال پیدا کرتا، تکالیف کو برداشت کرنے، مصائب سے مقابلہ کرنے کے جذبہ کو بیدار اور جود و سخا کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، اس کو نہ صرف دشوار گذار مرحلوں سے نکل جانے کی دعوت دیتا ہے بلکہ روحانی قوت خرچ کرنے اور زندگی کی راحت و آسائش کو راہ حق میں قربان کرنے پر ابھارتا ہے، یہ تمام خوشنودی رب کی خاطر ہے، جس نے اس عقیدہ پر اعتقاد رکھنے کی نفس انسانی کو دعوت دی ہے۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عمر محدود ہے، اور کائنات کی تمام چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے وہ اپنے حقوق کی مدافعت اپنی ملت کی سربلندی اور اللہ کے عائد کردہ فریضہ کو انجام دینے میں موت سے خوف کیسے کھا سکتا ہے راہ حق میں اپنا مال خرچ کرنے سے فقر کا ڈر اس پر کس طرح غالب ہو سکتا ہے الٰہی احکام و اوامر پر اپنے مجد و شرف کی تعمیر اور انسانی اجتماعات کے اصول کو مستحکم کرنے

میں کسی کا رعب اُسے کس طرح مرعوب کر سکتا ہے؟

محمد عبدہ کا نظریہ یہ تھا کہ عقیدۂ قضا و قدر کے لئے زبردست علمی قوت ہے اسی لئے آپ نے جمہور کو اس عقیدہ کو حقیقی معنی میں سمجھنے کی طرف رہبری کرنی چاہی چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"ہم دورِ حاضر کے معتبر علماء سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس شریف عقیدہ پر جو توہمات کا غبار چھایا ہوا ہے اس کو پاک کرنے کی کوشش کریں عوام الناس کو اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کے طریقوں سے آگاہ کریں ان کے درمیان ہمارے ائمہ و پیشوا مثلاً امام غزالی وغیرہ کے آثار و اقوال کو پھیلائیں، کہ صبر و توکل اور قضا و قدر کا مطالبہ شریعت نے ہم سے عمل میں کیا ہے، کاہلی اور بیکاری میں توکل اور قضا و قدر کا بہانہ ڈھونڈھنا فعل عبث ہے، اللہ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ ہم اپنے فرائض کو پس پشت ڈال دیں اور جن امور میں ہمیں توکل کرنا واجب ہو ہم ان پر توکل کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔

آپ کا نظریۂ نبوت

نبوت کے موضوع پر محمد عبدہ نے تفصیل کے ساتھ اپنی رائے پیش کی ہے اس موضوع پر آپ نے رسالۂ توحید میں مستقل بحث کی ہے، اس رسالہ میں آپ نے نبوت اور اس کے متعلقہ امور پر تقریباً آٹھ ابواب لکھے ہیں جو پورے رسالہ کا ایک تہائی حصہ پر مشتمل ہیں،

اس موضوع کے متعلق اپنی دوسری تصنیفات میں بھی لکھا ہے خصوصاً اپنی قرآنی تفسیر میں اکثر مناسب مقامات پر رسولوں کے اعتقاد کی اہمیت کو بیان کیا ہے محمد عبدہ کی رائے یہ ہے کہ رسولوں پر ایمان دین اسلام کا لب لباب ہے یہی وہ اساس الہی ہے جس میں تینوں بڑے آسمانی ادیان یہودیت، عیسائیت اور اسلام مشترک ہیں آپ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام اس میدان میں دوسرے ادیان پر فائق ہے۔

رسولوں پر ایمان لانے کو اسلام میں اس کے تمام ادوار میں بہت ہی اہمیت حاصل تھی لیکن محمد عبدہ اس کے تمام اخلاقی گراں مایہ اصولوں کو بیان کر کے اس کے لئے نئی شان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جو دور حاضر کی زندگی میں ان بیش بہا اخلاقی اصولوں کو اجاگر کرتی ہے آپ اپنی تحریروں میں رسولوں کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں، جن کے مابین شناخت ممکن ہے، ایک نفسیاتی طریقہ ہے دوسرا اجتماعی،

نفسیاتی طریقہ کی ابتداء موت کے بعد بقاء نفس کے اعتقاد سے کرتے ہیں، کیونکہ انسان بلحاظ اس کے کہ وہ ایک عاقل، مفکر اور باشعور ہستی ہے ایسی ضرورتوں اور قوتوں کو محسوس کرتا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مادی فرومایہ وجود کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں

اور یہ اس کی توجہ اس زندگی کے بعد کی زندگی کے وجود میں ایک طرح کا اعتقاد رکھنے کی طرف منعطف کراتی ہیں۔ ان تمام کو انسان اپنی فطرت سے معلوم کرتا ہے، لیکن جب وہ اس دوسری زندگی میں بحث کرنے کا قصد کرے کہ وہ کس طرح ہوگی، یہاں تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے اور اس تک رہنمائی کیسے ہوگی، حیات اخروی کی تیاری کے لئے اس دنیا کی زندگی میں کیا کرنا پڑے گا، یہ تمام امور اندھیرے میں نظر آئیں گے اور اس کو ہر طرف سے تحیر دامنگیر ہوگا اُسے ایک ایسے معلم کی ضرورت ہوگی جو اس سے زیادہ با حکمت ہو تاکہ اس کے دل میں اطمینان پیدا کرلے اور اس کو اس راہ پر گامزن کرے جس پر چل کر وہ سعادت دارین کی نعمت سے مالا مال ہو۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض پیش کرے کہ انسانی طبائع اور ضمیروں میں ضرورت کے مطابق علم کیوں نہیں ودلیعت کر دیا گیا، تاکہ انسان اپنی فطرت کے ذریعہ وہ راستہ معلوم کرلے جو سعادت عظمیٰ تک پہنچانے والا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان ایک متفکر ہستی ہے مختلف افرادِ انسانی میں استعداد کے مختلف مراتب ہیں، انسان کے وجود کا سہارا بحث اور استدلال ہے اگر اس کی حاجات وضروریات کا الہام ان کو کر دیا جاتا جیسا کہ حیوانات کو الہام کیا جاتا ہے۔ تو وہ نوع انسانی میں شمار نہ ہوتا بلکہ یا تو وہ ایک اور حیوان ہوتا یا کوئی فرشتہ ہوتا جو اس زمین کے بسنے والوں میں سے نہ ہوتا۔

باقی رہا دوسرا اجتماعی طریقہ تو اس کو آپ نے متعدد مقامات پر معمولی سے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول "کان الناس امۃ واحدۃ" (سورہ ۲ - آیت ۲۰۹) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

> "یہاں امۃ واحدۃ سے مراد دین واحد نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مفسروں کا مسلک ہے بلکہ امۃ واحدہ مراد ہے، جس کے معنی انسانوں کا ایک ساتھ اقتصادی اور اجتماعی روابط و تعلقات رکھنے کے ہیں، یہاں تک کہ کسی فرد کے لئے ناممکن ہے کہ

وہ اوروں سے جدا رہ کر زندگی بسر کرے اور ایک دوسرے کی مدد نہ کرے،
لوگ ایک ساتھ مل کر زندگی نہیں گزارتے تھے، ان میں سے ہر شخص اپنی مصلحت
اور اپنی زندگی کی ضروریات فراہم کر لیتا تھا، یہ امر لازمی تھا کہ انسانوں کے طبائع کا اختلاف
اور ان کے قوائے عقلیہ کا تفاوت ان کے درمیان نزاع و اختلاف کا موجب ہو کیونکہ ان
کے باہم جذبۂ مسابقت پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے رسولوں
کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو سکھائیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کے حق کا پاس رکھیں ان
کے سامنے وہ حقائق سمجھائیں جن کے ذریعہ ان کو دنیا کی اس زندگی میں سعادت تک
پہنچنا ممکن ہو اور دوسری زندگی میں سعادت و فلاح کی تحصیل ہو سکے،
ان رسولوں نے انسانوں کو اس زندگی اور دوسری زندگی میں ناکامی و نامرادی
سے ڈرایا، جب کہ وہ ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا چھوڑ دیں، لہذا انسانوں کے
طبائع اور ان کے میلانات کافی نہیں ہیں کہ ان کو لقاء اللہ کی طرف اپنی کوششیں
صرف کرنے کے لئے متوجہ رکھیں، وہ ایک اور قسم کی رہنمائی کے محتاج ہیں، جو کفر و ہدایت
میں تمیز کر سکے، یہی ہدایت انبیاء کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے
پھر آپ نے رسالہ توحید میں استدلال کیا ہے کہ محبت اور عدل دو ورابطے
ہیں جو انسانی جماعت کو مربوط استوار کرتے ہیں، لیکن تمام انسان ان دونوں سے
وابستہ و پیوستہ نہیں ہوتے، جس طرح تمام کے تمام عقل کی رہبری کے تابع نہیں ہیں
ایک جماعت ایسی بھی ہے جو ظلم و انانیت سے چھٹکارا پانے کی قدرت نہیں رکھتی، یہی
ظلم و انانیت اختلاف اور دشمنی کا سبب ہیں ان دونوں کے شر سے جماعت کو نجات
دلانے اور اس کو خوشگوار اور بہترین حالت میں کرنے کے لئے سوائے رسولوں کی تعلیمات
اور ان کی خارق العادۃ اخلاقی تاثیر کے سوائے اور کوئی چیز قدرت نہیں رکھ سکتی،

انسانی جماعت کی زندگی کے تین دور ہیں جو بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے ادوار

سے مشابہ ہیں جن سے ہر فرد کو گذرنا پڑتا ہے، جماعت اپنے دورِ طفولیت میں وجودِ طبعی کی ضرورتوں کے تابع ہوتی ہے، وہ محض مادی حاجتوں اور ان ضرورتوں کا اہتمام کرتی ہے جو اس کے وجود اور نفس کی حفاظت کر سکیں، اس کے پاس اتنا وقت اور فرصت نہیں ملتی کہ وہ اس سے بلند تر مقصد کی طرف توجہ کرے، یہ دور جو دورِ حجری سے نحاسی اور نحاسی سے دورِ حدیدی تک مختلف آلات کے ردوبدل کا دور کہلاتا ہے یہی صناعات کی نشوونما اور فنون کی ترقی کا دور بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا قانون قوموں میں بعینہ وہی ہے جو افراد میں ہوا کرتا ہے، یعنی ان میں بھی ان کے نشوونما کے تدریجی مراحل ضعف سے قوت اور نقص سے کمال تک اللہ کا قانون جاری ہے، اس دور میں انسان اپنے احساسات کی تاثیر کا تابع اور اپنی نفسانی تحریکات، خوفناک خیالات و ہیجانات کا مطیع ہوتا ہے،

پھر انسانوں کو تجربہ سے رفتہ رفتہ بعض ان مبادی کا علم ہوتا گیا جن سے ان کی مشترکہ زندگی کا نظم و ضبط برقرار رہتا ہے بچپن کا مرحلہ طے کر کے انھوں نے سن رشد کی اولین منزل میں قدم رکھا اور ان میں نبوت سے کسبِ فیض کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی، ظہورِ نبوت اور اس کی دعوت کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت وہ مرحلۂ شباب ہے جس میں عقل قوت کی منزل اور غلبہ کے مقام تک پہنچتی ہے، جس میں نفوس کو خواہشات و شہوات نفسانی کے ہجوم کے وقت جلبِ منافع اور دفعِ مضرات میں تصرف کی قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ گمراہیوں میں گرنے سے محفوظ رہ سکتے ہیں، ان کی جولانگاہیں وسیع اور زاویۂ نظر دور رس ہوتے ہیں، یہاں بعض افراد سے انسانی جماعت کو خوف لاحق ہوتا ہے جیسا کہ شباب کی قوتوں سے خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جسمانی نشوونما کے کمال بلوغ کو پہنچنے کے بعد نوجوان کو ہلاکت میں ڈالدیں گے اور اس کے سامنے خواہشات نفسانی اپنی واضح صورت میں جلوہ گر ہونگی،

جس طرح اللہ کی حکمت یہ ہے کہ نوجوانوں کو اپنے سن رشد تک پہنچنے کے وقت، جس میں شہوت کا ہجوم ہوتا اور میلانات وہیجانات کی حاجت کا قوی احساس ہوتا ہے قوت عقل عطا کرے، تاکہ وہ اس خارزار میں اس کی رہنمائی کرے، اسی طرح انسانی جماعت میں اللہ کی سنت جاریہ ہے، جب کہ وہ اپنے افراد کے معارف ومعلومات میں اس حد تک پہنچ جائے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ رسولوں اور نبیوں کو بھیجتا ہے، اور ہر قوم کی طرف اس کے نفسانی حالات اور اس کے عقلی مقام کے مطابق کھلم کھلا نشانیاں رونما کرتا ہے۔"

چونکہ قوموں میں مختلف استعداد اور صلاحیت ہے اس لئے ایک قوم اس امر کی اہل ہوتی ہے کہ اس میں عہد نبوت کو سب سے پہلے پیش کیا جائے، اور یہ پہلی قوم اسی کی سزاوار ہے کہ وہ آنے والی قوم کے لئے امام وپیشوا ہو یہی قانون الٰہی مخلوق میں جاری ہے۔

یہ جدید نورانی دور، یعنی ظہور نبوت کا دور، خیر وسعادت کا دور ہے، ہدایت پانے والوں کے درمیان اخوت وہدایت کا دور ہے، جس میں ان کے اعمال درست ہوتے ان کے نفسانی کمالات کی طرح اوروں کی تکمیل کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور یہ لوگ اوروں کی فضا کو پُرنور بناتے ہیں جس طرح انھوں نے اپنے ماحول کو منور کر لیا ہے اسی طرح وہ اس فہم وتدبر پر برقرار رہتے ہیں جو ان کو انبیاء کے ذریعہ دیا گیا اور ان حدود میں ثابت رہتے ہیں، جو ان کے عقول ونفوس کو پابند بنایا گیا ہے، جن چیزوں کا ان کو حکم دیا گیا ہے یہ ان پر کاربند ہوتے اور جن چیزوں کی دعوت دی گئی ہے ان پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

پھر تیسرے دور کا ظہور ہوتا ہے، یہ دور وہ ہے جب کہ عہد نبوت پر زیادہ عرصہ گذر جاتا ہے تو دل پراگندہ ومنتشر ہو جاتے ہیں، اذہان ونفوس پر تاریکی کے

بادل چھا جاتے اور ان پر شہوات وخواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے، دعوت کی گہرائی تک پہنچنے سے علم کی قوت کمزور و ماندہ پڑ جاتی ہے دین کا علم رکھنے والے دینی نصوص کو دینی احکام کے خلاف استعمال کرنے لگتے ہیں، اختلاف اور اضطراب واقع ہو جاتا ہے وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ طاغوتی نظام کے نقش قدم پہ چلنے لگتے اور گمراہ کن سیاست کی پیروی کرنے لگتے ہیں، یہ دوریوں ہی باقی رہتا ہے یہاں تک کہ لوگ اصلاح کی طرف رخ کرتے اور دین کی اطاعت کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

پس انبیاء کی بعثت انسانی ہستی اور اس کی بقاء حیات کی اہم حاجتوں کی تکمیل ہے، نوع انسانی میں اس کا مقام وہی ہے جو کسی شخص کی عقل کا مقام ہوا کرتا ہے انبیاء کی ضرورت محض صفات باری تعالیٰ سے انسانوں کو روشناس کرانے کے لئے در پیش ہوتی ہے نہ کہ اس کے وجود کا اعتقاد دلانے کے لئے، کیونکہ اللہ کا وجود عقل اور دلیل سے پہچانا جاتا ہے۔

انبیاء کا فریضہ وہ نہیں ہے جو فنون وصناعات کے معلمین و مدرسین کا فریضہ ہوا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کے وسائل اور آرام و آسائش کے ذرائع کے حصول کے لئے انسان کی فطرت میں ان کی طرف رہبری کا ادراک ودیعت کر دیا ہے انبیاء نے جو قوانین اللہ کی جانب سے پیش کئے ہیں ان کا کام اجمالی طور پر ان ارتقائی مراحل تک پہنچنے کا راستہ بتا دینا ہے جن کو اللہ نے انسانی فطرت میں پوشیدہ رکھا ہے۔

لیکن انبیاء کی زبانی دنیوی امور اور علوم و معارف مثلاً آسمانوں کے احوال اور زمین کی ہیئت کے متعلق جو اشارہ پایا جاتا ہے اس کا مقصد محض یہ ہے کہ ان میں فکر و نظر صرف کر کے خالق کی حکمت کا اندازہ کیا جائے یا اس میں غور و خوض کر کے اس کے اسرار و عجائبات کا ادراک کیا جائے"

پھر آپ فرماتے ہیں :-

"مفسرین نے وحی کی تعریف یہ کی ہے کہ وحی اللہ کا کلام ہے جو اپنے کسی نبی پر نازل ہوتا ہے لیکن ہم وحی کی تعریف ہمارے اصول کے مطابق یہ کرتے ہیں کہ وحی ایک عرفان ہے جس کو وہ شخص اپنی طرف سے یقین کے ساتھ بالواسطہ پاتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے ....."

آپ عرفان اور الہام میں یہ فرق کرتے ہیں کہ

"الہام وہ وجدان ہے جس سے نفس یقین حاصل کرتا ہے۔ اور بلا احساس و شعور کہ وہ کہاں سے آیا ہے خود بخود اس کے مطالبہ کی طرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے' یہ بھوک' پیاس اور خوشی اور غم کے وجدان کے مشابہ ہے لیکن یہ وجدان صرف ان ہستیوں کے لئے ممکن ہے جن کو اللہ برگزیدہ بنا تا اور بلندی فطرت کے لئے ان کو مخصوص گردانتا ہے ان کے عقول کو صحت و درستی سے اور ان کے اقوال کو راستبازی سے سنوارتا ہے' ان کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے جو انسانی سیرت کو آسودہ کر دیتے ہیں اور ان کے جسموں کو ان چیزوں سے پاک صاف کرتا ہے جن سے نگاہیں کتراتی اور ذوق سلیم ناپسند کرتے ہیں"

لیکن انبیاء سے ان چیزوں میں فروگذاشت کا واقع ہونا' جن کا تعلق نہ اللہ کی ذات سے ہے اور نہ تشریع میں ان کو کوئی دخل ہے' تو بعضوں نے اس کو جائز کہا ہے لیکن جمہور اس رائے کے مخالف ہیں'

مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کھجوروں کا جوڑا لگانے (تلقیح) کو منع فرمایا پھر پھلوں میں اس کی اثر اندازی کی وجہ سے مباح قرار دیا تو اس کی علت غائی محض لوگوں کو یہ معلوم کرا دینا ہے کہ وہ کسب معاش اور صناعات کے جو وسائل اختیار کر رہے ہیں' وہ ان کے تجربات و معلومات پر موقوف ہیں'

اللہ نے جو قصۂ آدم اور درخت کا پھل کھانے سے نافرمانی کی حکایت کی ہے تو اس میں پھل کھانے کو منع کرنے اور پھر اس پر گرفت کرنے کا راز پوشیدہ ہے، اس کی حکمت کا مقصود و منتہا جو ہم نے معلوم کیا ہے یہ ہے کہ یہ بنی آدم کے ذریعہ آبادی دنیا کا ایک سبب تھا، منع کرنا اور پھر وہ پھل کھالینا یہ دونوں آدم علیہ السلام کے وجود کی طرف دو رمزی اشارے ہیں یا یہ عالم وجود میں نوع انسانی کے مظاہر میں سے دو مظہر ہیں (اللہ ہی بہتر جانتا ہے)

کسی عقلی دلیل یا شرعی برہان کو پیش کرکے جمہور کے اس مسلک و نظریہ کی تردید بہت دشوار ہے

انبیاء اپنی نبوت کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے معجزات کے ساتھ جو مبعوث ہوتے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ ان کی تائید کرتا ہے، معجزہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ماننے سے عقل انکار کرے، کیونکہ عالم ایجاد میں مخصوص و معروف طبیعی رفتار کا کبھی خلاف ہوجانا ایسی حقیقت ہے جس کو محال قرار دینے کے لئے کوئی دلیل اب تک پیش نہیں کی گئی کیونکہ ناموس کو وضع کرنے والا ہی کائنات کا موجد ہے اس کے لئے یہ محال نہیں کہ وہ خوارق عادات کے ذریعہ خاص نوامیس کو وضع کر دے، حاصل کلام یہ کہ ہم ان معجزات کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے، لیکن ان کا اثر ان برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ مشاہدہ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نوازتا ہے۔

ہمیں اللہ کی قوت اور اس کے ارادہ کا جو اعتقاد حاصل ہے اس کی روشنی میں ہم کو یہ معلوم کرنا سہل ہے کہ اللہ کے لئے یہ ممتنع نہیں کہ وہ کوئی حادثہ خواہ وہ کسی ہیئت کا کیوں نہ ہو اور کسی سبب سے کیوں نہ ہو، رونما کر دے، جبکہ اسکے علم میں پہلے سے یہ آچکا ہو کہ وہ حادثہ اسی طرح رونما ہوگا"

انبیاء کی رسالت کی صحت پر دلیل یہ ہے کہ ان کے غذا اور علاج ہی کی

بدولت دلوں کی بیماریوں کو شفا نصیب ہوتی ہے، وہ اپنی ان قوموں کے کمزور عزائم اور مضمحل عقلوں کو قوت و طاقت سے تبدیل کر دیتے ہیں جو ان کی ہدایت پر کاربند ہوتی ہے"

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء میں آخر، ان سب میں رتبہ میں اونچے اور خاتم المرسلین ہیں آپ کی نبوت پر تمام نبوتیں اور آپ کی رسالت پر تمام رسالتیں ختم ہوگئیں، جیسا کہ اس کی تصریح کتاب اللہ نے کی، آثار و سنن صحیحہ اس کی تائید میں ہیں اور آپ کے بعد نبوت کے دعویداروں کی ناکامی و شکست اس پر بین شہادت ہے"

آپ نے اپنی نبوت کا اس وقت اعلان کیا جب کہ ایران و روم دائمی نزاع میں گرفتار تھے، حکام وقت عیش و عشرت اور اسراف میں زندگی بسر کر رہے تھے رعایا کو اپنی میراث سمجھتے تھے، دین و اخلاق پر تباہی و بربادی کے بادل منڈلا رہے تھے، خود بلاد عرب میں قبیلے مختلف رجحانات اور خواہشات میں سرگرداں تھے، ان کے درمیان خانہ جنگیاں اور خونریزیاں برپا تھیں، ان کا اخلاقی نظام درہم برہم ہو چکا تھا" الغرض ہر قوم کے نظام اجتماعی کا بندھن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور ہر جماعت کے نزدیک زندگی کے تمام نظاموں کی کڑیاں بکھر گئی تھیں"

اس وقت رسول کے پیش نظر یہ اہم کام تھا کہ وہ اپنی امت کو اور ساری دنیا کو اس شر و فساد سے نجات دلائے، جو اس پر مسلط ہو چکا ہے آپ نے کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کیا جس میں آپ حکومت یا سیاسی قیادت (لیڈرشپ) کا مطالبہ کرتے، قریش خود اس قسم کی چیزوں میں فکر کرنے سے علیحدہ تھے، ان کو حسب و نسب کی شرافت کا جو مقام حاصل تھا وہ اسی پر قناعت گزیں تھے،

آپ ایک فقیر منش تھے آپ کو اپنی قوم میں ایک اوسط مقام حاصل تھا نہ آپ کے پاس مال تھا نہ جاہ و حشمت نہ لشکر تھا، نہ مددگار، نہ شعر کہنے کا سلیقہ تھا،

نہ کتاب لکھنے یا پڑھنے کی مہارت اور نہ خطابت میں شہرت، آپ کے پاس کوئی ایسی چیز بھی تو نہ تھی جس سے عوام الناس کے دلوں میں آپ کی قدر و منزلت کی دھاک بیٹھتی یا اس کے ذریعہ آپ خاص طبقہ میں کوئی بلند مقام حاصل کرتے، لوگ آپ کے قول کی پروا نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے آپ نے دلیل و برہان سے ان کا مقابلہ کیا، حجت سے ان کی مدافعت کی، پند و نصیحت کے ذریعہ ان سے گرفت کی،

پھر آپ کو یہ قوت قاہرہ اور یہ عظیم الشان غلبہ و اقتدار کہاں سے آ گیا؟

آپ کی رسالت ہی تھی جس نے آپ کو بلند ترین مقام تک پہنچا دیا، جبروت اعلیٰ کا خطاب ہی تو تھا، عنایت ربانی کی ندا ہی تو تھی جس نے آپ کو جاہلیت کی طوفان خیز گھڑیوں میں اور ضعف و کمزوری کے عالم میں قوت و ہدایت عطا کر دی یہی وہ گراں قدر حکم الٰہی تھا جو کانوں سے ٹکراتے ہوئے پردوں کو چاک اور حجابوں کو پارہ پارہ کرتے ہوئے اپنے مختار و برگزیدہ بندے کی زبان سے دلوں میں اتر رہا تھا۔

نبوت پر اس سے برتر اور کون سی دلیل و برہان ہے؟

ایک اُمّی مصنفین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں غور و تدبر کریں، علم و حکمت کے مدارس سے دور رہنے والا علما سے ببانگ دہل کہتا ہے کہ وہ اپنے علم اور اپنی معلومات میں بحث و تمحیص کریں۔

آپ کے بیان کا جادو اور آپ کی حکمت اور قوت یہ تمام معجزات ہیں جو آپ کے صدق رسالت کی تائید کر رہے ہیں

"قرآن بذات خود بہت بڑا معجزہ ہے اس کی بلاغت اور اس کے اسلوب کا اعجاز اس انتہا تک پہنچ چکا تھا کہ عہد نبوی اور اس کے بعد بھی اس قسم کی کوئی چیز

پیش کرنے سے عرب کے فصحاء، بلغاء، عاجز و درماندہ ہو گئے، موجودہ دور میں بھی اس کی بلاغت انتہائی حد تک پہنچ چکی ہے۔

جب عربوں میں قرآن مجید کے مقابلہ کرنے کی تاب و ہمت باقی نہیں رہی حالانکہ عربی ان کی اپنی زبان ہے، تو بھلا یہ تصور میں آنے والی چیز ہے کہ دوسری کوئی قوم اس کا مقابلہ کر سکے۔

یہ معجزہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کسی انسان کی انشاپردازی کا نمونہ نہیں بلکہ ایک نور ہے جو آفتاب علم الٰہی سے چمک رہا ہے"

اولیاء کے متعلق اعتقاد

یہ موضوع سابقہ بحث سے قریبی تعلق رکھتا ہے، محمد عبدہ نے اس میں ان ابواب میں تفصیل سے بحث کی ہے جو نبوت کے متعلق لکھے ہیں۔

اس باب میں آپ نے جن مسائل پر گفتگو کی ہے یہ ہیں، اولیاء کا مرتبہ و مقام انبیاء کی طرف نسبت کرتے ہوئے، ان کا خوارق عادات کو پیش کر سکنا اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ ان سے راضی اور خوش ہے۔

مسلمان اس قسم کے خوارق کو کرامات سے موسوم کرتے ہیں، تاکہ ان کرامات اور انبیاء کے معجزات کے درمیان شناخت کی جا سکے، مسلمان ابتداء اسلام سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ بعض مردوں اور عورتوں میں اللہ کے قریب ترین مرتبہ تک پہنچنے کی قدرت ہے اور وہ مسلسل تقویٰ، صلاح، عبادت گزاری اور زہد فی الحیات کی بدولت رضاء الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض خوارق عادات کو رونما کرنے کی قدرت عطا کی ہے۔

جب تصوف نے مختلف رنگ بدلے اور خصوصاً درویشوں کے طریقوں کا ظہور

ہوا اور یہ طریقے بہت شدت پکڑ گئے تو متصوفانہ رسوم میں وسعت ہوگئی، اور اسلام میں اولیاء کے بارے میں اعتقاد داخل ہوگیا اور اہل سنت کے عقیدہ کا ایک جزء بن گیا۔

چونکہ اولیاء تقرب الی اللہ کی وجہ سے ایسے مرتبہ پر فائز ہوجاتے تھے جہاں تک ایک معمولی انسان نہیں پہنچتا، اس لئے لوگوں نے یہ عقیدہ رکھ لیا کہ اللہ کے نزدیک اولیاء کی شفاعت کو اثر اور قوت حاصل ہے اسی طرح اولیاء کے قبور کی زیارت سے برکت حاصل کرنا جمہور مسلمین کے عقیدہ کا ایک جزء ٹھہر گیا،

محمد عبدہ فرماتے ہیں:

"ارباب نفوس عالیہ اور فہم وعقل معروف اشخاص ان لوگوں میں سے ہیں جن کے مرتبے انبیاء کے مرتبوں تک نہیں پہنچے، لیکن عوام الناس اس امر پر رضامند ہیں کہ ان کے لئے اولیاء ہوں چنانچہ ان میں سے اکثر اشخاص ایسے ہیں، جو اس نوع اور طبقہ کے حالات کے مشابہ اپنا حلقہ اثر بڑھا لیتے ہیں، ان کو بعض حالات میں عالم غیب کی بعض چیزوں سے آگاہی ہوتی ہے اور ان کو عالم مثال میں بعض صحیح مشاہدے حاصل ہوتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا......"

وہ اپنے دعوے کی صحت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ان کے اندر صالح اثر کا ظہور اور ایسے درست اعمال کا انکشاف ہوا ہے، جو ان کے انبیاء کی شریعتوں کے مخالف ہے، دنیا اس قسم کے لوگوں کا سوانگ بھرنے سے خالی نہیں، لیکن بہت جلد ان کی اصل حقیقت طشت از بام ہوجاتی ہے، ان کا انجام اور ان کے مریدوں کا انجام جن کو انھوں نے دھوکہ دیا ہے، بہت برا ہوتا ہے ان کے برے اثرات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی عقلیں گمراہ، اخلاق میں فساد اور قومی حالت میں انحطاط واقع

ہوجاتا ہے "

پھر آپ بیان کرتے ہیں کہ جمہور اشاعرہ کرامات کے واقع ہونے کے جواز کے قائل ہیں اگرچہ معتزلہ اور بعض اشاعرہ اس کے منکر ہیں ..... "

" وقوع کرامات کے جواز کی بحث تقریباً وہی بحث ہے جو انسانی نفوس کے جذبات و تخیلات اور کائنات سے ان کے علاقہ پر شامل ہے نیز اعمال صالحہ کے درجہ پر اور عنایت الہٰیہ کے طفیل سے مقامات کمال تک نفوس کے ارتقا پر مشتمل ہے یہ ایک دقیق بحث ہے جو کبھی دوسرے علم کیساتھ مختص ہے لیکن مجرد عقلی جواز اور غیر نبی کے ہاتھوں کسی خارق عادت کا صدور جس میں قدرت الہٰیہ شامل ہے میں نہیں سمجھتا کہ یہ نزاع اور بحث کا موضوع ہو جس پہ عقلا اختلاف کریں لیکن جس امر کی طرف التفات کرنا واجب ہے وہ یہ ہے کہ اہل سنت اور ان کے علاوہ دوسرے طبقات کا اتفاق ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد کسی معین ولی اللہ کے ہاتھوں کسی معینہ کرامت کے واقع ہونے کا اعتقاد واجب نہیں، لہٰذا ہر مسلمان کے لئے اجماع امت سے یہ جائز ہے کہ وہ کسی کرامت کے صدور کا خواہ وہ کسی ولی کی کیوں نہ ہوں انکار کر دے اس کا یہ انکار نہ تو دینی اصول کے مخالف ہوگا نہ سنت صحیحہ سے ہٹا ہوا اور نہ ہی صراط مستقیم سے منحرف ہوگا "

پھر آپ فرماتے ہیں کہ " یہ اصل کہاں سے ان کے ہاتھ آگئی جس پر اس زمانے میں مسلمانوں کا عام طبقہ کاربند ہے جہاں وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ آجکل کرامات اور خوارق عادات مختلف پیشے قرار پا گئے ہیں جس میں اولیاء ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور باہمی فخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ان کے ایسے شیوے ہیں جن سے اللہ اور اس کا دین اور اس کے اولیاء اور تمام اہل علم اپنی بیزاری ظاہر کرتے ہیں "

یہاں شیخ عبدہ کا کلام جمہور مسلمین کے درمیان اولیاء کی کرامات میں جو فاسد اعتقاد پھیل گیا ہے اس کے بارے میں نرم اور لطیف ہے، لیکن دوسرے مقامات میں خاص کر آپ کی تفسیر قرآن میں شدت سے ان کی تردید کرتے اور ان لوگوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں جو اولیاء کی تقدیس میں مبالغہ کرتے، مسلسل ان کی قبروں کی زیارت کرتے رہتے، ان کی سفارش کے خواہاں ہوتے اور خود کو دجالوں اور اہل مکر و فریب کا تختۂ مشق بناتے ہیں، عوام کے دل غیر مالوف طبیعی مظاہر سے گھبرا جاتے ہیں۔ جب ان پر خود ان کے اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو یہ اس کو کسی ولی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، اسی وجہ سے تم انھیں ہمیشہ مضطرب اور خائف پاؤ گے، ان کو اندیشہ اور خدشہ لگا رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا، کیونکہ ان کا ایمان غیر صادق ہے، بلکہ ان پر الحادی جذبات و تخیلات بھی غالب ہو جاتے ہیں جو ان کو ہمیشہ زمانے کے حوادث سے خائف بنا دیتے ہیں۔

محمد عبدہ نے رسالۂ توحید میں انبیاء و غیرھم کی شفاعت کے مسئلہ کو نہیں چھیڑا بلکہ اس پر اپنی تفسیر میں بحث کی ہے،

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول "واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیأ ولا یقبل منھا شفاعۃ ولا یوخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون" (سورہ ۲۔ آیۃ ۴۸) پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی دلیل نہیں جو ہماری اس مراد پر دلالت کرے جن کو ہم نے مسئلہ شفاعت میں ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں اور اس قسم کی دیگر آیتوں کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد یہ بیان ہے کہ وہ ایسا دن ہوگا جس میں تمام رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ خاندان اور حسب و نسب باطل ہو جائے گا، وہاں اس زندگی کے طور طریقے کام نہ آئیں گے، کیونکہ یہاں انسان کے اختیار میں

یہ تھا کہ وہ اپنی طرف سے سفارش کر دیتا اور کچھ رشوت یا فدیہ کے ذریعہ سلاطین اور امراء کے پاس شجاعت کی داد پا لیتا، اس کے لئے دنیا میں چند ایسے مددگار فراہم ہو جاتے جو یکساں طور پر حق و باطل پر اس کی امداد کیا کرتے تھے، بلکہ اس دن اس کے پروردگار کے ساتھ اس کی الگ ہی شان ہوگی جس میں اس کے تمام وسائل کمزور پڑ جائیں گے، صرف اس کا خلوصِ عمل باقی رہ جائیگا جس کو اس نے اپنی موت کے آنے سے پیشتر انجام دیا تھا، اس کا معاملہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوگا یہ ایسا دن ہوگا جس میں کوئی ذرہ اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہ کرے گا اور نہ کسی کو اتنی طاقت ہوگی کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی زبان ہلائے یوم لا تملک نفس لنفس شیئاً والامر یومئذ للہ "

یہود جو اس حقیقت ثابتہ کے بیان کے مخاطب ہیں، دیگر جاہل قوموں اور بت پرست اہل ملل مثلاً قدیم مصریوں اور یونانیوں کی طرح آخرت کے امور کو دنیا کے امور پر قیاس کیا کرتے تھے، ان کا وہم و خیال یہ تھا کہ گنہگار دل کی طرف سے فدیہ دے کر جو ان کے گناہوں کا عوض ہے یا سفارش کے ذریعہ جیسے بعض مقربین اپنے حاکم تک پہنچاتے ہیں، عذاب الٰہی سے نجات دلائی جا سکتی ہے اسلام نے توحید خالص کے ذریعہ اس قسم کے عقائد اور عملی آثار کو کالعدم قرار دیا اور ان کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا، لیکن مسلمان ان کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اسلام میں بعض ایسی قومیں داخل ہو گئیں جو بت پرستوں کے اوزار اٹھائے ہوئے تھیں، نہ انھوں نے دین کو قرآن سے سیکھا تھا اور نہ اس کو اس طرح حاصل کیا تھا جیسا کہ قرآن نے ہدایت کی تھی، لیکن انھوں نے ایسے لوگوں کی تقلید کی جو دین کو کما حقہ نہیں جانتے تھے ان کو انھوں نے ان کے تقلیدی کتابوں نے جو عجیب و غریب اصطلاحات کے ذریعہ جیسی تلقین کی ویسے ہی سکھلا دیا

یہ اس ادھوری ترجمانی کی وجہ سے اپنے معتقدات دیرینہ پر بحال اور اسلامی معلومات سے عاری رہے، پھر دوسرا گروہ آیا جس نے عمداً فساد اور بگاڑ پھیلایا اس نے تاویل کے ذریعہ باطل کو حق اور جھوٹ کو سچ ٹھہرایا......'

پھر آپ نے ان کفارہ کو پوری کرنے والی چیزوں کا ذکر کیا، جن پر یہود عقیدہ رکھتے تھے مثلاً گناہوں کی قربانی، سلامتی کی قربانی اور جو قربانی نہ کر سکے تو صرف دو کبوتر ہی قربان کر دے، ان سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا' آپ کہتے ہیں کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تمام چیزیں بذات خود گناہوں کا کفارہ ہیں، درحقیقت یہ تمام عقوبات ہیں کفارہ کو پورا کرنے والی نہیں، کیونکہ جو شخص توراۃ کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقی کفارہ کو پورا کرنے والی چیز توبہ اور گناہوں سے رک جانے کا نام ہے، پھر قربانی کا پیش کرنا تربیت و عقوبت ہوگا' اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو خبر دی ہے کہ قیامت کے دن کوئی تاوان انسان کے بدلے میں قبول نہیں کیا جائے گا'

یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انبیاء کی طرف ان کے انتساب کی وجہ سے وہ آگ میں نہیں داخل ہونگے اور آگ تو انھیں صرف چند دن چھوئے گی، کیونکہ قیامت کے دن ان کا اثر اور سوخ اور ان کا مرتبہ ہوگا وہ اپنی اولاد کو عذاب میں چھوڑنے پر رضامند نہ ہونگے، پھر مستزاد یہ کہ ان کے علماء و احبار اپنے مریدوں اور منسوبوں کی شفاعت کریں گے، جب دین کمزور پڑ جائے تو رؤساء دین کا حق ہوگا کہ وہ ان عقائد کو عوام الناس میں رائج کریں تاکہ وہ اپنے منافع حاصل کریں،

یہود انہی توہمات و اعتقادات میں گرفتار تھے یہاں تک کہ اسلام نے اس قسم کی آیتیں پیش کیں اور اس عقیدہ کو باطل قرار دیا تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ انسانوں کو قیامت کے دن ایمان خالص اور عمل صالح کے ذریعہ اللہ کی رضامندی

خوشنودی ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

محمد عبدہ کی یہی رائے ہے شفاعت کے بارے میں، اس کے بعد یہ معلوم کرکے تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ محمد عبدہ کو اصل شفاعت کے منکر ہونے کا الزام دیا گیا ہے۔

رشید رضا یہ گفتگو کے دوران میں ہم نے اس تہمت پر کسی ایک استاد کی تردید کی ہے، یہ ان اشخاص میں سے تھے، جنہوں نے محمد عبدہ کو اس موضوع میں بحث و نزاع کرتے ہوئے سنا تھا

محمد عبدہ کہتے ہیں:

"میں محفل شفاعت میں حاضر ہوا جس میں مسلسل دو گھنٹے تک بیان کی قوت، تعبیر کی جدت اور تاثیر کی فضیلت پر تقریر کی گئی"

آخر میں آپ فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ شفاعت ایک ثابت شدہ امر ہے۔ کتاب و سنت اور اجماع کے بعد کسی مومن کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن ہم اس کو لوگوں کے نزدیک جو مشہور و معروف لغوی شفاعت ہے اس پر قیاس نہیں کرتے یعنی جو شخص انتقام کا مالک ہو اس کے پاس کسی سفارشی شخص کو واسطہ بنایا جائے تاکہ وہ اس کو اپنے ارادہ سے باز رکھے اور اس کے نظر میں مجرم کی سزا کو معلوم کرائے، اس کے لئے وہ اپنی تیزی طبع سے ہمہ قسم کی نرم کلامی اور لطف آمیز باتیں استعمال کرے یہاں تک کہ اس کے غضب کا زور ٹوٹ جائے یا اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے اس وقت اس کی عقوبت میں تخفیف ہوگی یا اس کو وہ درگذر کردے گا، کیونکہ شفاعت کا اس قسم کا تصور اللہ کے نزدیک محال و ناممکن ہے، جیسا کہ علم کلام میں محقق ہو چکا ہے کہ اللہ کا ارادہ اس کے علم کے موافق ہے، مثلاً جب اللہ تعالیٰ زید کو سزا دینے کا ارادہ

کہتا ہے تو اُسے ازل ہی میں اس کے عقاب کا بھی علم ہو چکا ہے اگر اس کے بعد اگر کوئی سفارش کرنے والا (شفیع) درمیان میں آجائے اور اُسے لوگوں کے نزدیک معروف شفاعت پر قیاس کرتے ہوئے اس کے علم و ارادہ سے لوٹا دے تو یہ علم جہل میں تبدیل ہو جائے گا، حالانکہ اس قسم کا قول بالاجماع کفر ہے لہذا شفاعت حق ہو گی اس معنی کا اعتبار کرتے ہوئے نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ اللہ جانتا اور چاہتا ہے کہ وہ فلاں مجرم و گنہگار کو عذاب نہ دے بلکہ اس کو محض اپنے فضل و کرم سے معاف کر دے، لیکن قیامت کے دن شفیع کی فضیلت کے اظہار کے لئے معافی کا ظہور موقوف ہو گا شفاعت کی اس صورت پر جو اس دن شفیع کے لئے حاصل ہو گی"

آپ کا نظریۂ اخلاق

محمد عبدہ کی رائے میں عقل وہ قوت ہے جس کے ذریعہ انسان حق و باطل میں تمیز اور اچھی اور بری چیزیں شناخت کرتا ہے اسی سے وہ آراء و نظریات، کردار و اعمال کا ذاتی حسن و قبح اور ان کا اعتباری اثر معلوم کرتا ہے

آپ فرماتے ہیں

"ہم اپنے نفسوں میں لازمی طور پر حسین و جمیل اور بدصورت چیزوں کے درمیان تمیز کرنے کا ذوق پاتے ہیں، اگرچہ حسن و جمال کے معنی میں لوگوں کے مختلف نظریات و مسالک ہیں، لیکن بعض ایسی اشیاء ہیں جن میں کسی کو اختلاف نہیں مثلاً پھولوں کے رنگوں کا حسن و جمال، یہ جمال ہمارے دلوں میں مسرت و بہجت کی لہریں دوڑا دیتا ہے، جیسا کہ بدصورتی نفرت یا خوف

کے جذبات پیدا کر دیتی ہے،

اس قسم کی تمیز کی قوت انسان بلکہ بعض حیوانوں کے خواص میں داخل ہے، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اشیاء کا حسن وجمال کیا ہے اور ان کا قبح کیا ہے اس کے مابین تمیز کرنا انسانوں بلکہ بعض حیوانوں کی خصوصیات ہیں، یہ حقیقت جیسا کہ گزشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے محسوسات میں نمایاں ہے شاید یہ اس درجہ واضح نہ ہوتا کہ عقل اس کو معقول موجودات میں شمار کرتی ہے اگرچہ ان میں جمال کے نقاط نظر مختلف ہوں

معقولات کا کمال واجب الوجود کی طرح ہے۔ اور ارواح لطیفہ اور انسانی نفوس کی صفات کے لئے بھی حسن وجمال ہے جس کو عارفین کے نفوس اور مشاہدین کی نگاہیں محسوس کرتی ہیں، نقص اور عیب کے لئے بہر حال قبح ہے جس کو بلند تر احساسات رکھنے والے انکار نہیں کرتے، کیا لوگوں میں بھی کوئی ایسا شخص ہوگا جو کمزوری عقل، دوں ہمتی، اور پستی ارادہ کے قبح کا منکر ہو؟

کیا کسی عاقل کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ موجودات کونیہ میں جس چیز کا قائل ہے اسی طرح افعال اختیاریہ کا قائل نہ ہو، حالانکہ یہ الخفض کی ایک قسم ہیں اور ہمارے حواس اور مدارک عقلیہ میں ذاتی یا اثری طور پر واقع ہوتی ہیں اور ان کے اثرات ونتائج سے ہمارے نفوس متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ وہ کائنات کی صورتوں اور شکلوں کے اثرات و واردات سے اثر پذیر ہوتے ہیں؟

بعض افعال اختیاریہ وہ ہیں جن سے انسان اپنے دل میں خوشی محسوس کرتا ہے، جن سے نفس ایسا ہی محظوظ ہوتا ہے جیسا مخلوق کے حسن وجمال سے لطف اٹھاتا ہے مثلاً منظم عسکری حرکات، ماہر کھلاڑیوں کی قلابازیاں کھیلوں میں جو آجکل جمناسٹک سے مشہور ہیں اور موسیقی کے اصول وقوانین

کے مطابق آلات طرب سے نغمات ریزی، بعض اختیاری افعال قبیح ہوتے ہیں جن سے وہی اثر محسوس ہوتا ہے جو بدصورت مخلوق کے دیکھنے سے ہوتا ہے مثلاً کمزور دل والوں کا خوف اور گھبراہٹ کے وقت ہوش و حواس کھو دینا بعض افعال رنج و غم سے اثر پذیر ہو کر قبیح ہو جاتے ہیں اور بعض لذت و سرور یا منافی الم چیزوں سے خوشگوار ہو جاتے ہیں، پہلے کی مثال چوٹ اور زخم اور ہر وہ چیز ہے جو انسان کے افعال کو الم انگیز بنا دیتی ہے، دوسرے کی مثال بھوک کے وقت کا کھانا اور پیاس پر پانی پینا اور ہر وہ چیز جس سے لذت حاصل ہو یا غم غلط ہو،

مذکورہ بالا دونوں معنی کے اعتبار سے بُرے اور خوشگوار افعال میں انسانی تمیز میں اور سلسلۂ وجود میں ارتقا پسند حیوانات کی تمیز و شناخت میں بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ قوت وجدان اور قبح و جمال کے درجہ کی تحدید میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے۔

بعض اختیاری افعال ایسے ہیں جو بلحاظ جلب منفعت کے حسین و خوشگوار ہیں اور بعض ایسے ہیں جو باعتبار مضرت رسانی کے قبیح و ناپسند ہوتے ہیں اس معنی کے پیش نگاہ حسن و قبح کے درمیان تمیز و شناخت کرنا انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے

بعض لذیذ چیزیں سوء انجام کی وجہ سے ناخوشگوار اور قبیح ہو جاتی ہیں مثلاً کھانے اور پینے میں حد اعتدال سے تجاوز کر جانا، گیت اور نغمے سننے سے باز رہ جانا اور خواہشات و شہوات نفسانی کے پیچھے دیوانہ وار پھرتے رہنا کیونکہ یہ تمام فساد صحت کا سبب اور عقل و حواس کو برباد کرنے کا موجب ہیں

بعض الم انگیز اشیاء بھلی ہو جاتی ہیں، مثلاً کسب معاش کے کاموں

یں مشکلات اور دشواریوں کو جھیلنا یا تنگدستی کے زمانے میں دل کی آرزوں کو قابو میں رکھنا اور شہوات و خواہشات کا مقابلہ کرنا وغیرہ

اُن المناک اشیاء میں سے جنھیں انسانی عقل نے خوشگوار شمار کیا ہے حقائق کائنات کے انکشاف پر جو انسانی علم سے پوشیدہ ہیں عزیزیوں کو برداشت کرنا ہے گویا ایک محقق و موحد کو بقدر امکان حقائق کے انکشاف پر جو لذت تسکین حاصل ہوتی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے ان مصائب و تکالیف کی وہ پروا نہیں کرتا اور نہ انھیں وہ خاطر میں لاتا ہے کسی ایسے کام کی طرف ہاتھ بڑھانا جس میں دوسرے لوگ ناکام ہو چکے ہیں اور محسود علیہ کو ہلاک کر کے یا اس کے مال کو ضائع کر کے بغض و حسد کے درد کو تسکین بخشنا لذت ناخوب میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ اس سے عوام پر ایک قسم کا خوف اور رعب طاری ہو جاتا ہے

ان تمام کو انسانی عقل سمجھتی اور مضر رساں اور فائدہ مند چیز میں فرق کرتی ہے پہلے کا نام انسانی فعل اور دوسرے کا عمل خیر رکھا گیا ہے یہی تفریق اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کا سرچشمہ ہے چونکہ ان دونوں میں دیکھنے والوں کی عقلوں میں مختلف درجات تھے اس لئے فکر نظری نے کسی قدر اجمال و تفصیل کے فرق کو ان دونوں میں تحدید کر دی ہے ان ہی دونوں سے اس زندگی میں انسانی سعادت و بدبختی کو متعلق کر دیا ہے جیسا کہ عمران بشری کے نظام اور اس کے فساد و خلل کو اور قوموں کے عروج و زوال کو ان ہی دونوں سے مرتبط کر دیا

یہ تمام عقلی مبادی ہیں عوام یا خواص میں اعمال اختیاریہ کے لئے ذاتی یا ارثی طور پر حسن و خوب ہے ان کے خوب و زشت کی تمیز پر حسن یا عقل نادر ہے

اس پر دلیل ہمارا وہ مشاہدہ ہے جو ہم بچوں کے افعال اور ان کے تاثرات میں شرع کا کوئی معنی و مفہوم سمجھنے سے پیشتر کرتے ہیں نیز اس پر انسانی تاریخ کے واقعات اور اس کے دور جاہلیت کے حالات و معلومات شاہد ہیں"

"باوجودیکہ ارباب عقل و بصیرت خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے اور عقل کے ذریعہ بغیر سنائے زشت و خوب کے پیمانوں کی حد بندی کی طاقت رکھتے ہیں، لیکن اس میں صحیح تحدید کرنے والے اور راہ صواب اختیار کرنے والوں کی تعداد انسانی عقلمند طبقہ میں بہت تھوڑی ہے اور وہ ان پیمانوں پر متفق نہیں ہوتے،

لیکن جمہور انسانوں کی حاجتیں مختلف اور ان کی ضرورتیں رنگ برنگ کی ہیں، ان کے درمیان جذبۂ مسابقت اور نزاع و اختلاف بڑھے چڑھے رہے جس سے وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ان پر خواہشات نفسانی کا تسلط ہوتا ہے اور وہ فطرتی قوتوں سے نبرد آزمائی کیا کرتے ہیں اس لئے محض عقل ان کی ہدایت اور رہنمائی سے عاجز و درماندہ ہے

تاریخ انسانی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کو رسولوں کی ہدایت کی ضرورت ہے تاکہ وہ اسے اُن اخلاقی قوانین اور اعتقادات صحیحہ تک رہنمائی کریں جن سے اللہ راضی ہو اور جو دنیوی و اخروی زندگی میں کسب سعادت کا وسیلہ ہوں"

اب واضح ہو گیا کہ قوموں کی سعادت کے مرتبہ تک پہنچنے کے لئے محض عقل بغیر مرشد الٰہی کے غیر مستقل ہے، نیز یہ اخلاقی نظام کو برقرار رکھنے، عبادات کی اصلاح اور شہوتوں کی روک تھام کے لئے کافی نہیں ہے، لہٰذا انسانی طبیعت کے دوسرے رخ پر اعتماد کرنا ضروری ہو گیا، یہ اس کا وہ دینی وجدان ہے جو ایسا رکن اور اساس ہے جس پر اعتقادا

اور عبادات کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

محمد عبدہ دین کی تعریف اس طرح کرتے ہیں

"دین اختیاری لوازم و ضروریات کے مقابلہ میں فطری جذبات و رجحانات کے زیادہ مشابہ ہے دین انسان کی سب سے بڑی قوت ہے ان پر کبھی ایسے امراض و علل طاری ہو جاتے ہیں جو ان کے علاوہ دیگر قوتوں پر طاری ہوتے ہیں"

اگر انسان کے اسی وجدان دینی سے خطاب کرنے کی طرف توجہ کی جائے، تو اس وقت اس کے اخلاق و کردار میں عقائد کا گہرا اثر ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کا جذبہ عوام بلکہ خواص کے اخلاق میں زبردست عوامل و محرکات میں سے ہے، یہ دینی اقتدار و غلبہ ان کے دلوں میں عقل کی قوت و طاقت سے بلند و قوی تر ہے

حقیقی دین میں عقل و وجدان باہم ملجاتے اور ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنا صحیح کام انجام دے، دین کامل سراپا علم و حکمت ہے عقل و دل کا ذوق ہے، برہان ہے، فکر و وجدان کا یقین ہے، اگر دین میں عقل و وجدان میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہو جائے تو اس کا ایک بازو شل ہو گیا پھر وہ کس طرح ایک بازو سے کام کر سکتا یا ایک پاؤں پر کھڑا رہ سکتا ہے؟"

محمد عبدہ نے اکثر مرتبہ فرد کی زندگی میں اور جماعت کی زندگی میں دین کے اثر اور اس کے مقام پر گفتگو کی ہے، دین ہی قوم کی زندگی کی فلاح اور ترقی کا راز ہے،

سورۃ ۴، آیۃ ۲ا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"انبیاء کا اتباع اور دین کی ہدایت ہی ہر تمدن کی اساس ہے کیوں کہ ارتقاء معنوی ہی ارتقاء مادی پر آمادہ کرتا ہے"

پھر آپ اس نظریہ کی تائید میں "ہربرٹ اسپنسر" کا کلام پیش کرتے ہیں جو فلاسفۂ اجتماعین کا امام مانا جاتا ہے،

نیز آپ نے "اسلام اور دین" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں آپ نے اس سیاسی شخص کے بعض اقوال کو پیش کیا ہے تاکہ نوجوان مصریوں کو یہ بتلائیں کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کے انبیاء کی طرف بھیجی ہوئی وحی پر ایمان لانے سے نہ فکر و نظر کا نقص ہے نہ حقیقی علم کی لغزش، نہ ریاست کا کوئی عیب اور نہ کوئی سیاسی ضعف و اضمحلال،

ذیل کی عبارت آپ کی ان بیشتر تحریروں کا ایک نمونہ ہے جو آپ نے فرد میں دین کے اثر کے موضوع پر لکھیں، آپ کہتے ہیں:

"دین جلوہ گاہ تسکین اور لوائے طمانیت ہے، اسی سے بدنصیب راضی ہوتا ہے اسی پر ہر کار گزار عمل پیرا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے عمل کو ایک مقصد تک پہنچا دے، اسی کے ذریعہ تمام انسانوں کے نفوس کائنات کے عام قوانین و نوامیس کے تابع ہیں، اسی کی بدولت انسان علم و فضیلت میں اپنے سے فوق و برتر ہستی پر نظر رکھتا ہے اور اپنے سے مال و دولت اور جاہ و عزت میں بڑھی ہوئی شخصیت کو ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ اسکے مطمح نظر الہی احکام و اوامر کا اتباع ہے"

اخلاق و فضائل کی طرف شیخ نے جو دعوت دی ہے اس کا خلاصہ ہم آپ کے اس قول میں بیان کر سکتے ہیں "صرف ایک خدا پر ایمان لانا عبادت کو اسی کے لئے خالص کر دینا، اعمال خیر میں انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون، اور لبقدر امکان ان کا ایک دوسرے کی ایذا رسانی سے باز رہنا"

پھر آپ فرماتے ہیں کہ "یہی وہ دین اللہ کی روح ہے" "یہ دین اگلوں اور پچھلوں میں ایک ہی ہے" محمد عبدہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے ان تینوں اساسی واجبات یا موزوں الفاظ میں ان دینی رجحانات یعنی ایمان، اخلاص اور باہمی تعاون کو اپنی تمام تعلیمات میں عظیم ترین اہمیت دی ہے، اکثر اوقات آپ نے ان کے ساتھ ساتھ ایک چوتھے فریضہ کا اضافہ کیا ہے اور وہ عدل ہے۔ آپ اس کو سابقہ عبارت کے مشابہ

ذکر کرتے ہیں جس کو آپ نے رسالۂ توحید میں لکھا ہے پھر آپ یکے بعد دیگرے اس پر دوبارہ زور دیتے ہیں، ہم آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالیں گے،

ایمان باللہ دین کا اولین رکن ہے، آپ کی رائے میں یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملائکۃ والکتاب والنبیین۔	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر۔

(سورہ ۲۔ آیۃ ۷۲)

آپ فرماتے ہیں کہ "یہی ایمان ہے اور اس کے وہ اثرات ہیں جو نفس اور عمل میں ظاہر ہوتے ہیں، ایمان بر کی اصل اور بنیاد اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ دل میں دلیل و برہان اور یقین و اذعان کے ساتھ متمکن اور جاگزیں نہ ہو ۔۔۔۔

ایمان سے مطلوب وہ حقیقی معرفت ہے جو عقل پر دلیل کے ساتھ نفس میں یقین و اذعان کے ساتھ مسلط ہو، یہاں تک کہ اللہ اور اس کا رسول مومن کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو جائے اور ان دونوں کا حکم ہر چیز پر غالب ہو جائے۔

تقلیدی ایمان کا فتویٰ تو کبھی دیا ہی نہیں جا سکتا، اس قسم کا مومن مردہ نفس اور پریشان خاطر رہا کرتا ہے، جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ خوشی میں پھولے نہیں سماتا اور جب اسے کوئی برائی پہنچتی ہے تو مایوس اور ناشکرا ہو جاتا ہے"

اور کبھی انسان مسلمان پیدا ہوتا ہے سنے سنائے اسلامی عقائد پر ایمان لاتا ہے لیکن اس کا یہ ایمان خیر و بر کا باعث نہیں ہوتا اگرچہ وہ عقیدۂ سنوسیہ کو ان کے براہین کے ساتھ ہی کیوں نہ حفظ کرلے،

عبادت میں اخلاص پر آپ نے جو زور دیا ہے وہ محض نتیجہ ہے آپ کے اس اعتقاد کا کہ صحیح وجدان دینی کی ضرورت ہے نیز یہ کہ دین کے لئے یہ واجب ہے کہ وہ قلب و وجدان کو نفوس کی درستگی میں اثر انداز ہونے کے لئے مشغول رکھے، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہ محض اعتقادات کی ایک شکل یا خالی رسوم کی ایک صورت ہوگی'

آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلامی عبادات صحیح دینی جذبات و عواطف کو بیدار کرنے اور چمکانے کے لئے ہر طرح موزوں و مناسب ہیں، نماز کی شان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ " اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی جو ہیئت و شکل اختیار کی ہے وہ اس کی شان و عظمت کا مشاہدہ کرنے اور اس کے احسان و کرم کو یاد دلانے کے لئے بہترین مددگار ہے'

رکوع اور سجدہ نفس کے اندر عبودیت کے تصور کو قوی و مستحکم کرتے اور الوہیت کی عظمت اور ربوبیت کی شان کو یاد دلاتے ہیں غرض کہ آپ اسی نہج پر مختلف عبادتوں کی صورتوں پر گفتگو فرماتے ہیں'

آپ کی رائے میں آلی شکل میں فرائض کو ادا کرنے میں بہت بڑی اہمیت ہے اسی لئے آپ اکثر فرماتے ہیں:

یہ تمام (یعنی یہ فرائض جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں) اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عبادت میں اہم چیز اللہ کا ذکر ہے جو نفوس کی اصلاح کرتا اور روحوں کو منور کرتا ہے، تاکہ وہ بھلائی کی طرف متوجہ ہوں اور گناہوں اور برائیوں سے پرہیز کریں'

اسی طرح آپ کا مسلک یہ ہے کہ مذکورہ عبادات کی ادائیگی اسلام کے اہم فرائض میں سے ہے بلکہ آپ کی رائے میں یہی تمام تر فرائض میں اہم ہے' آپ اسکی دینی قدر و منزلت کو بہ اعتبار ان عبادات کے بڑھاتے ہیں، جو قلب و عقل کو اسی طرح مشغول رکھتے ہیں جیسا کہ جسم کو بھی'۔

آپ کی یہ رائے سورۃ ۲ آیۃ ۱۳۹ کی تفسیر بیان کرتے وقت نہایت واضح انداز میں جھلکتی ہے جہاں آپ فرماتے ہیں:

"نماز جس کا ذکر کتاب عزیز میں بار بار آیا ہے اور نمازیوں کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ جا بجا ہوا ہے، اس سے مراد اللہ کی طرف توجہ کرنا، اس کے سامنے حضور قلب، اور اس کے ہیبت و جلال اور اس کے کمال عظمت کے احساس و شعور میں غرق ہو جانا ہے"

یہی وہ نماز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین (سورہ ۲ آیۃ ۴۲)

نماز اس صورت کا نام نہیں جو قیام، رکوع، سجود اور بالخصوص زبانی تلاوت سے ذہن میں مقصود ہوتی ہے جس کا عادی ہو جانا ہر باتمیز بچے کیلئے آسان ہے جس کے عادی ہونے والوں کو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ برائیوں اور فحش کاموں کو کرتے رہتے ہیں اور گناہوں اور قسم قسم کی بدکاریوں کا ارتکاب کرتے ہیں، آخران خفیف حرکات کی بذات خود کیا قیمت ہے؟ اسی لئے اللہ رب العزت نے اس قسم کے رسمی عبادت گذاروں کا وصف اس طرح بیان کیا ہے کہ نماز سوائے خشیت ایزدی سے معمور دلوں کے اوروں پر بار گراں اور بوجھل ہے۔

ان حرکات و اقوال کو نماز کے لئے ایک صورت محض اس وجہ سے گردانا گیا ہے تاکہ وہ غفلت شعاروں کے لئے یاد دہانی اور خود فراموشوں کی آگاہی کا وسیلہ ہو اور ایک محرک ہو جو نمازی کو کعبۂ مقصود کی طرف توجہ کرنے کا سبب بنے، جو دل کو اللہ کی عظمت و شان سے لبریز کر دیتا ہے

نیز آپ فرماتے ہیں:

"اگر تم پر بعض ان بدنی افعال کو انجام دینا دشوار گزرتا ہو تو یہ قلبی عبادت جو نماز وغیرہ کی روح ہے تم سے ساقط نہیں ہو جاتی"

محمد عبدہ فریضۂ حج کے بارے میں بھی اسی قسم کا کلام پیش کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں

"اگر ریاکاری اور شہرت کی محبت حج کا محرک بنے تو اس قسم کا حج ریاکار کیلئے گناہ ہوگا نہ کہ اطاعت گذاری' اگر دوران حج میں ذرا بھی ریاکاری کا شائبہ اس کے دل میں پیدا ہو جائے تو بعض نے کہا ہے کہ اس کا تھوڑا سا حج بھی مقبول نہ ہوگا' کیونکہ یہ وارد ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اسی چیز کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہو"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"دین کے کسی فریضہ کی ادائیگی میں دنیاداری کا کوئی شائبہ آمیز ہو جائے تو عمل اللہ کے لئے خالص عبادت کے دائرہ سے خارج ہو جائیگا اللہ تعالیٰ صرف اسی چیز کو قبول کرتا ہے جو لوثوں' شائبوں اور آمیزشوں سے خالص اور پاک ہو"

پھر آپ عدل کے ساتھ زکواۃ ادا کرنے کے وجوب پر زور دیتے ہیں اور نہایت تلخ لہجہ میں بعض ان لوگوں کی روش کی مذمت کرتے ہیں جو زکوٰۃ کی ادائیگی سے چھٹکارا پانے کے لئے حیلے تراش لیتے ہیں' اور ان حیلوں کو شریعت کیطرف منسوب کر کے ان کا نام شرعی حیلے' رکھ دیتے ہیں آپ اس طبقہ پر غیظ و غضب کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

"اس قسم کی نادانی کو شریعت کی طرف نسبت دینا زکوٰۃ نہ دینے کے مقابلہ میں کفر کی صریح علامت ہے' کیونکہ یہ بعید از عقل و قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کوئی قانون بنائے اور اس پر سختی مرتبہ زور دے پھر وہ اس پر راضی ہو جائے کہ ہم اس کا بہانہ کر دیں اور اس کو ترک کرنے میں دھوکا دیں اور ہم یہ خیال کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مکر و فریب اور بہانہ تراشی کی اجازت دی ہے"

عدل پر گفتگو کے دوران میں آپ کہتے ہیں کہ قتل کے جرم میں قصاص لینا واجب ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر آیا ہے، اگرچہ موجودہ دور کے بعض قانون سازوں کا جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، یہ مطالبہ ہے کہ سزا کا مقصد اصلاحی اور تہذیبی ہونا چاہئیے نہ کہ دل کی بھڑاس نکالنے اور انتقامی جذبہ کی خاطر" لیکن بصیرت رکھنے والا اور قوموں کی مصلحتوں کو جاننے والا جو قومی امور کو قومی مصلحت کے ترازو میں تولتا ہے نہ کہ اپنے خاص وجدان شخصی کے میزان میں، اس امر کو اچھی طرح مشاہدہ کرتا ہے کہ عدل ومساوات کے ساتھ قصاص لینا ہی وہ اصل وبنیاد ہے جو قوموں کی ترقی کا ذمہ دار ہے، اور کسی وقت بھی اس کو چھوڑ دینا بدکاروں کو خوں ریزی پر جرأت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے" چنانچہ نظربندی کا خوف اور مشقت ریز مشاغل کا اندیشہ بعض یورپی ممالک میں قتل کے انتقام سے باز رکھنے کا سبب ہوتا ہے، لیکن دوسرے ملکوں مثلاً مصر میں نظربندی جرم کے ارتکاب کو اور قوی کر دیتی ہے، کیونکہ مجرم قید خانہ کو اپنے گھر سے بہتر خیال کرتا ہے بعض بدبخت اور بدکار ایسے ہیں جو قید خانہ کو مہمان خانہ یا ہوٹل سے موسوم کرتے ہیں،

اوپر ہم نے محمد عبدہ کے آراء وخیالات کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اسلام کے فرائض وعبادات کی تفسیر میں آپ کے طرز واسلوب کی تصویر کھینچتے ہیں، یہی روح آپ پر اس وقت بھی غالب ہو جاتی ہے، جب کہ آپ قرآن کے ان حقائق وامور پر گفتگو کرتے ہیں جو اخلاقی احکام واصول پر مشتمل ہیں، چنانچہ آپ قرآن کے اخلاقی نظام اور اس کے اصولوں کو پیش کر کے عصر حاضر کی ضرورتوں پر ان کو ہم آہنگ ومنطبق کرتے ہیں،

مثلاً آپ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کے احکام بالخصوص شراب نوشی اور جوئے کی گرانی میں تشدد برتنا اچھی ہے، آپ کہتے ہیں کہ طب جدید قرآن مجید کی اس پیش کردہ حقیقت کی پوری تائید کرتی ہے کہ شراب میں فائدے سے بڑھکر نقصان ہے، پھر آپ ان خطرات اور

خوفناک حالات کو بیان کرتے ہیں جو مصریوں میں شراب نوشی کے پھیل جانے اور اس سے پیدا شدہ برے نتائج کے عام ہو جانے سے ظہور کر گئے ہیں

آپ کی نظر میں فضائل و اخلاق عالم انسانی میں اس جذب و کشش کی طرح ہیں جو عالم کبیر میں پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا نظام محفوظ ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے سے مربوط، رذائل اور اخلاق فاسدہ جماعت کی قوتوں کو مضمحل اور پارہ پارہ کر دیتے ہیں،

آپ کے نزدیک اہم خوبی صبر ہے کیونکہ یہی صبر تمام اخلاق و فضائل کا سرمایہ اور جملہ خوبیوں کی اصل ہے، ہر خوبی اور اخلاق اسی کا محتاج ہے، قرآن مجید نے صبر کو ستر جگہ ذکر کیا ہے، اتنی تعداد میں اس نے کسی دوسرے خلق کا تذکرہ نہیں کیا،

آپ فرماتے ہیں کہ "ان تمام آیتوں میں صبر سے مراد ثبات و استقلال کا ملکہ اور برداشت کا وہ مادہ ہے جو خوگر صبر کے لئے حق کی تائید اور اخلاق کی امداد کرنے کی راہ میں پیش آنے والی تمام مشکلات و تکالیف کو آسان بنا دیتا ہے، صبر کا مظہر انسان کا وہ ثبات و استقلال ہے جو کسی عمل اختیاری میں درپیش ہوتا ہے جس کا مقصد ہوتا ہے حق کو ثابت کرنا، یا باطل کو دور کرنا یا کسی عقیدہ کی طرف دعوت دینا یا کسی خوبی کی تائید یا کسی بڑے عمل کی طرف گامزن ہونے کے لئے راستہ ہموار کرنا، کیونکہ اس قسم کے اصول و کلیات ہی میں جو قومی مصلحتوں سے متعلق ہیں، انسانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان میں صبر آزما مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ایسی کٹھن منزلوں میں ثابت قدم رہنے والے اور اپنا فریضہ انجام دینے والے ہی صابر ہوا کرتے ہیں ...... ہر مشکل اور مکروہ عمل کو برداشت کرنے والا صابر نہیں ہوتا"

محمد عبدہ کی رائے میں مسلمانوں کے یا دنیا کی کسی قوم کے اجتماعی اخلاق اور جماعتی تنظیم کو استوار کرنے والا رابطہ صرف اسی وقت پائدار اور مستحکم ہوتا ہے جب کہ وہ باہمی اتحاد

کی اساس اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دعوت کی بنیاد پر قائم ہو' آپ اپنے اس نظریہ کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے پیش کرتے ہیں

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (سورۃ ۳-آیۃ ۳)	تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف دعوت دے' نیک کاموں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکتی رہے'

پھر آپ اس آیت کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ "یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ کوئی قوم ثابت و برقرار نہیں رہ سکتی تاوقتیکہ اس کی ایک جمعیت نہ ہو' جس میں اس کے تمام افراد شامل ہوں اور ان کی ایک وحدت نہ ہو' جس میں وہ باہم ڈگر متحد و مربوط کرے' اسی کے ذریعہ کوئی قوم جسم واحد کی طرح زندہ کہلاتی ہے' یہ آیت ہمیں اسی رابطہ کی نشاندہی کر رہی ہے' آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ اس دعوت الی الخیر کے فریضہ سے باز رہے اور اس طرح یہ فرض کفایہ ہو جائے جیسا کہ بعض مفسرین کا مسلک ہے' بلکہ یہ دعوت فرض عین ہے جس کی ادائیگی ہر مسلمان پر واجب ہے'

پھر آپ فرماتے ہیں کہ گفتگو کی نوعیت اس حد تک ہے مثلاً ہم کسی کو خطاب کریں کہ "میرے لئے تم میں سے دوست ہونا چاہیئے" تو یہ حکم عام ہے اور عمومیت پر دلالت کرتا ہے

پھر آپ اس اعتراض کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بالعموم اس قول پر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ پر کاربند ہونے والے کے لئے ایک درجہ علم و آگاہی ضروری ہے' تاکہ اس کے ذریعہ نیک کام کو جس کا حکم دیا جا رہا ہے اور برے کام کو' جس سے روکا جا رہا ہے معلوم کیا جائے حالانکہ انسانوں میں بہت سے جاہل ہیں جو احکام کو نہیں پہچانتے' آپ اس اعتراض کا اس طرح جواب دیتے ہیں:

"مطلق معروف سے مراد وہ ہے جس کو طبع سلیم اور عقل فہیم رکھنے والے جانتے ہوں' منکر جو اس کا ضد ہے' وہ ہے جس کو راست طبائع اور

عقول سلیمہ ناپسند سمجھیں، اس کو پہچاننے کے لئے نہ حاشیہ ابن عابدین علی الدر کو پڑھنے کی ضرورت ہے نہ فتح القدیر اور مبسوط کو، اس کی طرف رہنمائی کرنے والی سلامتی فطرت کے ساتھ محض کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہے جو تواتر اور عمل سے ہم تک پہنچی ہے"

دعوت الی الخیر کے چار درجے ہیں

پہلا درجہ مسلمانوں کا تمام قوموں کو بھلائی کی طرف دعوت دینا ہے، کیونکہ اللہ کا دین ہے جس نے اپنی طرف تمام انسانوں کو دعوت دی ہے،

دوسرا درجہ مسلمانوں کا اپنے ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دینا ہے اور احکام و فرائض کے اسرار و رموز کو جاننے والے اور حکمت و تفقہ فی الدین سے آشنا رکھنے والے خاص اشخاص کا فریضہ ہے کہ وہ انسانوں کو بھلائی کے طریقے سمجھائیں نیکی کے راستے ان کے سامنے واضح کریں، افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں، وہ اس طرح کہ ان میں سے ہر فرد ایک دوسرے کی خیر خواہی کر اور اس کو بھلائی کی ترغیب دیتا رہے کیونکہ امت کا ہر فرد جب باہمی خیر خواہی اور ا بالمعروف و نہی عن المنکر کی دعوت کا فریضہ انجام دینے پر کمر بستہ ہو جائیگا تو ان کے د شر و فساد کا انسداد ہو جائیگا اور بھلائی و نیکی کا دور دورہ ہوگا، انتشار و پراگندگی کو ا میں نفوذ کرنے کیلئے راہ نہ ہوگی،

محمد عبدہ نے جابجا باہمی تعاون پر جس میں جماعتی صلاح و فلاح مضمر ہے، رفاہ عام کے کاموں پر اہتمام کرنے کی بھی ترغیب دی ہے۔

حقیقی اسلام

محمد عبدہ نے اپنے مناظرہ میں لکھا ہے
"کسی دین پر حکم لگانے یا اس کے کسی مسئلہ کو جانچنے کے لئے اُن عوارض کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس کے بعض پیروؤں کی طرف سے اس پر پیش آئے ہیں یا ان حوادث و افکار کی جستجو کرنی چاہیئے جو بسا اوقات ان کے پاس کسی دوسرے دین سے پہنچے ہیں
اگر اس دین کے بعض اصولوں کے بیان کے اتباع کے لئے کسی قول یا عمل سے استدلال کرنے کا ارادہ کیا جائے تو اس بارے میں دین کے منشاء کو قریب سے سمجھنے والوں یا اُن اشخاص کے قول یا عمل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جنھوں نے اس کی اصلی روح سے حاصل کیا ہے جس کو خود صاحب دین نے پیش کیا ہے"
محمد عبدہ نے اپنی کتاب اسلام اور نصرانیت میں عیسائیت پر گفتگو کے دوران میں یہی مسلک اختیار کیا ہے، نیز آپ نے ان اسلامی اصولوں کی تحدید کے وقت جن کی طرف رجوع کرنا واجبی ہے اور ان اکثر چیزوں کو نظر انداز کر دینے کے وقت، جن کو آجکل اسلامی شمار کیا گیا ہے اور جو اس کی روح کے منافی ہیں، یہی طریقہ کار استعمال کیا ہے،
جب ہم دوبارہ اُن مقاصد کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کو شیخ عبدہ نے اپنا نقطۂ بحث بنایا ہے، تو آپ کو یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں کہ "میں نے ببانگ دہل دو عظیم الشان امور کی دعوت دی ہے، پہلا فکر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرنا، دین کو سلف صالحین کے طریق پر سمجھنا جیسا کہ اختلاف و نزاع کے ظہور پذیر ہونے سے قبل سمجھا گیا تھا اور دینی

معلومات کو حاصل کرنے کے لئے اس کے اولین سرچشموں کی طرف رجوع کرنا"

ہم نے گذشتہ ابواب میں تفصیل سے اس طریقہ کو بیان کر دیا ہے، جس نے اس بنیادی خیال کو میدان عقائد میں مطابق کر دیا ہے، یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں، علاوہ بریں ہم آئندہ باب میں یہ بیان کریں گے کہ کس طرح آپ نے اس خیال کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے یعنی ان اعمال کو نکال دینے کی طرف توجہ دلائی ہے، جو آپ کی نظر میں اسلام کے لئے ضرر رساں ہیں اور اس پر گراں دشوار

اس باب کو ختم کرنے سے بیشتر ہمیں آپ کے اس نہج و مسلک کی طرف جس پر آپ گام فرسا ہیں، عام اشارہ کر دینا کافی ہو گا،

محمد عبدہ فرماتے ہیں کہ" اسلام کا مرکزی رکن یہ ہے کہ عمل کرنے کے لئے کتاب اللہ کا جملہ علم اور سنت سے تھوڑی واقفیت درکار ہے"

اس مختصر سی عبارت کی تشریح اللہ کے اس قول کی تفسیر میں کرتے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعو اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول (سورہ ۴۔ آیۃ ۶۵)	اے ایمان والو! اطاعت کرو تم اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تمھارے حاکموں کی، اگر تم میں کسی چیز کے بارے میں باہمی اختلاف ہو جائے تو تم اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو

آپ نے اس کی ایسی تفسیر بیان کی ہے جو عصر حاضر کے موافق ہے، کیونکہ آپ فرماتے ہیں:

"اللہ کی اطاعت سے مراد اس کی کتاب کو پورے کا پورا حاصل کرنا ہے، کتاب میں دین میں اختلاف پیدا کرنے اور اس میں تفرقہ اندازی سے منع کیا گیا ہے، اللہ کے رسول کی اطاعت اس کی وفات کے بعد یہ ہے کہ اسکے نقش قدم کی پیروی کی جائے"

اعتقادات اور عبادات سے متعلق جتنے امور و لوازم ہیں وہ سب اپنی دونوں سرچشموں کی طرف لوٹتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ان کو سلف صالحین کے طرز تفکر سے بلا کمی بیشی حاصل کرنا چاہیئے،

اولوالامر جن کا تذکرہ اس آیت میں آیا ہے وہ ارباب فکر و بصیرت ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اسلامی اصطلاح میں اہل شوریٰ اور اہل حل و عقد سے موسوم ہیں اور یہی وہ علماء اور ارباب ریاست ہیں جن کو دوسری قوموں کے نزدیک قوم کے نمائندے (نواب) سے یاد کیا جاتا ہے،

لہٰذا ضروری ہے کہ قضائی، حکومتی اور سیاسی امور کو ان اشخاص کے سپرد کیا جائے، تاکہ یہ زمان و مکان کے مطابق مصالح کی حفاظت اور خرابیوں کی روک تھام میں شرعی اصول و قواعد پر قانون نافذ کرنے میں غور و فکر سے کام لیں"

پھر آپ فرماتے ہیں:

اگر ہم اسلامی اصول و ارکان کی طرف رجوع کرلے کے لئے یہ بنیادی رویہ اختیار کریں تو ہمیں ایک ایسی اساس ہاتھ آجائے گی جو تمام مسلمانوں کو مربوط اور ان کی قوتوں کو متحد و مستحکم کردے اور یہی شعار تمام انسانوں کا بن جائے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آجکل اسلام میں جو احکام خصوصاً طلاق، تعدد زوجات اور غلامی وغیرہ اس قسم کے مسائل ہیں وہ دینی اصول نہیں ہیں، زمانہ کی ضروریات اور ماحول کے حالات کے مطابق ان میں تبدیل کردی جاسکتی ہے اس وقت اسلام کی حقیقی طبیعت بلحاظ اس کے آخری دین الٰہی ہونے کے ظاہر ہوتی ہے، یہ اگلے اور پچھلے ادیان میں صرف ایک ہی دین ہے محض اس کی

صورتوں اور مظاہر میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن اس کی روح اور اس کی وہ حقیقت جس کا مطالبہ انبیاء مرسلین کی زبانی تمام دنیا والوں سے کیا گیا ہے وہ ناقابل تغیر و تبدل ہے،

اسلام اس دین حق کی آخری صورت ہے،

مسیحیت کا ظہور ایک ایسے دور میں ہوا جو انسانی ادوار میں سب سے پہلا العقلانی دور کہلاتا ہے، چنانچہ اس نے اپنی تمام تر توجہ انسانی احساس کو تیز تر کرنے کی طرف مبذول کی اور دنیا سے قطع تعلق کرنے اور علیحدہ ہوجانے اور اسی قسم کے ان خلاف فطرت امور کی طرف دعوت دی جو انسانی طبیعت کے مخالف و متضاد تھے چنانچہ مسیحیوں نے اس کا انکار کردیا یا انھوں نے مسیحیت کو اپنی خواہشات اور جذبات کے موافق بنالیا؟

لیکن جب انسانی سوسائٹی اپنے سن بلوغ کو پہنچ چکی اور گذشتہ حادثات و واقعات نے اس کے اندر رشد و ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کردی تو اسلام ظہور پذیر ہوا اس نے عقل کو مخاطب کیا، فکر و فہم کو پکارا اور اپنے ساتھ عواطف و احساسات کو شریک کیا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام بعض پہلوؤں میں گویا ایک ہی پیڑ سے نکلی ہوئی شاخیں ہیں اور وہ پیڑ دین حق ہے۔ ان مختلف شاخوں کا پھوٹنا اپنی وحدت نوعی کو نقصان نہیں پہنچاتا،

علاوہ بریں اگر ہم اسلام میں گہری نظر کریں تو ہم اس میں ان تمام ادیان کے اصول مجتمع پائیں گے، پس اسی لئے اسلام ایمان کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے کے لئے انسانیت کی روح کا بہترین سرمایہ ہے،

اسی لئے اسلام کا بلند نصب العین یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ایک ہی دین حق کے جھنڈے تلے جمع کردے،

آٹھواں باب

محمد رشید رضا اور المنار

ہم نے گذشتہ صفحات میں جابجا محمد رشید رضا کا نام لیا ہے، محمد عبدہ کی پیش کی ہوئی تحریک پر خواہ کوئی کتاب ہو، اس میں محمد رشید رضا کا اکثر تذکرہ کرنے کے سوا گریز نہیں کیا جاسکتا اس لحاظ سے رشید رضا محمد عبدہ کی زندگانی ہی میں ان کے بہت بڑے شاگرد ہیں اور ان کی وفات کے بعد ان کے سیرت نگار ہیں، انھوں نے ہی اپنے استاد کی تصنیفات نشر کیں، ان کی تعلیمات کی تشریح کی سب سے زیادہ انہیں نے ان سے کسب فیض کیا اور ان کے نقش قدم پر چلے،

المنار کے صفحات پر رشید رضا کا نام جابجا درخشاں ہے یہ ایک رسالہ تھا جس کو انھوں نے اپنے استاد کی تعلیمات وخیالات کی نشر و اشاعت اور ان کی اصلاحات کو روبعمل لانے کیلئے بطور ایک آلۂ کار کے جاری کیا تھا،

لہذا اب ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم ایسی ہستی سے بحث کریں جو محمد عبدہ کی تعلیمات کو ان کی وفات کے ایک تہائی صدی تک زندہ کرتی رہی ہم اس رسالہ پر بھی تفصیل سے گفتگو کریں گے جس کو رشید رضا نے تشکیل دیا اور اس کی ادارت کی ہم دوران بحث میں محمد عبدہ کی بعض تجاویز کو اور ان کے شاگرد کی بعض ان کوششوں کو ضمنی طور پر پیش کریں گے، جو شریعت کے ساتھ آپ کی خصوصی اصلاحات، قرآنی تفسیر کی تیاری اور اس تفسیر کو

معرض وجود میں لانے سے متعلق ہیں، مناسب یہ تھا کہ ہم ان کو اس سے پیشتر ہی زیر بحث لاتے کیونکہ محمد عبدہ کی تاریخ سے ان کا قریبی تعلق ہے، لیکن ہم نے اسے پسند کیا کہ یہ تمام مسائل اسی باب میں پیش کریں کیونکہ المنار اور اس کے مدیر سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

محمد رشید رضا

محمد رشید رضا شامی نژاد ہیں، آپ کا خاندان آنحضرت صلعم کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ آپ کے سید کے لقب سے پتہ چلتا ہے، آپ نے شامی طرابلس کے مدارس میں اس دور کے دستور کے موافق جیسا کہ وہ اساتذہ کے علم حاصل کرنے کا طریقہ تھا، تعلیم پائی، جب اپنی علمی تحصیل سے فراغت پائی تو اساتذہ نے آپ کو ۱۸۹۷ء میں عالمی ڈگری (شہادت عالمیۃ) عطا کی،

آپ کے اونچے اسباق کے استاد شیخ حسین الجسر تھے، یہ شامی عالم تھے، انھوں نے ایک کتاب لکھی جس میں اسلام کی طرف سے تمام اعتراضات کا جواب دیا تھا، اور اس کا نام رسالہ حمیدیہ رکھا اور سلطان عبد الحمید کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر پیش کیا،

"مسٹر گرد نیر" کی رائے اس کتاب کے بارے میں یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے رجحان کی تبدیلی کو مغربی محققین کے نظریات کے مقابلہ میں، جو اسلام کے متعلق تھے پیش کرتی ہے اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مصنف متکلم اور فقیہ تھا، اس سے ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ مولف سنی جو کچھ عرصہ پیشتر گذر چکا ہے ملحدانہ آراء و خیالات کی پروانہ کرتا تھا اور تلوار کی دھار سے ان کے مقابلہ کو مناسبت نہیں سمجھتا تھا، لیکن شیخ حسین الجسر اس خیال کا نہ تھا، بلکہ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب وہ وقت گذر چکا جس میں مسلمان اپنے عقیدہ سے غفلت برت سکتے تھے، چنانچہ اس نے یہ استدلال پیش کیا کہ حقیقی انسانیت، مضبوط اخلاق اور عقل سلیم اپنے نمایاں مظاہر کے ساتھ اسلامی عقائد و

احکام میں جلوہ گر ہے نیز وہ مغربی علماء و مفکرین کے ان بیشمار شبہات کی تردید کے درپے ہوگیا جو کسی فلسفیانہ یا مادی اساس پر قائم تھے بلکہ اس نے "ڈاروِن" کے مسلک کو بھی چھیڑا، اس کی رائے یہ تھی کہ یہ مذہب قرآن کے ساتھ معارض نہیں ہے۔

محمد رشید رضا نے شیخ حسین الجسر کے بیشتر اثرات کو بیان نہیں کیا جو ان کے آخری آراء میں رونما ہوئے، حسین کے متعلق جس قدر انھوں نے بیان کیا ہے ان کے پیش نگاہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے شاگرد کی عقل کو محمد عبدہ کے آراء کی جانب جن کو بعد میں اختیار کر لیا تھا، ایک حد تک مائل کر دیا۔

باوجودیکہ شیخ حسین الجسر کے بعض آراء میں تجدید کی ایک روح جلوہ گر تھی لیکن وہ اس طریقہ کار پر رضامند نہ تھے، جس کو بعد میں ان کے شاگرد نے اپنی اصلاحی دعوت کے لئے اختیار کیا تھا، چنانچہ المنار کے پہلے نمبر کے شائع ہونے کے وقت انھوں نے رشید رضا کو ایک خط لکھا جس میں وہ کہتے ہیں

"تمھارا محبت نامہ مجھے ملا، میں نے تمھارے لئے دعائے خیر کی، اس کے بعد المنار اپنی جاذب نظر عجیب چمک کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، لیکن اس میں ایسی تیز شعاعیں جلوہ گر تھیں، قریب تھا کہ آنکھیں چکاچوند ہو جائیں"

رشید رضا نے اپنے ابتدائی خیالات میں سے صرف چند چیزیں پیش کی ہیں لیکن آپ رسالہ العروۃ الوثقیٰ کا جو اثر ان کے دل پر ہوا اس پر شرح و بسط سے روشنی ڈالتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "انھیں اس اخبار کا ایک نسخہ ان کے باپ کے کاغذات میں دستیاب ہوا، انھوں نے نہایت اشتیاق اور بے چینی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا پھر باقی نسخوں کی تلاش میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں پھرتے رہے، یہاں تک کہ بقیہ نسخے حاصل کر لئے اور وہ تمام پرچے فراہم کر لئے جن میں سے چند شیخ حسین الجسر کے پاس سے برآمد ہوئے تھے، العروۃ الوثقیٰ کے مقالات نے ان کے اندر زبردست اور گہرا اثر کیا، اور

یہ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں ان کی زندگی کے رخ کو ایک نئے راستہ کی طرف پھیرنے کا باعث تھے،

اس سے پیشتر آپ تصوف کی طرف مائل تھے اور عبادت اور زہد و تقشف میں اپنے نفس کو مشغول کر دیا تھا، پھر اپنی بستی والوں کو قرآن کی تعلیم دینا شروع کیا، آپ ان کے روبرو قرآن کی ترہیب و انذار کی آیتوں کو بیان کرتے اور خوف کو اُمید پر اور زہد کو دنیا میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کے لئے غالب کیا کرتے تھے،

سب سے زیادہ آپ عقیدہ کی درستگی اور عبادت کو اصلی رنگ میں پیش کرنے میں منہمک تھے، اگر آپ کے دل میں اصلاح کا خیال بھی گذرتا تو اس پر خالص مقامی رنگ چڑھا ہوا ہوتا، جب آپ نے العروۃ الوثقیٰ کا مطالعہ کیا تو آپ کے ان تمام خیالات میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا، اس رسالہ میں اسلامی اصلاح اسلام کی دیرینہ مجد و عزت اور اس کے اختیار و اقتدار کے حصول اور اس اسلامی ضائع شدہ ممالک کے استرداد کی جو دعوت کارفرما تھی، اس نے آپ کا بلند نصب العین قرار دیا اور آپ کی جدید تمناؤں اور عزائم کو بیدار کر دیا،

آپ کہتے ہیں کہ آپ کا سب سے پہلا معلم الغزالی کی کتاب احیاء العلوم تھی، یہی اولین کتاب ہے جو آپ کے قلب و دماغ پر مسلط ہو گئی، آپ کا دوسرا معلم العروۃ الوثقیٰ تھا، جس نے آپ کی زندگی کے دھارے کے رُخ کو پھیر دیا،

ان مقالات کے مطالعہ کا اثر یہ ہوا کہ آپ کو جمال الدین سے، جو اُس وقت آستانہ میں تھے، اتصال پیدا کرنے کا احساس ہوا، چنانچہ ان کو اپنے اس اشتیاق و رغبت کی اطلاع کی، لیکن ان کی یہ آرزوئیں پوری نہ ہو سکیں، کیونکہ جمال الدین آستانہ ہی میں پڑے رہے یہاں تک کہ وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔

جمال الدین کی وفات کے بعد رشید رضا نے شیخ عبدہ کی خدمت سے فیض یاب

ہوتے کئے لئے مصر جانے کا ارادہ کیا، جب طرابلس میں تحصیل علم کے بعد آپ کو موقعہ ہاتھ آیا تو شام کو خیرباد کہہ کر رجب ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء میں مصر کا رخ کیا،

رات میں قاہرہ پہنچے اور صبح سویرے محمد عبدہ کو تلاش کیا اور ان کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہو گئے، اس طرح دونوں کے تعلقات کی ابتداء ہوئی پھر محبت و اتحاد کا یہ تعلق روز افزوں گہرا ہو گیا یہاں تک کہ امام محمد عبدہ ۱۹۰۵ء میں دنیا سے رحلت فرما گئے

محمد عبدہ اپنے شاگرد سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان پر آپ کو کافی اعتماد تھا، رشید رضا اپنے استاد پر فخر کیا کرتے تھے اور ان کی بے پناہ تعظیم و تکریم کیا کرتے ہمیشہ ان ہی کا تذکرہ کیا کرتے اور ان کو عصر جدید کے حجۃ الاسلام سے یاد کرتے تھے

چونکہ ہمارے پاس ان علوم کی تفصیلات بہت کم ہیں، جو رشید رضا نے اپنے استاد سے حاصل کئے اس لئے ہم یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ رشید رضا کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے مشہور و معروف اسلامی علوم سے وافر حصہ اخذ کیا تھا آپ نے فلسفہ یا علم الکلام میں مستقل کوئی کتاب تصنیف کرنے کی کوشش نہ کی لیکن آپ نے اپنے استاد کی جو تصنیفات نشر کی ہیں اور ان پر جو حواشی و تعلیقات لکھی ہیں ان سے آپ کی اس قدرت و دسترس کا پتہ چلتا ہے جو ان علوم میں جن سے آپ نے اخذ کیا ہے حاصل تھی علوم حدیث میں آپ کو کافی درک اور عبور حاصل تھا اسی میدان میں رشید رضا کے جوہر کا نمایاں ہونا ضروری تھا کیونکہ شیخ عبدہ نے جس تحریک کی ابتدا کی تھی اس نے محض سنت صحیحہ کو عظیم الشان اہمیت دے رکھی تھی تاکہ یہ اسلام کی جدید شکل و صورت کے لئے اسلام کا اساسی ماخذ قرار پائے،

گولڈزیہر کہتا ہے، "رشید رضا کو مختلف احادیث کی جانچ پرتال میں جو قدرت حاصل تھی اور اس میں آپ کو جو عظیم الشان عبور حاصل تھا وہ بعض اوقات ہمیں متقدمین علماء حدیث کی جانچ پرتال کی یاد دلاتی ہے"

آپ کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو علوم جدیدہ سے بھی واقفیت حاصل تھی، جن سے آپ اسلام کی تعبیر اور اس کی مدافعت میں بخوبی استفادہ کرتے تھے

المنار

رشید رضا کو قاہرہ پہنچے ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ آپ صحافت کی وادی خارزار میں گھس پڑے اور ۲۲ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں المنار کے نام سے آٹھ صفحات کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا، اس میں خصوصی مقالات کے علاوہ ہفتہ بھر کی خبریں اور سیاسیات بھی شامل تھے جن میں سے بعض کو ان دنوں بڑی اہمیت حاصل تھی،

دوسرے سال کی ابتدا میں المنار ماہوار مجلہ کی شکل میں نکلا، پہلے پہل اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں چنانچہ جو پرچے شام اور ترکی کی طرف بھیجے گئے تھے حکومت عثمانیہ نے ان کو ممنوع قرار دیا، اس طرح ان افراد میں اس اخبار کی امیدوں کو ناکامی حاصل ہوئی، جن کے متعلق خیال کیا گیا تھا کہ مصر سے اس میں اشتراک عمل کریں گے کیونکہ ان میں سے اکثر نے المنار کے پرچے جو ان کے پاس پہنچے تھے واپس کرا دیئے

تیسرے سال کے اختتام پر اخبار میں حصہ لینے والوں کی تعداد تین سو یا چار سو سے متجاوز نہ تھی لیکن مشاہدہ کیا گیا ہے کہ پانچویں سال سے اس کی نشر و اشاعت میں نمایاں ترقی ہوگئی

بارہویں سال (۱۹۰۹ء) سے پہلے عدد کے بقیہ پرچے اصلی قیمت سے چار گنے دام پر فروخت کئے گئے، پھر دوبارہ المنار پہلے سال کے بعد سے جس شکل میں نکلا تھا اسی صورت سے شائع کیا گیا۔ آخری سالوں میں جس مقدار میں وہ شائع ہوتا رہا اس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے۔

المنار کے اجزا سے رشید رضا کا مقصد العروۃ الوثقیٰ کی روش اختیار کرنا تھا لیکن جہاں تک اس کے سیاسی موقف کا تعلق تھا جس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی تھی اس سے المنار علیحدہ رہا۔

بہرحال المنار کی وہی غرض وغایت تھی، جو اس کے لئے العروۃ الوثقیٰ کے مجلہ نے مقرر کر دیا تھا ان دونوں مجلّوں کا ایک مقصد، جن سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں یہ تھا کہ اجتماعی، دینی اور اقتصادی اصلاحات کی نشر و اشاعت کی جائے اور دلیل و حجت سے ثابت کیا جائے کہ اسلام بلحاظ اس کے نظام دینی کے موجودہ حالات کے مخالف نہیں اور شریعت حکومت کے لئے ایک صالح آلہ کار ہے۔

ان دونوں رسالوں کے یہ بھی مقاصد تھے کہ اسلام میں جو اعتقادات و خرافات دخیل ہو گئے ہیں ان کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے، اسلامی عقائد کے لئے جو گمراہ کن تعلیمات اور باطل تعبیرات رائج ہیں ان سے جنگ کی جائے، قضا و قدر کے بارے میں جو غلط افکار و خیالات شیوع پذیر ہیں ان کو مٹایا جائے، مذہبی تعصب سے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھے، اور ان چیزوں سے جو عقائد میں اولیاء کے اعتقاد سے داخل ہو گئے ہیں اور صوفیاء کے طریقے سے جو بدعتیں اور گمراہیاں پیدا ہو گئیں ہیں جنگ و جدال کیا جائے پھر مختلف فرقوں اور جماعتوں کو باہمی رواداری اور محبت و اتحاد کی دعوت، عام تعلیم کی ترقی درسی کتابوں اور تعلیمی طریقوں کی اصلاح، علوم و فنون میں پیش قدمی کی ترغیب اور امم اسلامیہ کو تمام امور ضروریہ میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرنا تاکہ یہ اور قوموں سے آگے ہو جائیں یہ تمام مقاصد ان رسالوں میں شامل تھے

المنار نے ابتدا ہی سے اپنے اس عظیم الشان مسلک پر عمل کیا، اس کے مدیر اکثر و بیشتر ایسے مقالات لکھا کرتے تھے، جو مصر اور اس کے علاوہ دیگر ممالک اسلامیہ کے اکثر امور پر بے لاگ تنقید پر مشتمل تھے، نیز ضمنی طور پر ان مقالات میں شیخ محمد عبدہ اور ان کی تعلیمات

کے مبادی سے متعلق قوی مدافعانہ پہلو اختیار کئے گئے تھے، المنار نے استاد امام اور ان کے اکثر تلامذہ کے جو غیرت و اقدام میں ممتاز تھے اور ان کے علاوہ دوسرے موئدین اصلاح کے جو دیگر ممالک اسلامیہ میں تھے، اکثر و بیشتر مقالات نشر کئے

مختلف اصلاحی مقالات کے ساتھ ساتھ جو مختلف پہلوؤں میں لکھے جاتے تھے، المنار نے تیسرے سال کی ابتدار سے موجودہ وقت تک ایک خاص باب محمد عبدہ کی تفسیر قرآن کو نشر کرنے کے لئے اور دوسرا باب خود صاحب المنار کے لئے مخصوص و مستقل کر دیا یہ آخر الذکر باب میں فقہی یا اعتقادی امور کے سوالات کے، جنھیں مدیر کے نامہ نگار بھیجا کرتے تھے، جوابات یا فتوے نشر کئے جاتے تھے، ان فتووں نے مشہور فقہی مذاہب کے اکثر احکام کی جانچ پڑتال کے لئے ہمت سے مواقع پیدا کر دیئے۔

المنار نے مختلف اسلامی قوموں کے اخبار اور مطبوعہ کتابوں اور رسالوں پر بحث کرنے کیلئے کئی حصے مخصوص کر لئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مدیر المنار نے ایک عام خاکہ تیار کیا جس پر کئی سال تک عزم و استقلال کے ساتھ کاربند رہے چنانچہ پہلا سال اور اس کے بعد کا تھوڑا سا زمانہ تمہیدی ٹھہراؤ کا دور تھا، جس کو مدیر نے عام طور سے مسلمانوں کی کمزوری کی تصویر کھینچنے اور ان کی اصلاحی ضرورت کی دعوت دینے کے لئے مخصوص کیا اور کوشش کی کہ ان کے نفوس میں اس حالت کو سدھارنے کے جذبات بیدار کئے جائیں،

جب آپ کو یہ خیال ہوا کہ توفیق اس تمہیدی عہد کا حلیف ہے تو اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ وہ طریقے اختیار کئے جو حسب دلخواہ اصلاحات کی تکمیل اور مسلمانوں کی کوششوں کو ان پر چلانے کے لئے کارآمد تھے، یہ وہ روش تھی، جس کو المنار نے اختیار کیا،

۱۹۰۵ء میں یعنی المنار کی تشکیل کے تقریباً آٹھ سال بعد مدیر نے المنار کے اثرات کا مشاہدہ کیا تو دیکھا کہ اس کی کوششوں میں عظیم الشان کامیابی حاصل ہو گئی ہے اور

اکثر و بیشتر رسالوں نے اصلاحی دعوت میں المنار کی تقلید کی یہاں تک کہ حاجتوں اور کمزوری کے اسباب کے بیان میں تصنیف کی بدعت پھیل گئی اور اصلاح کے لئے جن عملی کوششوں کی ضرورت تھی ان میں غور وفکر کرنے سے قطع نظر کرلیا گیا، اس موضوع پر اکثر ان اشخاص نے قلم اٹھایا جو اس کی بخوبی معلومات نہیں رکھتے تھے۔

دوبارہ المنار اپنی تمہیدی ہیجان انگیز روش پر لوٹ آیا، یہ واقعہ اس وقت ہوا جبکہ رشید رضا نے ان اشخاص کی تردید کی جنھوں نے آپ کو یہ الزام دے رکھا تھا کہ آپ مخالفانہ افکار اور نکتہ چینیوں پر خاموش ہو گئے ہیں اور بعض اداروں نے آپ پر جو تنقیدیں کی ہیں اس کا آپ کوئی جواب نہیں دیتے، آخری سالوں میں المنار کے طرز پر اس قسم کی تبدیلی کے لئے بہت سے دلائل ہیں غالباً یہ ان کا مرجع اسی قسم کے مشابہ اسباب ہیں، جن کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں

۱۹۲۶ء - ۱۹۲۷ء میں مدیر نے مناسب سمجھا کہ ممالک اسلامیہ کے عام حالات میں کوئی مقالہ نشر کرے، جس کا سلسلہ آپ نے ۱۹۰۵ء میں شروع کیا تھا اور اس وقت سے اب تک اسے شائع نہیں کیا تھا، آپ کہتے ہیں کہ " اسے اسی لئے شائع کیا گیا کہ اب اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ جو اس کی تحریر کے زمانے میں تھی بڑھ گئی ہے "

ہر صورت مدیر المنار کا مقصد اپنی کوششوں کو لوگوں کو اصلاح کی رہنمائی کے لئے ہیجان میں لانے اور ان کو آگاہ کرنے پر ہی منحصر نہ تھا، بلکہ آپ نے انھیں خلیفہ کی زیر نگرانی و سرپرستی ایک "جمعیۃ الاسلامیۃ" کی تشکیل کی دعوت دی، جس کا مرکز رئیسی مکہ میں ہوا اور اس کی ثانوی شاخیں تمام اقطار اسلامی میں ہوں۔

آپ کی نظر میں اس جمعیت کے قیام کا مبدا، یہ اعتقاد تھا کہ اخوۃ اسلامیہ جنسی قومی اور وطنی امتیازات کو مٹا دے اور مسلمانوں کو باعتبار ان کے امت واحدہ ہونے

کے متحد و منظم کردے اپنیز شریعت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ حکومت میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان مساوات قائم کرکے تمام قوموں اور جنسوں کے درمیان اتحاد پیدا کردے ۔

اس جمعیت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو عقائد، ادبی تعلیمات، شرعی احکام اور مدنی اصول میں ایک ناموس کے جھنڈے تلے جمع کیا جائے اور ان کو اس کے ساتھ یہ دعوت دی جائے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک ہی زبان عام ہوگی اور وہ عربی ہے نیز یہ کہ بدعتوں اور فاسد تعلیمات کا خاتمہ کردے اور اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے کام کرے،

اس انجمن کا دستور یہ تھا کہ سلطان عثمانی تمام مسلمانوں کا رئیس اعلیٰ ہوگا کیونکہ یہ تمام مسلم حکام میں زیادہ قوی ہے۔ مختلف اسلامی حکومتیں اس اتحاد میں ایک دوسرے کے رکن ہونگی جس طرح ولایات متحدہ امریکہ کا اتحاد ہے، کہ ہر امیر مجلس شوریٰ کے باہمی تعاون سے حکومت کرے گا اور اپنی سلطنت کے داخلی امور میں مکمل آزادی سے بہرہ ور ہوگا، دوسری طرف یہ تمام ممالک اپنے دشمن کے مقابلہ میں جسم واحد کی طرح ہوں گے ۔ یہی ہے اعلیٰ نمونہ وحدت اسلامیہ کا،

علاوہ ازیں جمعیت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام سیاسی کاموں سے علیحدہ رہے کیونکہ اگرچہ دین اور دولت لامحالہ اسلام میں خالص امور دینیہ میں متحد ہیں لیکن رشید رضا بیان کرتے ہیں کہ سیاست میں مصروف ہو جانے کی کوئی ضرورت نہیں، نیز یہ کہ جو لوگ اسلامی دفاع کا کام کرتے یا تعلیمی اور وعظ و ارشاد کے شعبوں سے متعلق ہیں ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ سیاست میں حصہ لینے سے وہ پرہیز کریں،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرز عمل جو بعض ظاہری پہلوؤں کے اعتبار سے اُس جمعیت کے خاکوں کے مشابہ تھا۔ جس کو جمال الدین اور محمد عبدہ نے تشکیل دی تھی مرور زمانہ سے نظر انداز کر دیا گیا اور اس کی اہمیت گھٹ گئی ۔

اس کے باوجود المنار ہمیشہ متحدہ اسلام اور وحدت اعتقادات و احکام کی طرف دعوت دیتا رہا لیکن جو جمعیت بالفعل تشکیل میں آئی تھی، وہ محض ایک ایسی انجمن تھی جس کے اغراض محدود تھے، یہ جمعیۃ دعوت و ارشاد ہے جس سے ہم آئندہ بحث کریں گے۔

مشرق قریب میں چند ایسے موثرات کارفرما ہونا شروع ہوئے تھے جن سے المنار کا اپنی اخوۃ اسلامیہ کی مدافعت میں جو وطنیت و قومیت کے حدود سے ناآشنا تھی الجھ جانا ضروری تھا، چنانچہ مصر بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مصطفیٰ کامل پاشا کے زیر قیادت حزب الوطنی کو تازہ کرنے کے درپے ہوگیا، اس کا ترجمان جریدہ اللواء تھا، اس مجلس کا نصب العین دین یا اصلاحات دینی نہ تھا، بلکہ یہ صرف وطنیت کی دعوت دیتی تھی جو قومی امتیازات پر مبنی تھی، بقول المنار کے اس سے ہر غیر مصری مسلم اور ہر غیر مسلم مصری کو علیحدہ رکھا جاتا تھا،

چونکہ المنار اس مسلک کے موافق نہ تھا اس لئے جریدۂ اللواء نے اس پر تنقید کی، جب مصطفیٰ کامل پاشا کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہو گیا تو اس پارٹی کے صدر محمد بک فرید بنائے گئے، اس مخالفانہ روش پر جریدۂ العلم جو حزب وطنی کی زبان بن گیا تھا چلنے لگا اس مجلہ کے مدیر عبد العزیز جاوش تھے جو اس سے پیشتر آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر تھے،

ان دونوں سیاسی لیڈروں نے المنار پر یہ بہتان تراشی کہ المنار کی بعض سیاسی اغراض ہیں جنکو پورا کرنے کے لئے اپنی جمیعت کی تشکیل کی ہے

المنار کو وحدت اسلامیہ کی طرف دعوت دینے میں دیگر ممالک میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ رشید رضا نے ۱۹۰۸ء میں نوخیز ترکی پارٹی کے انقلاب

پر اپنی بڑی بڑی آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ رکھی تھیں، نیز آپ کو اس دستور سے بہت سی امیدیں بندھی ہوئی تھیں جن کا حلف اس پارٹی نے اٹھایا تھا، آپ تصریح کرتے ہیں کہ آپ نے عبدالحمید کے ہاتھوں اس دستور کو حاصل کرنے کے لئے لیڈر کے طور پر کام کیا، کیونکہ یہ دستور اس بڑی آزادی کا ذمہ دار تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے اصلاحی کوششیں زندہ اور بارآور کی جارہی تھیں، لیکن آپ کی یہ امیدیں اور آرزوئیں مصطفیٰ کمال پاشا کے زیر حکومت ترکی کی تجدید کی وجہ سے پامال ہو کر رہ گئیں رشید رضا فرماتے ہیں "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس مشہور زعیم کی حکومت کفر محض ہے اور اسلام سے ایک قسم کا انحراف ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔"

بہر حال بلاد عرب میں ابن سعود کے وہابی خاندان کے قیام سے ایک نئی امید کا ستارہ چمکا، المنار لکھتا ہے کہ "دولت عثمانیہ کے زوال وسقوط اور ترکی کی لادینی حکومت کی تشکیل کے بعد ابن سعود بہت بڑی اسلامی قوت ہے، یہ وہ یگانہ قوت ہے جو سنت کو زندہ کرتی اور بدعت و باطل رسوم کا قلع قمع کرتی ہے"

معلوم ہوتا ہے کہ رشید رضا نے اسلامی تفکیر کے ارتقا کو اکثر و بیشتر کوششوں میں قبول نہیں کیا، رجعت پسندوں کی طرف سے آپ نے اس کی وقتاً فوقتاً مدافعت کی اور اس کو آزاد منش مجددین سے دور رکھا آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنی جماعت کو "الحزب المعتدل" سے نامزد کرتے تھے جو واسطہ تھی ان جمود پسندوں کے مابین جو اپنی قوت پر بھروسہ کرتے تھے کہ عوام ان کی کورانہ اطاعت کریں گے، اور ان اشخاص کے درمیان جو ترقی میں عجیب وغریب آراء ونظریات رکھتے تھے، یہی وہ لوگ تھے جو حریت عقل کو مطلق العنان کر دینے کے قائل تھے اور تمدن جدید کو اخذ کرنے جدید قوانین وضع اور جدید اسالیب حکومت کی پیروی کے دعویدار تھے

اعتدال پسند مصلحین ان اشخاص کے مخالف تھے، ان کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام

میں ہر قسم کے مسئلہ کا حل موجود ہے جو عصر جدید میں دینی، سیاسی اور اجتماعی امور کا کفیل و ذمہ دار ہے، بشرطیکہ لوگ اس کے سمجھنے میں وہ مسلک اختیار کریں جس پر یہ نظریہ رکھنے والے چلتے ہیں

اگرچہ اعتدال پسندوں کے دعوائے اعتدال کو بعض گوشوں میں ثابت کرنے کے لئے چند شواہد پائے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات واقعات وحقائق زبانِ حال سے گواہی دیتے ہیں کہ مدیر المنار بھی ایک رجعت پسند تھے، چنانچہ آپ اپنے تمام نظام تفکیر میں قرآن وسنت اور تمام احکام شریعت کے اتباع میں سخت گیری اور تشدد پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے نہایت تنگ اور محدود معانی اخذ کرتے ہیں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ان امور میں جذبہ آزادی مثلاً شریعت کے اعتبار میں رواداری ہی تمام ممالک اسلامیہ کے لئے قانون اساسی ہے لیکن بسا اوقات اس جذبہ ورجحان نے تمام دینی بنیاد کو کمزور کر دیا اور اس کو خطرہ کا نشانہ بنا ڈالا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ المنار رجعت پسندوں کے گروہ میں ٹھہر جانے کو ترجیح دیتا ہے،

اس سے پیشتر ہم نے مصر اور ترکی کے وطن پرستوں کی بابت گفتگو کی ہے، نیز ہم نے دیکھا کہ المنار ان تمام پر کفر والحاد کا الزام لگاتا ہے کیونکہ دین ان کے وطنیت کے آراء وخیالات کو استوار نہیں کرتا، نیز المنار مصر کے دو نوجوان علماء اور مصنفین کو اسی وصف سے متصف کرتا ہے، ہم آئندہ باب میں ان دونوں علماء کے ان تنقیدی رجحانات پر بحث کریں گے، جو انھوں نے اسلامی ادب اور اسلامی نظام کے مقابلہ میں پیش کئے، ہمیں یہاں یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ المنار کا موقف ان دونوں مصنفوں سے کسی طرح کم جدت پسند یا انتہائی رجعت پسندوں کے موقف سے کسی طرح کم تشدد پسند نہ تھا، جب دو موضوعوں میں سے ایک کے ارد گرد، جن کی طرف ہم ابھی اشارہ کریں گے لوگوں کا ذہن منتشر اور پریشان ہونے لگا، تو رشید رضا کو ان دو امور

میں اپنی رائے کے اظہار کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا جو اصل موضوع میں اختلاف وجدال سے پیدا ہو گئے تھے، آپ کی یہ رائے اُن حدود کا انکشاف کرتی ہے جن سے آپ کا ارادہ ومنشا یہ تھا کہ ان کو عقیدہ اور خاص کر قرآن سے متعلقہ امور کی فروعت پر علمی بحث کرنے کے وقت ضروری تصور کیا جائے، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ:

جب کسی مسلمان کا مطالعہ اور اس کی تحقیقات اس درجہ تک پہنچ چکی ہیں کہ وہ کسی تاریخی یا علمی نظریہ کو قرآنی تعلیمات کے خلاف دیکھتا ہے مثلاً حضرت ابراہیم کے تاریخی وجود سے انکار کرتا ہے تو کیا وہ دائرۂ اسلام سے باہر ہو جائے گا خواہ وہ دین کے تمام علمی اور اعتقادی امور کا پابند ہی کیوں نہ ہو؟

المنار نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ "جو شخص ناقابل تاویل قطعی وصریح قرآنی نص کے مخالف اعتقاد رکھے اور اس طرح اس کا عقیدہ ہو کہ قرآنی خبر غلط ہے تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار نہ ہو گا، پس جو شخص آدم یا ابراہیم یا اسماعیل کے وجود کا انکار کرے تو وہ کافر ہے، کیونکہ وہ اللہ کے کلام کو جھٹلانے والا ہے"

پھر رشید رضا کہتے ہیں کہ "لیکن بعض آیات قرآنی کی مجازی تاویل سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مثلاً قصہ آدم ہے اور نہ کسی کو علم طبعی کے مسلمہ حقائق کو قبول کرنے سے روکا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر آسمانی کتاب کے الفاظ کے مظاہر باہمی مخالف ہوں تو اس صورت میں قرآنی الفاظ کی تاویل بطور مجاز جائز یا یہ یا عام اصطلاحی قاعدہ کے پیش نظر کرنا واجبی ہے جیسا آفتاب کا چشمہ میں غروب ہونا یا سمندر میں۔"

دوسرا مسئلہ جو پہلے مسئلہ ہی سے نکلا ہے یہ ہے کہ

کیا یہ ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان مستقبل قریب میں اُن احکام قرآن کے مابین جو دینی وادبی امور سے مخصوص ہیں اور ان احکام کے درمیان جو تاریخی وعلمی امور کے متعلق قرآن میں وارد ہوئے ہیں تفریق وتمیز کریں اور قرآن کو نوع اول میں معصوم اور فرع

دوم میں محقق گردانیں؟

رشید رضا اس کا جواب مختصر طور پر یہ دیتے ہیں کہ
"یہ امکان بہت کوسوں دور ہے"

اصلاحات

ہم نے گذشتہ محمد عبدہ اور ان کی تعلیمات پر بحث اور المنار کے معرض وجود میں آنے کی غرض وغایت کو بیان کرتے وقت اُن اصلاحات کی نوعیت و رفتار پر روشنی ڈالی ہے جو گذشتہ تیس سال کے دوران میں المنار کے صفحات پر اُجاگر ہوتے رہے، ہم نے ذکر کیا تھا کہ ان اصلاحات میں جو خصوصیت کارفرما تھی وہ ان کو دینی اصلاحات کے رنگ میں پیش کر رہی تھی، یعنی دین اسلام کی عام اصلاح ہی وہ پہلا محرک ہے جو ان اصلاحات میں جلوہ گر ہے، اسلام ہی وہ نصب العین اور غرض و غایت ہے، جو ان اصلاحات کی تکمیل کا وسیلہ ہے

جب یہ امر مسلمہ ہے کہ خالص دینی پہلوؤں کے اہتمام کو کسی تحریک و انقلاب کی تاریخ میں پہلا درجہ حاصل ہے تو ہمارا ابھی یہ فریضہ ہے کہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ دین اسلامی مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط اور ان کی تمدنی اجتماعی، سیاسی اور دینی زندگی پر مشتمل ہے اس لئے جن اصلاحات کے لئے انھوں نے عمل درآمد کیا وہ ان تمام امور کو شامل ہیں۔

سب سے پہلی اصلاح یہ ہونی چاہیئے کہ اس شکل وصورت اور پیمانہ کو بدل دیا جائے، جو مسلمانوں نے دین اسلامی کے مزاج وطبیعت اور اس کی قدر وقیمت کے لئے بنا رکھا ہے، چنانچہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ دین میں ایک روحانی راز پوشیدہ ہے جو اس پر کاربند رہنے والوں کو قطع نظر ان کے اخلاق واعمال کے امداد وقوت بہم

پہنچاتا ہے انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ دین کی حقیقی قدر و قیمت اس کے روحانی اسرار میں یا اس کی پوشیدہ قوتوں میں نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت اس میں ہے کہ دین انسان کو اُن قوانین الہیّہ سے، جو انسانی افراد و طبقات کی ترقی کو منضبط کرتے ہیں، روشناس کرکے دینوی اور اخروی زندگی کی سعادت کا کفیل اور ضامن ہے انھیں ان قوانین کا جاننا اور یقین و ایمان کے ساتھ اُن پر کاربند ہونا بھی ضروری ہے، نیز اُن کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کائنات عالم کی بھلائیوں اور ان کی برکات سے اُن لوگوں کو محروم نہیں کرتا جو انھیں صحیح طریقوں سے تلاش کرتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر،

لیکن جو مشائخ و صوفیاء عوام الناس کے روحانی پیشوا و زعما بن بیٹھے ہیں، انھوں نے دین کو کھیل مذاق اور کسب روزی پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ڈالا اور ذکر الٰہی کو رقص و سرود اور قوالی سے بدل دیا، ان کا ذکر تو بس نغمہ اور ترنم، جھنجھناہٹ اور گنگناہٹ ہے، جس کے ساتھ کچھ چیخ و پکار، ہاؤ ہو اور ڈھولک اور تالیوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، وہ چند اشعار اور گیت پڑھتے ہیں یا اولیاء کے عرس اور مولود میں قرآن کے چند پارے تلاوت کرتے ہیں، اور اپنے ان کارناموں اور کارگزاریوں کے ذریعہ لوگوں کے سینوں میں اس قدر جوش اور حوصلے بھر دیتے ہیں کہ صحیح دینی شعائر و عبادات بھی اتنا نہیں پیدا کرتے، اسی لئے لوگوں کے دل اپنے پیروں کی گمراہی سے بہک جاتے ہیں اور ان کی طرف خارق العادۃ قوتیں اور کرامات منسوب کرتے ہیں اور ان کی زندہ و مردہ روحوں کی برکتوں کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں ان کی آستانیں وہ مقدس مقام بن جاتی ہیں کہ لوگ ان کو اللہ کے پاس شفاعت کا ذریعہ بناتے ہیں یہاں تک کہ ایسے امور میں ان کو شفیع ٹھہراتے ہیں جن کا تصور بھی عقل میں مستحیل ہے۔

اس نہج پر مصلحین نے لوگوں کے روبرو ان گمراہ کن صوفیاء و مشائخ کے عیوب و نقائص بیان کرنا شروع کیا اور دین کے ٹھیکہ داروں پر کاری ضرب لگائی، یہاں اتنی

گنجائش نہیں کہ ہم ان تمام بدعتوں پر بحث کریں جو اسلام میں داخل ہوگئیں لیکن ہم ان میں سے چند کھلی ہوئی بدعتوں کو انتخاب کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ان کی بابت المنار نے کیا موقف اختیار کیا۔

کہا جاتا ہے کہ عقائد و احکام میں اکثر بدعتیں مسلمانوں کے اندر رؤسا دین کی غفلت شعاری کی وجہ سے داخل ہوگئیں اور ان کو اس وہم میں گرفتار کر دیا کہ یہی رسوم اصل عقیدہ کو تقویت پہنچانے اور دینی اقتدار کے لئے عوام الناس کو مطیع و منقاد بناتے ہیں۔

اولیاء کے بارے میں اعتقاد کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں چنانچہ لوگوں نے اپنے بزرگوں مثلاً عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ کی طرف بعض ایسے اسماء وصفات منسوب کر دیئے جو صرف خدائے واحد کے لئے مخصوص تھیں، ان کے مقبروں اور درگاہوں کے آس پاس نمازیں پڑھنے لگے، ان کے سامنے قربانیاں دینے لگے، میلادوں اور عرسوں میں جنھیں وہ ہر سال مناتے ہیں، قسم قسم کی برائیوں اور گناہوں کا ارتکاب کیا، جیسا کہ طنطا میں احمد بدوی کی میلاد میں ہوا کرتا ہے۔

بعض بدعتیں اور رسوم صوفیاء کے طریقوں سے متصل ہیں۔ لوگوں کے طریقت پسند مشائخین کی تنظیم میں حد درجہ غلو اور مبتدی متصوفین کی اپنے رؤساء کی اندھا دھند اطاعت نے بے حد نقصان پہنچایا سب سے زیادہ افسوس اور تاسف یہ کہ صوفیاء کے بیہودہ اذکار و مشاغل نے جنھیں وہ انجام دیا کرتے ہیں قوم کی روح کو مردہ کر دیا۔

بعض رسوم و بدعات قرآن مجید کی تعظیم و تکریم میں حد سے تجاوز کر گئی ہیں چنانچہ قرآنی آیتوں کو تعویذوں اور گنڈوں کا ذریعہ بنایا گیا، لوگ ستونوں اور پتھروں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کو، جن کے متعلق مشہور ہو گیا ہے کہ ان میں خاص تاثیریں اور قوتیں مضمر ہیں برکت و ثواب حاصل کرنے کی نیت سے چھونے لگے۔

رشید رضا ایک مرتبہ مسجد حسینی میں مصلیوں کے طیش و غضب کا نشانہ بن گئے اس مسجد کے لئے ایک خاص کرامت تھی، کیونکہ لوگوں میں مشہور تھا کہ آنحضرتؐ کے نواسے کا سر یہاں مدفون ہے، واقعہ یہ ہے کہ رشید رضا نے ایک مرتبہ مسجد میں خطبہ دیا اور لوگوں کے روبرو بیان کیا کہ مسجد کے ستونوں وغیرہ کو چھو کر برکت حاصل کرنے کا تصور بے سود اور بیہودہ ہے'

دوسری قسم کی بدعتیں بھی ہیں جو بظاہر فی نفسہا ضرر رساں معلوم نہیں ہوتیں لیکن المنار ان کی بھی سختی سے تردید کرتا ہے، کیونکہ وہ کسی طرح دین میں داخل نہیں ہیں مثلاً غلاف کعبہ جو ہر سال مصر سے کعبۃ اللہ بھیجا جاتا ہے اور وہ محمل جس کو سرکاری طور پر دھوم دھام سے لے جایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے زوال اور پستی کا سبب یہ ہے کہ دین اپنی اس اگلی سادگی سے دور ہو گیا جو اس کی نشوونما کے وقت تھی، یہی رائے المنار اور شیخ محمد عبدہ کی ہے' چنانچہ اسلام اپنے ابتدائی زمانے میں آسان اور سیدھا سادہ دین تھا' عرب کے غیر مسلموں کے لئے اس کا سیکھنا اور سمجھنا آسان اور سہل تھا' اسی لئے اسلام اس سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیلا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی'

"پھر مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا ظہور ہوا' اور مختلف ممالک سے قوموں کا فلسفہ اور ملتوں کے عادات و اطوار ان کے اندر داخل ہوئے' انھیں تمدنی، سیاسی اور قضائی قوانین کو وسیع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی، تو انھوں نے احکام کی ضرورت کے مدنظر علم فقہ اور عقائد کو مختلف فلسفیانہ نظریات و خیالات سے محفوظ رکھنے کے لئے علم کلام مدون کیا' چنانچہ اسلامی عقائد اور اسلامی احکام عملیہ سے چند ایسے امور گھل مل گئے جو ان سے متعلق نہ تھے اور اسلامی تعلیمات سہولت البساطت اور سذاجت کی کشادہ فضا سے نکل کر تشدد، پیچیدگی اور

دشواری کے تنگ دائروں میں چلی گئی۔ نبی کریم صلعم کے زمانے میں ایک اعرابی ایک ہی نشست میں اپنی شخصی عبادات کا اس قدر علم حاصل کر لیتا جو اس کے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہوتا، لیکن پیدائشی مسلمان کے لئے نہایت ہی مشکل ہے کہ اپنا موروثی دین چند سال میں حاصل کرے......"

مصلحین کی کوششوں کی اصل غایت یہ ہے کہ وہ اسلام کو اس کی صورت اولیٰ تک لوٹا دیں، کیونکہ دین کے اساسی اصول عقائد صحیحہ، تہذیب اخلاق، ادب نفس اور عبادۃ اللہ ہی ہیں باقی رہے انسانوں کے مابین معاملات کے عام قواعد تو یہ تمام عہد نبوی (صلعم) میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے

باقی احکامِ معاملات مثلاً احکام میں عدل اور مساواتِ حقوق کا وجوب، الحادِ ظلم و ستم، دھوکا اور خیانت کی تحریم اور بعض جرائم کے حدود کی حد تو ان تمام میں شارع نے اخلاق و فضائل کے اصول مقرر کرنے اور شوریٰ کا دستور وضع کرنے کے بعد جزئی احکام کا معاملہ ان اولی الامر عالموں اور حاکموں کے سپرد کر دیا ہے جن کا شرعاً اہل علم و عدل میں سے ہونا ضروری ہے، یہی لوگ باہمی مشورہ و رائے سے زمانے کے مطابق اور حسب اقتضائے حالات اُمت کے مصالح کا فیصلہ کرتے ہیں، صحابۂ کرام بلا لحض نبی علیہ السلام کے اس اصول و دستور کو سمجھتے تھے جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے..... بلکہ یہ منقول ہے کہ صحابہ جب کسی چیز میں مصلحت پاتے تو اس کا فیصلہ کر دیتے خواہ وہ سنت متبعہ کے مخالف ہو گویا ان کی رائے میں اصل چیز جزئیات و فروع احکام سے قطع نظر مبنی بر مصلحت شئے کو اخذ کرنا ہے۔"

لہٰذا مسلمانوں پر یہ امر واجب ہے کہ وہ خلفاء راشدین کے زمانے میں جن کے متعلق نبی علیہ السلام نے اپنی سنت اور ان کے طرز عمل سے تمسک کرنے کا حکم دیا ہے صدر اول والوں کا جو طریقہ کار تھا اس کی طرف رجوع کریں، اور دین میں جو چیزیں ان کے طریقہ

کے خلاف پیدا ہوگئی ہیں ان کو چھوڑ دیں۔

علماء کا فریضہ ہے کہ وہ عبادات کی تفصیلات کا یقین کریں، عقائد کو قرآن سے بلا کسی فلسفیانہ آمیزش کے حاصل کریں اور قرآن نے عقائد میں جو استدلالی طریقہ اختیار کیا ہے اسی کو اپنا نقطۂ استدلال بنائیں

"کتاب وسنت میں جو اخلاق و آداب ہیں وہ ہمارے لئے کافی ہیں کہ ہم معتدل اصول پر ان کی تعمیر کریں اور صوفیاء نے روحانیات میں جو افراط اور زہد وغیرہ میں جو غلو کیا ہے اس کی طرف ہمیں التفات کرنے کی چنداں ضرورت نہیں"

پھر المنار علماء سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جامع کتاب تالیف کریں جو ان تمام عقائد اور ادبی و اخلاقی مبادیات پر محیط و مشتمل ہو جن پر مسلمانوں کے مختلف فرقے متفق ہیں یہ کتاب وہ نہایت سہل اور سلیس عبادت اور طرز میں لکھیں پھر اُسے مسلمانوں کی بولی جانے والی تمام زبانوں میں منتقل کیا جائے'

المنار کی رائے میں یہ کتاب اُن اصول عقائد پر مشتمل ہونی چاہئے جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، مسلمانوں کے لئے ان امور میں اختلاف روا رکھا جائے جن پر اجماع واقع نہیں ہوا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کفر میں داخل ہوگی' جو مسلمان مذکورہ عقائد کے اصول کا یقین و اذعان رکھے اس پر کفر کا فتویٰ عائد نہ کیا جائے۔

"عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ میں سنت سے جو چیز عملی طور پر واضح ہو چکی ہے اور جس پر خلف نے سلف سے تواتر کے ساتھ عمل درآمد کیا ہو اور اس پر اتفاق کیا ہو یہاں تک کہ وہ دین کا ضروری معلوم عنصر ہوگئی ہو تو اس پر ہر مسلمان کو کاربند ہونا واجب ہے'

جن امور میں صدر اسلام میں اختلاف واقع ہوا ہے، مثلاً بسم اللہ کا جہر سے پڑھنا

اور رکوع و قیام کے وقت رفع یدین کرنا تو یہ واجب نہیں ہے بلکہ اس میں اختیار حاصل ہے، جو شخص اپنے پاس دلیل سے صحیح سمجھے یا اس کے حال کے موافق ہو تو اس پر عمل کرے، اس طرح تمام مسلمان اساسی عبادات میں کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کریں اور موجودہ فرقہ وارانہ روش کو چھوڑ دیں، جس پر چاروں مذاہب کی تفصیلات نے پہنچا دیا ہے جو دین میں کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتیں

یہاں اور بیشمار فرعی مسائل ہیں، جن سے مذاہب چہارگانہ کی فقہ کی کتابیں معمور ہیں، لیکن اس مذہب یگانہ میں عبادات کے لئے جو دستور وضع کیا جائے گا اس میں ہرگز ان مسائل سے چھیڑ چھاڑ نہ ہوگی، ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ ان مسائل میں تمام ائمہ کے اقوال یا کسی ایک امام کے قول کی طرف رجوع کرے اور جو چیز ان میں زیادہ راجح اور صحیح نظر آئے اس پر عمل کرے بجائے اس کے کہ وہ اپنے منسوبہ مذہب کے احکام کا پابند ہو کر رہ جائے جیسا کہ آجکل کا حال ہے، اس کی حالت ایک ایسے مریض کے حال کے مطابق ہونی چاہئیے جو کسی ایسے طبیب سے مشورہ لیتا اور تشخیص کراتا ہے جسے وہ اوروں سے بہتر سمجھتا ہے اس طرح وہ ایک حیثیت سے مجتہد ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی رائے کے اختیار کرنے میں جسے وہ اپنے نزدیک صحیح سمجھتا ہے اجتہاد کرتا ہے، اور دوسرے پہلو سے وہ مذاہب اربعہ کے ائمہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہوگا جس کی ہدایت پر یہ کاربند ہے"۔

اصول عقائد کی وحدت و یگانگت اور فرعی مسائل میں افراد کی مطلق آزادی سے المنار متوقع ہے کہ کسی خاص مذہب کے تعصب کی تیزی میں تخفیف ہو جائیگی مختلف مذاہب کے پیرووں کے مابین نزاع و جدال کا بازار بڑی حد تک سرد پڑ جائے گا اور مسلمان اختلافی مسائل میں خوش اسلوبی کے ساتھ بحث و مناظرہ کریں گے معاملات کے مخصوص احکام اور دنیوی و معاشی امور دین سے علیحدہ اور مستقل

شمار کئے جانے چاہئیں، مقدس قانون کے کسی جزر کو تا ابد تغیر و تبدل سے منزہ و مبرا نہ شمار کیا جائے جیسا کہ مذاہب اربعہ کی کتابوں کا حال ہے، اس لئے کہ یہ دنیوی امور اور فروعی احکام تعبدی نہیں ہیں، بلکہ ان میں زمان و مکان اور ماحول کے اختلاف و تنوع کے مطابق حکم لگایا جائے، اگرچہ یہ شرعی اصول و قواعد پر جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں، کیوں نہ برقرار ہوں۔

چونکہ مذاہب اربع کے بعض احکام کو ان کے جمودی و دوامی مزاج کی وجہ سے عصر حاضر کی اسلامی جماعتوں کی پستی و پسماندگی اور ان کے زوال میں بہت بڑا دخل تھا، اس لئے اکثر اسلامی حکومتوں نے احکام شریعت کی اتباع سے روگردانی کرلی کیونکہ وہ موجودہ دور کی حاجات و ضروریات کے متناسب نہ تھے۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے رشید رضا سے اناضول میں ان کی آخری سیاحت کے دوران میں مجسموں کے بنانے اور ملک میں ان کو نصب کرنے کے متعلق سوال کر کے پوچھا کہ کیا یہ شرعی طور پر حرام ہیں؟ نیز انھوں نے بیان کیا کہ اہل ملک انقرہ میں ان کا مجسمہ نصب کرنے والے ہیں، چنانچہ آپ نے فتویٰ دیا کہ آجکل ان کا استعمال حرام نہیں جیسا کہ ابتدائے اسلام اور بت پرستی کے قریب کے دور میں حرام تھا، نیز آپ نے یہ یقین دلایا کہ ترقی قوم کے لئے مجسمے تراشنے کے فن سے دلچسپی رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ عصر حاضر کے ضروری فنون میں داخل ہے۔"

لیکن جو لوگ اسلامی احکام کو عصر حاضر کی ضروریات کے ہم آہنگ بنانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ صرف علماء اور اہل الرائے ہیں، لہٰذا ان کے لئے دینی و دنیوی علوم سے روشناس ہونا اور ان میں مہارت و کمال پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اس اہم کام کے اہل اور قابل بن جائیں یہ بھی ضروری ہے کہ بعض اہل حل عقد علماء و فضلا اکٹھا جمع ہوں اور اسلامی معلومات میں ایک کتاب تالیف کریں جو

معضبوط شرعی قواعد وضوابط پر مبنی اور زمانے کے حالات کے مطابق ہو اس کا حاصل کرنا ہر ایک کے لئے سہل ہو اور اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو، جو امام اعظم ہوگا وہ مسلمانوں کو اس کتاب پر عمل کرنے کا حکم دے گا اور یہ اس کا فرض منصبی ہوگا اگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہو تو علماء کا فریضہ ہے کہ ان احکام کی پابندی کرائیں اور اس سے ان کی تنفیذ کا مطالبہ کریں، اگر یہ بھی اپنے اس فرض سے کنارہ کشی کریں تو ہر مسلمان کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ علی الاعلان یہ معلوم کرائے کہ امراء اور علماء ہی نے دین کو ضائع کر دیا اور مسلمانوں کی توانیاں منتشر کر دیں۔

اس سے بڑھکر یہ ہونا چاہئیے کہ ایسے مدارس قائم کئے جائیں جن سے خلفاء اور مجتہدین تعلیم پا کر نکلیں جن میں اہل حل وعقد کی شرعی صفات اور قضاء شرعی کی شروط پائے جائیں،

چنانچہ مصری پارلیمنٹ نے جو ۱۹۲۸ء کے دور میں منعقد ہوئی ایک الیسا طرفہ چھیڑا جس کے ذریعہ یہ مبادی اور ان کے فروعی مسائل جاری کئے جا سکتے تھے، یہ مسئلہ ایک ایسے مطالبہ پر بحث ومناقشہ کے دوران میں چھیڑا جو ملکی اوقاف کو مختلف اسباب کی وجہ سے جن میں سے ایک سبب ان کا بیجا تصرف تھا، باطل کر دینے کے متعلق پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا گیا تھا،

گو رشید رضا اکثر وبیشتر حالات میں سوء تدبیر اور اقتصادی خرابیوں کے وجود کو تسلیم کرتے تھے اور نیز آپ کی رائے میں بہت سے اوقاف صحیح شرعی اصول کے مخالف ہیں، مثلاً جو اوقاف قبروں کی تعمیر اور ان کی پختگی اور ان کے زیب وآرائش اور ان میں چراغ روشن کرنے کے لئے وقف کئے جاتے ہیں وہ مسلمہ شرعی اصولوں کی رو سے ناجائز ہیں۔ اس کے باوجود آپ کا نظریہ یہ تھا کہ وقف کے لئے بذات خود اسلامی شرع میں ایک اصل اور حقیقت ہے جو عصر اول سے آج تک نص اور عمل متواتر سے ثابت

ہے اس لئے کسی مجتہد کے اجتہاد سے اس کو باطل قرار دینا یا سوء تصرف کی وجہ سے اس کو بیکار کر دینا ناممکن ہے۔

اس سے ایک خطرناک مسئلہ متفرع ہو گیا تھا وہ یہ کہ تشریعی غلبہ و اقتدار کو حکومت میں جو دستور کے بموجب قائم ہوئی ہے، کسی ایسے قانون کو صادر کرنے کا حق مل گیا، جو قانون خداوندی سے جو لفظ کتاب یا سنت صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کوئی جزء منسوخ کر دے، رشید رضا اس کے منکر ہیں کہ پارلیمان کو اس قسم کا کوئی حق ہو تا وقتیکہ دستور اس کا معترف ہو کہ اسلام ہی حکومت کا سرکاری دین ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ تشریعی امور جو قطعی نصوص یا عمل متواتر سے متعلق نہیں ہیں تو ان میں دلائل و براہین سے حکم لگایا جائے گا اور ان میں امت کی مصلحت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

جمعیۃ الدعوۃ والارشاد

شیخ محمد عبدہ کی تحریک نے جن اساسی مبادی کی طرف دعوت تھی ان میں سے یہ تھا کہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ خود کو اپنے دینی بھائیوں کے درمیان اسلامی روابط کو تقویت دینے کا مکلف بنا لے اور مسلمانوں کو اسلامی فرائض کی ادائیگی اور اس کے اخلاقی احکام کے اتباع کی ترغیب دے۔

اسی پر تمام کام کا دارومدار نہیں بلکہ اس پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ غیر مسلموں کے درمیان اسلام پھیلانے کی کوشش کرے کیونکہ اسلام تمام انسانوں کے لئے اتارا گیا ہے۔

یہ بنیادی مقصد یعنی عوام کو دینی و دنیوی معاملات میں نقل و حرکت کے لئے آمادہ کرنا اس بات کا مقتضی ہے کہ عوام الناس کے مابین تعلیم کی عام نشر و اشاعت

کی جائے، چنانچہ رشید رضا نے اپنے پیش رو استاد محمد عبدہ کی طرح اپنے تمام مقالات اور خطبات میں مسلمانوں کی کوششوں کو ایک ایسے عمل پر جو تمام اعمال میں بہتر ہے لازمی طور پر صرف کرنے کی دعوت دی، یہ عمل مدارس کی تشکیل اور ان کا قیام ہے، رشید رضا فرماتے ہیں کہ مدارس کی تشکیل مسجدوں کی تعمیر سے بہتر ہے کیونکہ مسجد میں ایک جاہل کی نماز سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا لیکن مدارس کھولنے سے جہل و نادانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور دینی فرائض اور دنیوی اعمال صحیح اور حقیقی شکل و صورت میں انجام دیئے جاتے ہیں - دوسرے مقام پر آپ یہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی قوم کی فلاح و سعادت کا واحد طریقہ محض یہ ہے کہ ۱؎ حکومت نے بجائے اس کے کہ تعلیم کی اصل غرض و غایت حاصل ہو، تعلیم کا مقصد نوجوانوں کو شہری خدمت کی صلاحیت یا حکومت کے مصالح انجام دینے کے لئے تیار کرنا ٹھرایا،

دوسرا سبب یہ ہے کہ نصاب تعلیم اگرچہ فی الجملہ دینی منافرت نہیں پیدا کرتا لیکن دینی تعلیم کی طرف کافی اعتنا نہیں برتتا، المنار اپنا پورا زور تمام مدارس کو دینی فرائض بنیادی عقائد اور دینی آداب کے اصولوں کی تعلیم کی ضرورت کی طرف توجہ کرنے پر صرف کرتا ہے،

ان اغراض و مقاصد کو بار آور کرنے کے لئے ایک انجمن "جمعیۃ الدعوۃ والارشاد" کے نام سے تشکیل دی گئی، تاکہ بیک وقت ممالک اسلامیہ میں مسیحی تبلیغ کا مقابلہ کیا جائے،

اس انجمن کی تشکیل کا تصور رشید رضا کو اس وقت سے ہوا جب کہ آپ طرابلس کے مدارس میں طالب علم تھے، آپ بیان کرتے ہیں کہ وہ اس شہر کے امریکی عیسائی مبلغین کے کتب خانہ میں آیا جایا کرتے تھے جہاں ان کا دینی اخبار اور ان کی بعض کتابیں اور رسائل پڑھا کرتے اور ان کے دل میں بہت زمانے سے یہ

۱؎ اس قوم میں تعلیم کو عام طور سے رائج کیا جائے المنار تعلیم کے بارے میں حکومت کی سیاست اور [illegible]

تمنا تھی کہ مسلمانوں کی بھی ایک ایسی انجمن ہو جوان مسیحی بلغین کی ہے اور ایسے مدارس ہوں جیسا کہ ان کے مدارس ہیں۔

جب آپ مصر کی طرف ہجرت کر کے آئے تو آپ کا یہ تصور محکم ہو گیا اور ۱۹۰۰ء سے مسیحی دعوت و تبلیغ کا تردیدی جواب مسلمانوں کی جانب سے دینے کے وجوب میں مضامین لکھتے رہے۔

۱۹۰۶ء میں جب جاپانی ادیان کی کانفرنس منعقد ہوئی تو رشید رضا نے جاپان کو اسلام کی دعوت دینے کے خیال کو رائج کیا، اس وقت سے تبلیغی انجمن کی تاسیس میں دلچسپی لینی شروع کر دی اس جمعیۃ کا سب سے اہم کام مبلغین کی تربیت و تکمیل کے لئے ایک مدرسہ کا قیام تھا، اس تجویز کو ممالک اسلامیہ میں عام مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند سال بعد حالات مساعد ہوئے۔

پھر اس تجویز کو دوبارہ عمل لانے کے لئے دوبارہ ۱۹۰۹ء میں کوشش کی گئی اور اس کو ترکی میں نافذ کرنے کا ارادہ کیا گیا تاکہ اس کے علمبردار اس حریت سے بہرہ ور ہوں، جس کا ذمہ دستور نے لیا تھا اور نیز اس مخالفت سے بھی چھٹکارا پائیں، جو مصر کی وطنی پارٹی کی جانب سے انھیں لاحق ہو رہی تھی، جس کے رئیس محمد بک فرید اور شیخ عبدالعزیز جادیش تھے۔

رشید رضا آستانہ میں کامل ایک سال تک اس تجویز کو روبعمل لانے اور روشن خیال طبقہ اور عہدہ داروں کے درمیان رائج کرتے ہوئے مقیم رہے، یہاں تک کہ آخر کار حکومت نے اصل خاکے میں بعض ترمیمات کے بعد انجمن کی تالیف اور مدرسہ کی تشکیل پر اتفاق کر لیا۔

لیکن جس وزارت نے اس تجویز پر موافقت کی تھی اس وقت وہ ساقط ہو گئی۔ وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ رشید رضا جدید حکومت کے ساتھ اپنی کوششوں کو از سرِ نو

شروع کریں، اس حکومت نے تجویز کو ایسی شروط پر قبول کیا جن سے رشید رضا راضی نہ تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اپنا رُخ مصر کی طرف موڑ دیا اور قاہرہ میں انجمن اور مدرسہ کی تشکیل کے متعلق آپ کی رائے مستقل ہو گئی، یہاں انجمن کی تالیف عمل میں آئی اور اس کا صدر محمود بک سالم کو اور انجمن اور مدرسہ کا معتمد رشید رضا کو مقرر کیا گیا، ہر اس مسلمان کو انجمن کا رکن تصور کیا گیا، جو مالی امداد کرے یا اس کا سالانہ چندہ ادا کرتا رہے۔

ایک عرب امیر نے جو بمبئی میں تجارت پیشہ تھا زر کثیر سے اعانت کی، اور جزیرۂ روضہ قاہرہ میں میلاد النبی کی شب مدرسہ کا سرکاری طور پر افتتاح کیا گیا اور دوسرے ہی دن سے یعنی ۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۳ مارچ ۱۹۱۲ء میں اس مدرسہ میں درس شروع کر دیا گیا،

اس مدرسہ کا، جو مدرسہ یا دار الدعوۃ والارشاد سے نامزد کیا گیا تھا اس طرح تعارف کرایا گیا کہ یہ ایسا کالج ہے جس میں وہ تمام علوم و فنون جو دیگر کلیات میں پڑھائے جاتے ہیں، دینی تربیت اور علوم اسلامیہ کی طرف بیشتر توجہ مبذول کر کے پڑھائے جاتے ہیں،

المنار کے صفحات پر انجمن کی تشکیل، مدرسہ کے نظامات اور اس کے اسالیب تعلیم پر تفصیل سے بحث کی گئی، مدرسہ میں مسلمان نوجوان طلبہ کو جو بیس اور مجلس سال کی عمر کے درمیان ہوتے اس شرط پر قبول کیا جاتا کہ وہ پہلے ہی سے ایسی تعلیم پا چکے ہوں، جو یہاں کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یہاں ایسے طلباء کو ترجیح دی جاتی تھی جو دور دراز ممالک اسلامیہ مثلاً چین، ہندوستان اور ملایا وغیرہ سے تھے، کیونکہ ان مسلمانوں کی سخت ضرورت تھی کہ ان کو اس قسم کی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا

جائے، چنانچہ مدرسہ میں شمالی و مشرقی آفریقہ، ترکستان، ہندوستان، جاوہ اور ملایا کے طلبار کو قبول کیا گیا، طلبار کو تعلیم اور ادب سکھلایا جاتا اور ان کو مفت غذا دی جاتی اور محتاج و نادار طلبار کی مالی امداد بھی کیجاتی تھی،

طالب علم کو جو تعلیم کے تین سال ختم کر کے ان میں کامیابی حاصل کرلیتا تھا" سند رہبر" عطا کی جاتی، اس سند سے وہ اس قابل ہو جاتا کہ مسلمانوں میں تبلیغی کام انجام دے یا انجمن کے مدارس میں تدریسی فرائض ادا کرے لیکن اگر طالب علم اس مدت تعلیم کے بعد مزید تین سال اپنی تعلیم کو جاری رکھے تو اس کے بعد اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسا داعی و مبلغ بن جائے جو غیر مسلموں کو اسلام میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے،

جنگ عظیم کے چھڑ جانے کے بعد یہ مدرسہ بند ہو گیا اور دوبارہ اب تک اس کے دروازے نہیں کھلے!

تفسیر المنار

تفسیر المنار ایک نام ہے جو عام طور پر قرآن کی اُس تفسیر پر بولا جاتا ہے جس کو محمد عبدہ نے شروع کیا تھا، پھر آپ کی وفات کے بعد رشید رضا نے اس کو جاری رکھا۔

غالباً اس تفسیر کو المنار کے نام کے ساتھ مقرون کرنے کی مناسب وجہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کسی مستقل کتابی شکل میں طبع ہونے سے پیشتر المنار کے صفحات پر شائع ہوئی، مدیر المنار کو اس کے منظر عام پر لانے کے لئے ایک بڑی حد تک فضیلت حاصل ہے۔

درحقیقت اس تفسیر کی تالیف دیگر کسی چیز سے پیشتر رشید رضا کی ہمت کی طرف رجوع ہوتی ہے، جیسا کہ المنار کی روایت سے پتہ چلتا ہے، ابھی آپ کی قاہرہ میں مستقل سکونت نہ ہونے پائی تھی کہ آپ نے محمد عبدہ کو ایک کامل قرآنی تفسیر لکھنے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا جس میں وہ اپنی وہ روح پھونکیں جو العروۃ الوثقیٰ کے مقالات میں جلوہ گر ہوئی تھی،

شیخ عبدہ کا خیال اس وقت یہ تھا کہ ابھی نئی تفسیر لکھنے کی حاجت نہیں ہے اگرچہ ضرورت اس کی داعی بھی تھی تو یہ نئی تفسیر آپ کے ان اغراض و مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتی جو اس کو لکھنے کے لیے مقصود ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد آپ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ جامعہ ازہر میں تفسیر کا درس دیں، رشید رضا بھی اس درس میں حاضر ہوتے تھے، اثناء درس میں بعض اہم یادداشتیں آپ لکھ لیا کرتے تھے جن کو آپ کے استاد پیش کیا کرتے تھے، پھر اس کے بعد اس کی تنقیح اور اس میں توسیع کر کے محمد عبدہ کے روبرو پیش کیا، آپ نے ان کی تصحیح کر دی، اس تفسیر کو ابتداءً المنار کی تیسری جلد (سنہ ۱۹۰۰ء) سے تفسیر محمد عبدہ کے نام سے شائع کرنا شروع کر دیا، رشید رضا نے اس تفسیر کو اپنے استاد کی طرف منسوب کر کے اس لئے نشر کیا کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا کہ جب تک محمد عبدہ اس کے نشر ہونے سے پیشتر اس کو دیکھ لیں اور اس پر موافقت کرتے رہیں انہی کے نام سے ان کو شائع کرنا واجب ہے،

رشید رضا نے امام محمد عبدہ کی زندگی ہی میں جزو دوم کی تفسیر کو مجلۂ المنار سے الگ کر کے علیحدہ طبع کرنا شروع کیا، سب سے پہلے سورۂ عصر (سورہ ۱۰۳) کی تفسیر طبع کی پھر قرآن مجید کے آخری جزء کی تفسیر جو سورہ ۷۸ سے شروع ہو کر سورہ ۱۱۴ تک ختم ہوتی ہے طبع کرنا شروع کی، جس کی پہلی سورۃ فاتحہ ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا قول "عمّ یتسآءلون" شروع ہوتا ہے،

سب سے پہلے بڑی تفسیر سے جو شروع کیا وہ دوسرا جزء تھا کیونکہ پہلا جزء مختصر تھا اور اس میں وہ التزام نہ تھا جو اس کے بعد تمام آیتوں کی عبارتوں اور اس کے نصوص کو باہمی امتزاج کے ساتھ تفسیر میں ملحوظ رکھا گیا تھا'

دوسرے اور تیسرے جزء سے دسویں جزء تک کی تفسیر ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۱ء تک طبع نشر کی' ان اجزاء میں سورۂ توبہ کی ۹۱ آیۃ کی تفسیر تک پہنچے پھر جزء اول کی تفسیر میں نظر ثانی کی تاکہ آخری اجزاء کے اسلوب و منہج میں مطابقت پیدا ہو جائے' اسے نومبر ۱۹۲۷ء میں تفسیر الجزء الاول کے عنوان سے نشر کیا۔

محمد عبدہ کی وفات کے بعد رشید رضا نے مناسب خیال کیا کہ تفسیر کو ایسے نہج پر جاری رکھیں جو اپنے استاد کے اسلوب و طرز کے زیادہ قریب ہو' محمد عبدہ کی زندگی میں اکثر و بیشتر تفسیر کا حصہ وہ تھا جس کو خود رشید رضا نے لکھا تھا اگرچہ اسے اپنے استاد کی طرف منسوب کر دیا تھا۔

جب محمد عبدہ اس دنیائے فانی سے جوار رحمت کی طرف کوچ کر گئے تو رشید رضا نے اپنی تحریروں اور اپنے استاد کی تحریروں میں تمیز پیدا کر دی' چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ

"ان تمام کے باوجود میرا اعتقاد ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور ان کا مطالعہ کرتے تو ان تمام کو علی حالہا باقی رکھتے"

رشید رضا نے آیت قرآنی کے مشتملات کی توسیع کے لئے جو سنت صحیحہ سے متعلق ہیں خواہ وہ آیت کی تفسیر ہوں یا اس کے حکم میں ہوں' نیز بعض مفردات اور جملوں کی لغوی تحقیق' یا علماء کے اختلافی مسائل سے متعلق ہوں اور جا بجا مختلف سورتوں میں آیات کے استشہاد میں اور مسائل کی تحقیق کے لئے بعض تفصیلات میں جن کا پایا جانا مسلمانوں کے لئے نہایت ضروری ہے غرض کہ ان تمام امور میں جو اس امر کو مقتضی تھے کہ ان میں کچھ ترمیم و تبدیل ۔۔ منہج و اسلوب میں کچھ ترمیم و تبدیلی

کردی، لیکن رشید رضا ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والے کو یہ اشارہ کرتے ہیں کہ وہ تفسیر کرنے کے علاوہ کسی وقت صرف طویل استطرادی ابواب۔ فصول پڑھے تاکہ قرآن میں فکر و تدبر کرے اور اس سے ہدایت حاصل کرے جو بہ نسبت اس کے مقصود بالذات ہے،

جب رشید رضا نے پہلا جزء نکالا تو اس کا مقدمہ المنار میں شائع کیا جس میں تفصیل کے ساتھ ان مختلف اسالیب و مناہج پر تنقید کی جنھیں مفسرین نے تفسیر قرآن میں اختیار کیا ہے، بالخصوص اس میں صحابہ و تابعین کی ماثورہ روایات پر بحث کی ہے، آپ بیان کرتے ہیں کہ گذشتہ بیشتر تفاسیر میں اولاً لفظی اصطلاحات کے مناقشے یا متکلمانہ جدلی طریقے اور صوفیانہ تاویلات اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بوچھاڑ نظر آتی ہے، امام فخر الدین رازی نے سونے پر سہاگہ یہ کیا کہ اپنی تفسیر میں اپنے زمانے کے مشہور و معروف علمی آراء و نظریات کو پیش کر دیا، انہی کی تقلید موجودہ دور کے ایک مفسر[1] نے کی ہے کیونکہ وہ جابجا جدید علوم مثلاً علم فلک، علم نبات، علم حیوان پر "تفسیر الآیۃ" کے ذیل میں بحث کرتے ہیں،

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض علوم جدیدہ فہم قرآن کے لئے ضروری ہیں یا اس کی تفہیم پر ممد و معاون ہیں لیکن رشید رضا کا خیال یہ ہے کہ ان علوم کو حد بعید تک استعمال کرنا جیسا کہ مفسرین نے لکھ دیا ہے پڑھنے والوں کو اس حقیقی مقصد سے دور کر دیتا ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا،

تفسیر میں بعض ماثورہ روایات کو بھی پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ مرفوع صحیح احادیث پر کوئی چیز مقدم نہیں لغوی معنی سے متعلق علماء صحابہ کے استنباطات اور ان کے دور

---

[1] غالباً یہاں شیخ طنطاوی جوہری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے دیکھو اول باب جہاں آپ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے ۱۲

کا طرز عمل ان کے لگ بھگ ہے۔

اکثر تفاسیر میں یہودیوں، ایرانیوں کے زنادقہ راویوں اور مسلمہ اہل کتاب کی طرف رجوع کیا گیا ہے، یہ اتباع اُن اقوام کے رسولوں اور ان کی کتابوں اور معجزات سے متعلقہ چیزوں میں اور ان کے علاوہ دوسروں کی تاریخ مثلاً اصحاب کہف (سورہ ۱۸) اور شہر ارم ذات العماد (سورہ ۸۹ آیۃ ۶) وغیرہ میں بڑھ گیا ہے ان میں زیادہ تر وہ خرافات اور کذب و دروغ آمیز افسانے ہیں جن کی بعض راویوں یہاں تک کہ بعض صحابہ نے بھی تصدیق کرلی

آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ابن تیمیہ کی رائے پیش کی ہے اور اسرائیلیات کی تصدیق سے انکار کیا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا بذات خود جھوٹ اور غلطی پر مبنی ہوں کیونکہ اس میں کعب احبار اور وہب ابن منبہ کی سند ہے، حالانکہ قدمائے رجال جرح و تعدیل نے با وجودیکہ ان دونوں کا کذب ہمارے روبرو آشکار ہوگیا ہے ان دونوں سے دھوکا کھالیا اور ان کو عدل میں شمار کیا ہے"

ان تمام سے رشید رضا جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ ماثورہ روایات کی اس وقت تک تصدیق نہ کی جانی چاہیئے جب تک کہ ایسی صحیح حدیث اس کی تائید نہ کرے جو صحابی سے مروی ہو اور آنحضرت تک مرفوع ہو،

رشید رضا کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ مفید روایات مستقل کتابوں مثلاً بعض حدیث کی کتابوں میں جمع کی جائیں اور ان کی اسانید کی قدر و قیمت واضح کی جائے پھر ان میں سے جو صحیح ہوں بغیر سند کے تفسیر میں ذکر کردی جائیں،

متعدد مناسب مقامات پر ہم نے جابجا وہ شواہد پیش کئے ہیں جو محمد عبدہ کے اس طریقہ کی تشریح کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے محمد عبدہ اپنی تعلیمات قرآن سے

مستنبط کیا کرتے تھے پھر کس طرح ان تعلیمات پر قرآن سے استدلال کیا کرتے تھے بلکہ ہمیں اس سے بھی بڑھ کر یہ نظر آئیگا کہ بیشتر یہی تعلیمات خود قرآن میں آگئی ہیں محمد عبدہ ہمیشہ اس پر زور دیا کرتے تھے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے دنیا کی کوئی طاغوتی قوت اس میں گھر نہیں کرسکتی۔

آپ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن اسی ترتیب سے نازل ہوا، جو اس وقت وہ اپنے الفاظ اور اپنے معنی کے ارتباط پر قائم ہے۔ قدیم تفسیریں مثلاً تفسیر جلالین جس پر آپ نے اپنے مطالعہ کے وقت اعتماد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اواخر آیات میں فواصل کی جو رعایت رکھی گئی ہے وہ آیات قفرہ میں سجع کے لئے التزام کی حیثیت رکھتی ہے یہی رعایت کبھی مترادفات کے مقامات مثلاً رؤف و رحیم وغیرہ میں تحدید کردیتی ہے۔ لیکن المنار کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن نہ تو شعر ہے اور نہ اس میں قافیہ و سجع کا التزام کیا گیا ہے بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے جو ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھے ہوئے ہے۔

تفسیر المنار میں بعینہ یہی طریقہ اسباب نزول پر بحث کرنے کے دوران میں اختیار کیا گیا ہے۔ قدماء مفسرین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بعض سورتیں یا آیات کے بعض حصے مختلف و متفرق اسباب کے لحاظ سے نازل ہوئے ہیں، لیکن تفسیر المنار کے پیش نظر وہ معنوی ارتباط ہے جو ہر آیت میں یکساں متفرق اجزاء کو باہم مربوط کردیتا ہے یا ایک آیت کو دوسری آیت سے متعلق کردیتا ہے۔ مثلاً دوسری سورۃ کی ۲۱۶ - ۲۱۰ کی آیات کی تفسیر میں، جن میں شراب، جوا اور یتیموں پر انفاق اور بر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے فرماتے ہیں:

"چونکہ پہلے دونوں حکم مال خرچ کرنے میں دو انسانی گروہ کے حال کو بیان کر رہے تھے اس لئے مناسب ہوا کہ ان کے بعد ایک ایسے طبقہ کے متعلق سوال اٹھایا جائے جو تمام انسانوں کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہے کہ

اس کی تربیت اور اس کے اصلاح حال کے لئے مال خرچ کیا جائے یہ یتیموں کا طبقہ ہے "

بنیادی عوامل

قبل اس کے کہ ہم اُن اصول ومبادی تحریک کے بیان کو ختم کریں جن کے مختلف پہلوؤں پر گذشتہ ابواب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مناسب سمجھتے ہیں کہ اُن جوہری عناصر اور بنیادی عوامل کو ایجاز واختصار سے پیش کردیں جو ان پر اثر انداز ہوئے، یہ جیسا کہ گولڈزیہر نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تین عوامل ہیں

اول: الغزالی کے آراء وافکار دینی آداب میں

دوم: ان دو ہستیوں پر انتہائی نگرانی کرنے کا رجحان جنھوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں بت پرستوں سے جنگ کی یہ دونوں نامور ہستیاں امام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ ابن قیم جوزی ہیں،

سوم: جدید ترقی کی حاجتوں کو پورا کرنے اور ان کے ہم رفتار ہونے کی ضرورت

اس تحریک کی استواری میں امام غزالی کی تعلیمات نے جو گہرا اثر ڈالا اور جو عظیم الشان اہمیت حاصل کی ہے، اس سے ان تعلیمات کے حیرت انگیز طور پر نفوذ پذیر ہونے کی تصویر آنکھوں کے روبرو آجاتی ہے، اور ظاہر ہوجاتا ہے کہ کس طرح وہ اب تک برابر اسلام میں اثر انداز ہو رہی ہیں، انھوں نے ان تین اشخاص کو متاثر کیا جنھوں نے الغزالی کی تصنیفات سے گہرا اثر قبول کرکے اس تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، باوجودیکہ جمال الدین افغانی کی تالیفات ہم تک بہت کم پہنچی ہیں لیکن ان تھوڑی سی تالیفات میں بھی ہمیں وہ دلیل ملتی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الغزالی کی کتابوں کی قدر ومنزلت

آپ کے پاس کس قدر تھی،

شیخ محمد عبدہ کی تحریروں میں بھی الغزالی کا اثر واقتدار جابجا نمایاں ہے باقی رہے رشید رضا تو خود ان کا بیان ہے کہ الغزالی آپ کے سب سے پہلے معلم اکبر تھے جنکی تصانیف کی روشنی میں اپنے ایام شباب میں ہدایت حاصل کی،

ان میں غزالی کا اثر اس طرح نمایاں ہے کہ انھوں نے غزالی کی تالیفات سے جابجا استشہاد کیا ہے، اس سے بھی زیادہ یہ کہ انھوں نے غزالی کے مشہور دینی آداب وافکار کو زیادہ تر اپنے اقوال میں پیش کیا ہے، بعض اوقات تو خود غزالی کی کتابوں کی عبارتیں اُنہی کے الفاظ میں ذکر کر دیئے ہیں، یہی اثر اس روح میں جلوہ گر ہے جو انھیں تمام دینی زندگی کے تصور کے خلاف درغلاتی اور اسے ایک نفسیاتی شے یا ایک قلبی امر یا ایک دلی شغل بنا دیتی تھی جس کے درمیان اور خارجی مظاہر کے مابین صرف ثانوی طریقے سے ہی تعلق ہے۔

ہم اس کی روشن اور واضح مثال شیخ محمد عبدہ کے ان آراء میں پا سکتے ہیں جو انھوں نے ایمان، نماز اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں پیش کئے ہیں، ان امور میں آپ کی جو رائے ہے وہ اُس رجحان کی تصویر پیش کرتی ہے جو محمد عبدہ کی تحریک میں جلوہ گر ہے، اور اس سانچے کو پیش کرتی ہے جس میں عبادات اور عقائد اسلامیہ کو عصر حاضر میں اس تحریک نے ڈھالنے کا ارادہ کیا،

نیز ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد عبدہ اور آپ کا اسکول امام غزالی سے بہت متاثر ہوا ہے کیونکہ یہ اس امر کے قائل تھے کہ درس قرآن اور فہم وتفہیم قرآن میں علم الکلام کی اکثر کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر اجتہاد کو لازمی گردانا جائے تاکہ مسلمان اپنے دین کو اس کے صحیح اور اصل سرچشمہ سے حاصل کریں، نیز یہ اسکول عقائد اسلامیہ کی نشر واشاعت کی کوشش میں غزالی سے متاثر ہوا تاکہ جمہور بآسانی ان عقائد کو سمجھ لیں،

اس تحریک کا دوسرا بنیادی عنصر ابن تیمیہ (المتوفی ۱۳۲۸ء) اور ابن قیم جوزی (المتوفی ۱۳۵۵ء) ہیں، ان کے زمانے میں جو بدعتیں، رسوم اور فسادات پیدا ہو گئے تھے ان پر نہایت سخت حملے کئے، اور دعویٰ کیا کہ انھیں اجتہاد کا حق ہے، تمام احکام میں اصل الاصول کی طرف رجوع کیا اور اولین سرچشموں پر اعتماد کیا، انھوں نے صوفیاء پر شدید حملے کئے، انبیاء و اولیاء کی قبروں کی زیارت کو حرام ٹھہرایا، اور امام احمد بن حنبل کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی، جو ائمہ اربعہ میں تمسک بالنصوص میں سب سے زیادہ تشدد پسند ہیں،

ان دونوں کے مذہب کو بعد میں وہابیوں نے خوب ہی رائج کیا، یہ بدنام مصلحین کا ایک گروہ ہے جن کا سیاسی پلہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بلاد عرب میں بھاری تھا اور عصر حاضر میں ابن سعود کی کامیابی نے دوبارہ انھیں غلبہ و اقتدار بخشا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مصری مصلحین کی بعض مساعی اصلاح ان سابقہ مصلحین کی بعض اصلاحی کوششوں سے ملتی جلتی ہیں، اس لئے مدیر المنار کے اس شکوہ پر کہ بعضوں نے انھیں معتزلی ہونے کا الزام لگایا یا ان کے بعض مروجہ عبارات پر اعتراض کرتے وقت ان کے اس قول پر کہ وہ وہابی ہیں ہمیں کوئی تعجب و حیرت کرنے کی ضرورت نہیں۔

محمد عبدہ اور رشید رضا نے افتاء میں اپنا طریقہ ابن قیم کی کتاب "اعلام الموقعین" سے اختیار کیا، کیونکہ اس کی سند نص قرآن اور سنت ہے، آپ ابن تیمیہ پر اعتماد کرتے تھے کیونکہ یہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھے،

المنار نے ان دونوں عالموں کی اکثر و بیشتر کتابیں نشر کیں اور خود بارہ المنار کے وسیلہ سے یا اس کی نگرانی میں بعض کتابوں کو طبع کیا گیا،

ہم یہ اشارہ کر سکتے ہیں کہ مصر کے اصلاحی مبلغین کے آراء و نظریات اور ابن حنبل

ابن تیمیہ اور ابن قیم جوزی کے درمیان جو قوی مشابہت پائی جاتی ہے اس کے ذریعہ ان مصلحین میں اپنے مخالفین کے اعتراضات کو دفع کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی تھی کیونکہ ان آراء و افکار میں اس بات کی دلیل تھی کہ وہ قرآن و سنت کے ساتھ تمسک کرنے والے سب سے زیادہ تشدد پسند اسلامی مسلک کا اتباع کر رہے ہیں،

محمد عبدہ کی تحریک میں ارتقائے جدید کے مقتضیات کے بارے میں جو اثر تھا اس پر طویل بحث کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں، کیونکہ یہی مقتضیات اس تحریک کو منظر عام پر لانے کا سبب تھے، جو ایسی دینی اصلاح کی دعوت دیں جو عصر حاضر کی حاجات کے ہم آہنگ ہو اور اسلام کی حقیقی فطرت باعتبار اس کے دین ہونے کے جو تمام عالم انسانی کے لئے نازل کیا گیا ہے اپنے اصلی خدو خال میں نمایاں اور آشکار ہو جائے،

نواں باب

حزب المنار

(المنار پارٹی)

ہم جہاں حزب المنار کہیں گے تو اس سے ہماری مراد وہ اشخاص ہوں گے جو محمد عبدہ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے، اور جس تحریک کی آپ نے بنیاد ڈالی ہے اس میں ان اشخاص کے مختلف نقاط نظر ہیں، غالباً ہماری اس توجیہ کا ایک صحیح پہلو نکل آئے گا جب کہ ہم یہ ملحوظ رکھیں کہ المنار ایک ایسا صحیفہ تھا جس نے محمد عبدہ کے آرار و افکار کی کافی حد تک نشر و اشاعت کی، یہی وہ آلۂ کار تھا جس نے اپنے ارگرد شیدائیوں کی جد و جہد کو اصلاحی تحریک کے لئے منظم کر دیا۔

لیکن حزب کے لفظ سے جسے ہم نے اس جماعت پر اطلاق کیا ہے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جن لوگوں نے محمد عبدہ کے آرار و خیالات کو علی الاعلان قبول کیا ان کی تعداد بہت ہے یا یہ لوگ ایک منظم پارٹی کی تشکیل کئے ہوئے تھے جیسا کہ عام طور سے سمجھ میں آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عبدہ کی تعلیمات نے مصر اور اس کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بہت گہرے اثرات چھوڑے، اکثر لوگوں اور خصوصاً روشن ضمیر طبقہ کے پاس ان کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، ہم گذشتہ اس اثر کی رفتار پر روشنی ڈال چکے ہیں کیونکہ اکثر اشخاص جو آپ کے بنیادی خیالات اور تعلیمات سے مختلف پہلوؤں پر متاثر ہوئے، ان کے نام ادبی، دینی راہ ہی اور سیاسی انجمنوں کی سطح پر نظر آتے ہیں، یہ عین حقیقت ہے، جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ جو لوگ بظاہر ان اصلاحات میں جن کی

دعوت محمد عبدہ نے دی تھی، شریک ہوئے، جن کو محمد رشید رضا "اعتدال پسند اصلاحی مبلغین" سے نامزد کرتے ہیں، ہمیشہ وہ قلیل تعداد میں تھے اور ہمیشہ ان کی تعداد قلیل ہی رہی کچھ اگلوں میں سے تھے اور کچھ پچھلوں میں سے،

ممکن ہے کہ ہمیں "تاریخ الاستاذ الامام" میں اور المنار کے صفحات میں یا اس کے علاوہ مختلف مطبوعات میں اور ان اکثر مقالات میں جو اخباروں میں شائع ہوئے ایسے بیشمار اشخاص کے نام نظر آجائیں جو مختلف حیثیتوں سے یا تو جمال الدین سے فیض یاب ہوئے یا شیخ محمد عبدہ سے شرف اتصال حاصل کیا، لیکن ہم ان اشخاص کے متعلق جو کچھ علم رکھتے ہیں یہ ہے کہ یہ ایک کے یا دوسرے کے شاگرد تھے ان میں سے بہت کم ایسے تھے جنھوں نے دونوں سے یکساں تلمذ حاصل کیا ہو' تاریخ ہمارے روبرو کوئی ایسا دور نہیں پیش کرتی جن میں انھوں نے اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے میں جد وجہد کی ہو؛

ان کے علاوہ دوسروں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ان دونوں کے تلامذہ تھے یا ان دونوں کی خدمت میں ایک زمانہ تک رہے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مبادی اصلاح سے کمزور اثر قبول کیا یا زبردست مصالح نے بعد میں انھیں دوسرے راستہ پر ڈال دیا۔

کچھ اور لوگ بھی ہیں جنھوں نے مبادی اصلاح کو خلوصِ دل سے قبول کیا' ان میں سے اکثر قومی زندگی میں بلند مرتبہ والے ہیں جنھوں نے اصلاح کی تائید کی اور ایسے نازک دور میں اس کا بیڑا اٹھایا جب کہ اصلاح کا کام نامانوس تھا۔

اگرچہ ہم ان ناموں کی فہرست پیش کریں جنھیں ہم پہچانتے ہیں اور تا حد امکان ان میں سے تھوڑے سے اشخاص کے حالات زندگی بھی پیش کریں تو پڑھنے والا اکتا جائے گا' جو ان انقلابات و تغیرات سے ناواقف ہے جو پچھلے پچاس سال میں مصر پر پے در پے رونما ہوتے رہے' لیکن اس طرح ذکر کرنے میں بہت اہمیت اور قدر و قیمت ہے

کیونکہ یہ تذکرہ ہمارے روبرو اُن تعلیم یافتہ طبقات کے بہت بڑے پہلو کی تصویر کھینچ دیتا ہے جو محمد عبدہ کی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس دور کو بیان کرتا ہے جس میں یہ تاثیر مختلف گھرانوں اور خاندانوں میں گھر کر گئی تھی،

جو افراد محمد عبدہ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے ان کو شمار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ تمام اشخاص جیسا کہ المنار نے ذکر کیا ہے مختلف لقب الیعن، جداگانہ زاویائے فکر اور علیحدہ نقاط نظر رکھا کرتے تھے۔ ان کے گوناگوں جذبات اور رنگا رنگ عواطف و میلانات تھے، بعض اہل السنت اور اصحاب الرائے کی طرف مائل تھے اور بعضوں کا رجحان عصر حاضر کے تمدن کی طرف دعوت دینے والے آزادی پسند اشخاص کی طرف تھا۔

بہرحال ذیل کے اشخاص سے جنھیں ہم تا حدِ امکان پیش کرنے والے ہیں ظاہر ہو جائے گا کہ مختلف طبقات کے اکثر افراد نے محمد عبدہ کی دعوت کو قبول کر لیا اور یہ دعوت ممالک اسلامیہ اور مصر کی زندگی کے اکثر گوشوں میں سرایت کر گئی،

ازہرین

سب سے پہلے یہاں جو حقیقت منکشف ہوتی ہے یہ ہے کہ ازہریوں یا یہاں کے اساتذہ کو محمد عبدہ کے بنیادی تصورات اور ان کی تعلیمات نے اپنی طرف اسطرح جذب نہیں کیا جس قدر مغربی تمدن سے متاثر روشن خیال طبقہ کو اپنی طرف کھینچا آپ کے ارادت مندوں اور تلامذہ میں سے اکثر قضا کے اونچے منصب پر فائز تھے یا مدارس علیا کے اساتذہ تھے یا مصالح حکومت کے رؤسا، ان میں سے بعضوں نے ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان میں سے اکثر وہ تھے جنھوں نے مغربی علوم سے استفادہ کیا تھا؛

جب ہم ان طویل کوششوں پر نظر ڈالتے ہیں، جو محمد عبدہ نے ازہر کی اصلاح اس کی تعلیم اور اس میں درس دینے کے لئے خرچ کی ہیں تو ابتداءً ہمیں اچنبھا سا لگتا ہے، لیکن ہماری یہ حیرت گھٹ جاتی ہے، جب کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے طبقہ پر رجعت پسندانہ رنگ چھایا ہوا تھا اور ازہر میں اسلاف پرستی کا اور ان کی تقلید کا قوی اثر پایا جاتا تھا۔

یہاں دوبارہ اُس مخالفت کا تذکرہ ضروری نہیں جس کو ہم نے اوپر ذکر کر دیا ہے جس سے محمد عبدہ اس ازہری رجعت پسند عنصر کی جانب سے دوچار ہوئے، لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے آپ کی سخت مخالفت کی مگر آپ کے دروس نے آس پاس کے اشخاص کو بڑی تعداد میں اپنی جانب کھینچ لیا اور ان میں سے اکثر افراد آپ کے شاگرد ہو گئے۔ ان میں سے بعض وہ تھے، جو جمال الدین کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے اور جس وقت محمد عبدہ نے تحریک اصلاح کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی یہ لوگ اس تحریک کے مؤیدین میں سے ہو گئے۔ ازہر کے ان فاضلوں میں سے جو محمد عبدہ کے قریبی مددگار اور آپ کے عقیدتمند تھے شیخ احمد ابوخطوہ (المتوفی ۱۹۰۶ء) تھے یہ محاکم شرعیہ (شرعی عدالتوں) میں قاضی اور ازہر میں مدرس تھے، نیز یہ جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھے، انھوں نے شیخ عبدہ کی ازہر میں اور قضا میں اصلاحات کی تائید کی، نیز یہ ان مذاہب اربعہ کے علماء میں سے ایک تھے جنھوں نے محمد عبدہ کے مشہور ترین فتویٰ کی علی الاعلان تائید کی جو فتویٰ ترنسفال سے مشہور ہے جس نے بہت سی مخالفتیں مول لیں۔

شیخ عبدالکریم سلمان اور شیخ سید وفا جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھے، پھر یہ دونوں شیخ عبدہ کے تلامذہ میں سے ہو گئے، اور آپ کے ساتھ الوقائع المصریہ کی ادارت میں شریک رہے،

معلوم ہوتا ہے کہ اعرابی تحریک کے سلسلہ میں جو حوادث و نتائج وقوع پذیر

ہوئے اس کے بعد شیخ عبدالکریم سلمان نے اس دوستی کے باوجود جو ان کے اور محمد عبدہ کے درمیان محکم تھی، آپ کی طرف منسوب ہونے سے کنارہ کشی اختیار کرلینا چاہی اُس وقت وہ محمد عبدہ کے تلامذہ کی جماعت کے لیڈر تھے جو محمد رشید رضا کے خلاف تھی، انھوں نے ان کے اور محمد عبدہ کے مابین یہ کوشش کی کہ دونوں میں جدائی ڈال دیں اور رشید رضا کو اُس ممتاز درجہ اور منزلت سے محروم کردیں جو اپنے استاد کے نزدیک باعتبار ان کے سب سے بڑے شاگرد اور قریب ترین پیرو کے ہونے کے حاصل تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالکریم ان تمام واقعات کے بعد امام کے حلقہ کی طرف لوٹ گئے، اور ان کے اس موقف کا اندازہ آپ کی ازہر کی اصلاحات کے زمانے میں چلتا ہے، چنانچہ انھوں نے محمد عبدہ کے دوش بدوش ہوکر آپ کی حوصلہ افزائی اور تائید کی،

شیخ حسونہ نواوی (۱۸۴۰-۱۹۲۵) محمد عبدہ کے قریب ترین ارادت مندوں اور آپ کے مخلص دوستوں میں سے تھے، یہ ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک شیخ ازہر رہ چکے تھے، اپنے دور کے آخری دو سال میں انھوں نے ازہر کی وائس چانسلری (مشیخت) کے ساتھ ساتھ منصب افتاء بھی سنبھالا، انھوں نے محمد عبدہ کی اصلاحات کو نافذ کرنے میں تاحدِ امکان اعانت کی۔

شیخ بخیت جو منصب افتاء میں محمد عبدہ کے جانشیں ہوئے اور مصر میں علماء کبار میں سے ایک تھے، زمانۂ طالب علمی میں محمد عبدہ کے ساتھیوں میں سے تھے، دونوں ایک ساتھ ازہر میں شیخ حسن الطویل کے دروس میں حاضر رہے پھر دونوں یکساں جمال الدین کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، اس کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اصلاح میں آپ کا وافر حصہ نہیں تھا، جب ہم اس معاملہ پر گہری نظر ڈالتے

ہیں تو ہمارے نزدیک صحیح یہی ہے کہ وہ محمد عبدہ کی پارٹی میں شمار نہیں کیے جاتے،
۱۹۲۹ء میں شیخ بخیت نے علی عبدالرازق کی کتاب "الاسلام واصول الحکم" کی تردید میں ایک کتاب شائع کی۔ خلافت کے متعلق علی عبدالرازق نے جو تجدیدی پہلو پیش کئے تھے، اُن کی تردید میں شیخ نے اہل السنۃ کے آراء و افکار پر اعتماد کیا ہے۔

شیخ عبدالرحمن قراعہ جمال الدین اور محمد عبدہ کے تلامذہ میں سے تھے اور منصب افتا پر فائز ہوئے، ایک مرتبہ محمد عبدہ نے ان کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہا "یہ ان کے چھوٹے بھائی اور ان کے بڑے بیٹے ہیں" اس کے باوجود اگر انھوں نے اصلاحی تحریک میں درحقیقت کوئی حصّہ لیا تو ان کا یہ حصہ کوئی زیادہ واضح اور جلی طریقے سے نہ تھا۔[۱]

امام محمد عبدہ کے شاگردوں میں سے شیخ محمد مصطفیٰ المراغی بھی ہیں جن کو مصر کی صحافت حاضرہ نے اس طرح توصیف کی ہے کہ "وہ امام کے سب سے بڑے شاگرد ہیں" آپ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک شیخ الازہر تھے، آپ نے وسیع پیمانہ پر ازہر کی تنظیم کا اعادہ کیا تاکہ مصر میں عصر حاضر کی حاجات وضروریات کے ہم آہنگ ہو جائے آپ کی اصلاحی تجویز جسے آپ نے قانون میں وضع کیا جو قانون نشان ۴۹ ۱۹۳۰ء سے مشہور ہو صادر ہوئی،

لیکن شیخ المراغی کو اپنی اصلاحات کے دوران میں بہت سی مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا، چنانچہ آپ وائس چانسلری سے سبکدوش ہو گئے، آپ کی ازہر کی وائس چانسلری کے زمانے یعنی ۱۹۲۹ء کے اخبارات ایک اہم معاملہ کے متعلق مضامین لکھا کرتے تھے جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ معاملہ یہ تھا کہ آپ کے نام کو زندہ رکھنے اور آپ کی سدا یادگاروں کے لئے کوئی ایسا کام انجام دیا جائے جو قومی ہو،

تمام کا اتفاق اس بات پر ہوا کہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لئے شیخ المراغی سے زیادہ کوئی اہل نہیں کیونکہ آپ شیخ ازہر ہیں اور محمد عبدہ کے ساتھ آپ کے دیرینہ قوی تعلقات ہیں، لیکن المراغی ازہر سے سبکدوش ہو گئے پھر دوبارہ نہیں اس کام سے متعلق کوئی خبر سننے میں نہیں آئی،

شیخ المراغی اس سے قبل سوڈان میں قانون والوں کے قاضی القضاۃ تھے اس منصب پر آپ کو ان کے استاد شیخ عبدہ کی کوشش سے فائز کیا گیا تھا سوڈان میں امام کے دوسرے شاگرد یا تو قضاۃ تھے یا کلیہ غوردون التذکاریہ میں مدرسین،

شیخ سید عبدالرحیم (مرداش پاشا (۱۸۵۲ - ۱۹۳۰) جن کے پاس طریقت صوفیہ (مرداشیہ کی مسند (مشیخت) وراثت میں چلی آئی تھی، محمد عبدہ کے شاگردوں میں سے تھے اور ان مخلص دوستوں میں سے ایک تھے، جن کے اور آپ کے درمیان رابطۂ مودت ومحبت استوار تھا، سیاسی معاملات میں بھی آپ کا حصہ تھا، حزب الامۃ کے آپ رکن تھے، مجلس شوری القوانین پھر جمعیۃ تشریعیہ کے بھی رکن ہوئے، جب ۱۸۸۵ء میں طریقت (مرداشیہ کی مسند سنبھالی تو اس ادارہ میں متعدد اصلاحات داخل کئے، مصر میں اوقاف کی اصلاح کے لئے جن اشخاص نے دعوت کی صدا بلند کی ان سب میں آپ پیش پیش تھے "آپ کی وفات کے کچھ مدت پہلے گرانقدر روپیہ وقف کر دیا تاکہ قاہرہ میں اپنے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا جائے۔

جب ۱۹۲۲ء میں امام محمد عبدہ کی یادگار منانے کے لئے جلسہ کیا گیا تو خواہش ظاہر کی کہ محمد عبدہ کی یاد زندہ رکھنے کے لئے جامعہ مصریہ میں ایک جائیداد کا تقرر کیا جائے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس تجویز کو اب تک عملی جامہ پہنایا گیا ہو ا

محمد عبدہ کے درس میں جو اشخاص حاضر ہوئے ان میں سے شیخ عبدالعزیز جادش (المتوفی ۱۹۲۹ء) بھی ہیں، لیکن یہ اپنی سخت گیر سیاسی زندگی میں شیخ محمد عبدہ

کی بہ نسبت جمال الدین کے بہت قریب تھے،

شیخ علی سرور زنکلونی بھی قابل ذکر ہیں، یہ عصر حاضر کے علماء ازہر کے بہت بڑے فاضلوں میں سے ہیں شیخ عبدہ کے دوست تھے اور ایک حد تک آپ کے شریک کار رہے

ادباء و عہدہ داران

محمد عبدہ کے مددگاروں میں چند ایسے اشخاص ہیں جنھوں نے اپنی تعلیم کے چند سال یا تمام زمانہ ازہر میں گذارا، لیکن بعد میں انھوں نے محمد عبدہ کے ساتھ زیادہ توجہ کی اور اپنی کوششیں ان کی تعلیمات کو پھیلانے میں صرف کیں،

ان میں سے ابراہیم بک لقانی (المتوفی ۱۹۰۶ء) ہیں، یہ ان اشخاص میں سے تھے جن کا شمار وکلاء اور ادباء میں ہوتا ہے یہ ارتقار جدید کے پہلے قائدین میں سے تھے جنھوں نے اپنی توجہات جمال الدین پر مرکوز کردی تھیں اور نیز یہ ارتقار کی روح پھونکنے والوں اور جدید مصنفین و خطباء میں سے تھے،

عرابی انقلاب کے بعد اللقانی کو محمد عبدہ کے ساتھ ملزم گردانا گیا اور مصر سے جلا وطن کیا گیا چنانچہ یہ امام کے ساتھ بیروت گئے، اور یہاں مقیم رہے یہاں تک کہ انھیں اپنے وطن کو واپس ہونے کی اجازت دے دی گئی، ان کے آخری زمانے میں ان پر مرض کا حملہ ہوا اور ملک کے سیاسی معاملات میں عملی حصہ لینے سے آپ کو روکے رکھا، اس لیے آپ نے وہ مرتبہ حاصل نہ کیا جو شہرت و عزت کا مستحق ہو،

ابراہیم بک ہلباوی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ مصر میں وکلاء کے نقیب تھے یہ زبردست مقرر تھے، جمال الدین کی شاگردی کے زمانے میں ایسی جولانی دکھائی کہ محمد عبدہ نے الوقائع المصریہ کی ادارت میں محمد عبدہ نے ان کو اپنا معاون منتخب کرلیا، اس میں سعد زغلول بھی مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، یہ اس وقت کمسن تھے ہلباوی نے

اس کے بعد "جمعیۃ خیریۃ اسلامیہ" میں بڑے جوش و نشاط کے ساتھ کام شروع کر دیا

ہلباوی قاسم امین بک کے دوست تھے، جب امین بک نے اپنی وہ کتابیں نشر کیں جن کی وجہ سے ان کو عورت کا حامی اور اس کے حقوق کا محافظ شمار کیا گیا تو ہلباوی اس قلیل جماعت میں شریک ہو گئے، جس نے اس قضیہ کی مدافعت پر کمر باندھی جو اس سے پہلے مصریوں کے ذہن میں نہ گزرا تھا، اس راستہ میں ہلباوی مسلسل کام کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ عوام کی رائے اس مسئلہ میں بدل گئی ہے،

محمد عبدہ کے شاگردوں میں بہت سے سرکاری عہدہ دار اور ملک کے با اقتدار اشخاص صف اول میں سے تھے، منجملہ ان کے ابراہیم بک مویلحی (۱۸۴۶ - ۱۹۰۶) تھے یہ جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھے اور "العروۃ الوثقی" کی نشر و اشاعت میں آپ کی امداد کی، یہ محمد عبدہ کے مخلص دوستوں میں سے بھی تھے لیکن یہ آپ سے کم از کم ایک مرتبہ برگشتہ ہو گئے، جس وقت کہ ان پر "فتویٰ ترنسفال" میں شدید حملہ کیا گیا تھا، مویلحی اُن مصنفین میں سے ایک تھے جن کو خدیو عباس دوم نے محمد عبدہ سے جنگ و جدل کرنے کے لئے محافظ و نگران کار اساتذہ کی جماعت میں سے انتخاب کیا تھا،

مویلحی ذی ثروت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنی دولت باہمی شرکتوں میں ضائع کر دی، خدیو اسماعیل کے پاس قدر و منزلت حاصل کر لی، اس نے ان کو بہت سے عہدے عطا کئے، جب اسمٰعیل پاشا تخت سے معزول کر دیا گیا تو مویلحی اس کے بعد اس کے خاص سکریٹری کی حیثیت سے اطالیہ گئے، پھر آستانہ میں چند سال ٹھہرے رہے، یہاں سلطان کی رضامندی حاصل کر لی، اس طویل مدت کے دوران میں اخبارات میں بہت سے مضامین لکھا کرتے تھے، کئی مرتبہ ایک خاص رسالہ نکالنے کی کوشش کی، اور مختلف کامیابیاں ان کو حاصل ہوئیں ۱۸۶۷ء کے گرد و پیش ایک انجمن کی تاسیس

کی اور اس کا نام "المعارف" رکھا تاکہ اس کے ذریعہ قدیم عربی کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام کریں، نیز ایک مطبع کی تشکیل کی اور اس کا نام انجمن ہی کے نام پر رکھا تاکہ اسی قسم کی کتابیں نشر کی جائیں، علاوہ اور کتابوں کے قاموس تاج العروس شائع کی، رشید رضا کہتے ہیں کہ ابراہیم بک مویلحی بلاغت اور تنقید نگاری میں جمال الدین کے شاگردوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

اپنی ایک کتاب (ماہنامہ) نشر کی، اور اس کے ضمن میں اپنے آستانہ کے دوران قیام کے حالات و مشاہدات تحریر کیے اس کتاب کے وصف میں کہا گیا ہے کہ "عبدالحمید کے عہد میں یلدز کے اسرار و حقائق کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب ان سب میں بہترین ہے"

حسن باشا عاصم کا بھی شمار اسی گروہ میں ہوتا ہے، یہ خدیوی عباس دوم کے بہت بڑے سکریٹریوں میں سے تھے پھر اس کے دیوان کے صدر بھی ہوئے، یہ امام عبدہ کے بہت بڑے عقیدتمندوں میں سے تھے اور سب سے زیادہ آپ کے موید تھے اور "جمعیۃ خیریۃ اسلامیہ" میں عملی طور پر آپ کی امداد و اعانت کی، اس انجمن کے موسسین اور اس کے ارکان میں بہت جوشیلے کارکن تھے، اسی طرح انھوں نے امام کی ان کوششوں میں ہاتھ بٹایا جنھیں ادبی ارتقائی راہ میں صرف کیا تھا، اور آپ کے ساتھ محاکم شرعیہ کی اصلاح میں کام کیا، آپ محمد عبدہ کی وفات کے بعد تھوڑی ہی مدت میں وفات پا گئے،

حفنی بک ناصف (۱۸۵۶ - ۱۹۱۹ء) بھی اسی گروہ کے ایک فاضل تھے جمال الدین اور محمد عبدہ سے تعلیم حاصل کی، یہ ان دروس سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے دل میں جو گہرے اثرات ہوئے ان پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہم آپ کی تقریریں کو سن کر اپنے دلوں میں یہ محسوس کرتے تھے کہ ہم میں سے ہر شخص ایک صوبہ یا ایک مملکت کی اصلاح انجام دینے کا اہل اور سزاوار ہے"

حفنی بک ناصف ان علمائے مصرین کے وفد کے سکریٹری تھے جو "ویانا" میں ۱۸۸۶ء میں موتمر مستشرقین میں حاضر ہونے کے لئے منتخب کئے گئے تھے، انھوں نے کانفرنس میں ایک مقالہ پیش کیا، پھر بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہوئے مثلاً وزارت معارف میں صدر مفتش اور محاکم اہلیہ (عدالہائے ملکی) میں صدر قاضی رہے، نیز آپ مدرسۃ الحقوق میں پروفیسر بلاغت اور جامعہ مصریہ میں جس کی بنیاد ۱۹۰۹ء۔ ۱۹۱۰ء میں ڈالی گئی عربی ادب کے لکچرار تھے، نحو، بلاغت اور انشاپردازی میں کئی کتابیں لکھیں جو مصری مدارس کی درسی کتابوں میں شامل تھیں، تاریخ ادب عربی کے محاضرات جو جامعہ مصریہ میں پیش کئے گئے تھے، شائع ہوئے اس کے ذریعہ حفنی بک ناصف ادب جدید کے ترقی پسندوں میں سے تھے،

شائد تمھاری دلچسپی اور بڑھ جائے جب کہ تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ مصری شاعرہ جس نے اپنے آپ کو حقوق نسواں کی مدافعت کے لئے وقف کر دیا تھا اور جو "باحثۃ بادیہ" کے نام سے مضامین اور کتابیں لکھا کرتی تھی حفنی ناصف کی صاحبزادی ہے،

احمد فتحی زغلول پاشا (۱۸۶۳-۱۹۱۴) محمد عبدہ کے شاگردوں میں سے پہلی صف میں شمار ہوتے ہیں اور آپ کے ان قریبی مددگاروں میں سے تھے، جنھوں نے دیگر اصلاحی کوششوں میں اشتراک کے ساتھ ساتھ ارتقار ادب میں بھی حصہ لیا، یہ ان اشخاص میں سے ایک ہیں جنھیں وزارت معارف نے پہلا علمی وفد یورپ کی طرف روانہ کیا، جہاں انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی، جب مصر لوٹے تو اونچے عہدوں تک ترقی کرنے لگے یہاں تک کہ محاکم اہلیہ میں رئیس پھر وزارت حقانیہ کے وکیل ہو گئے آپ کی تصانیف کا بہت گہرا اثر تھا خصوصاً آپ کی ان متعدد کتابوں نے جنھیں آپ نے یورپی زبانوں سے عربی میں منتقل کیا تھا، بہت ہی اثر و رسوخ حاصل کر لیا،

آپ کی اہم تالیفات میں قانون میں چند رسائل اور مقالات کا مجموعہ ہیں، جو اس

دور کے حالات پر مشتمل ہیں، اولاً ان کو روزانہ اخبارات میں شائع کیا، انگریزی سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ کی ہیں ان میں سے کتاب "سر تقدم انجلیز" لسکسینین اور بنتام کی تصنیف اصول التشریع ہے، بعض فرانسیسی مصنفین مثلاً کانٹ دی کاستری، دہ مولان اور لیبان کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔

فتحی زغلول کا خیال یہ تھا کہ جن کتابوں کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے ان کو مصر کے حالات پر منطبق کیا جا سکے، یا ضرورت اس امر کی داعی تھی کہ اصلاح کی روح پھونکنے کے لئے اس قسم کی کتابیں ترجمہ کی جائیں، ہر کتاب مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی جس میں اس تطبیق کے پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی، چنانچہ دہ کاستری کی کتاب کے مقدمہ میں جس کا ترجمہ "الاسلام سوانح وخواطر" کے نام سے آپ نے کیا ہے مسلمانوں کے گذشتہ شاندار کارناموں اور ان کے مناقب و فضائل کو بیان کرتے ہوئے موجودہ رسوا کن حالت کو واضح کیا ہے، پھر المنار کی رائے کا اقتباس پیش کیا ہے جس کا پہلا نمبر عہد قریب ہی میں نکل چکا تھا، اس اقتباس سے آپ کا منشا یہ بیان کرنا تھا کہ مسلمانوں ہی نے اپنے آپ کو اس بری حالت پر پہنچا دیا ہے،

رشید رضا کہتے ہیں کہ المنار کے کلام سے فتحی زغلول کے استدلال نے لوگوں کے نزدیک بالخصوص وکلا اور قاضیوں کے طبقہ میں اس رسالہ کی قدر و منزلت بڑھا دی اگر آپ کا یہ استشہاد المنار سے نہ ہوتا تو یہ مقام المنار کو حاصل نہ ہوتا۔

ایک اور گروہ ہے جس نے محمد عبدہ کے دور میں یا آپ کے دور کے بعد شہرت پائی ان کا تذکرہ آپ کے شاگردوں کی صف میں ضروری ہے اگرچہ یہاں ان تمام کے اظہار کی گنجائش نہیں ہے لیکن ہم باوجودیکہ ان کے متعلق ہمارے پاس بہت کم ایسی معلومات ہیں جو اس تحریک میں ان کے شغف و انہماک کی تشریح کرتی ہیں ان میں سے بعض کا تذکرہ کریں گے ان میں سے علی بک فخری (المتوفی ۱۹۰۶ء) ہیں، انھوں نے قضاۃ

اور محاکم کی ترقی کے لئے کام کیا،

محمد عبدہ کے دوستوں میں ایک اور شخص محمد بک راسم ہے جس کے گھر میں اسکندریہ میں محمد عبدہ نے وفات پائی اس کے لبد امام کے بھائی حمودہ بک عبدہ ہیں آپ کے بیروت کے دوران قیام میں آپ سے انھوں نے تعلیم حاصل کی، محمود بک سالم بھی آپ کے ساتھیوں میں سے ہیں جو جمعیۃ الدعوۃ والارشاد کے صدر تھے، نیز محمد صالح باشا بھی آپ کے شاگرد ہیں جو ازہر اور دارالعلوم میں آپ کے حلقۂ درس میں شریک رہے،

آپ کے خاص دروس میں جو کلام اور مختلف فلسفیانہ مباحث پر مشتمل تھے اسمٰعیل صبری باشا، رفیق بک عظیم، شیخ احمد ابراہیم اور شیخ حسن منصور حاضر ہا کرتے تھے، مؤخرالذکر دو اصحاب اس کے علاوہ دارالعلوم کے دروس میں بھی شریک ہوئے۔

امیر لبنانی شکیب ارسلان نے بیروت میں محمد عبدہ سے تعلیم پائی اور آپ کی عمر بھر آپ کے شاگرد رہے، یہ اکثر اخباروں اور رسالوں میں مختلف مقالات لکھتے رہتے ہیں جن میں عام طور سے اسلام کی شان و عظمت کو بلند کرنے والے امور سے بحث کرتے ہیں

اسی طرح مصر کے مشہور عالم اور بلند پایہ ادیب احمد تیمور باشا اپنے ایام شباب میں ان اشخاص میں سے تھے جن کو محمد عبدہ کے دروس نے اپنی طرف جذب کرلیا، یہاں تک کہ یہ آپ کے جوشیلے شاگردوں میں سے ہو گئے، دارالعلوم میں آپ کے دروس میں حاضر رہے نیز ازہر میں آپ کے تمام حلقۂ درس میں بھی شریک رہے خصوصاً امام عبدہ کے ان محاضرات سے استفادہ کیا جو آپ نے بلاغت میں پیش کئے تھے، جن میں جرجانی کی دونوں کتابوں پر اعتماد کیا تھا، پھر تیمور باشا محمد عبدہ کے ان خاص دروس میں شریک ہوئے جو فلسفیانہ مسائل سے متعلق تھے اور امام سے گہرا تعلق پیدا کرلیا آپ کی تعلیمات ان میں سرایت کر گئیں یہاں تک کہ انھوں نے "عین شمس" میں امام عبدہ کے گھر کے متصل ایک گھر خرید لیا تاکہ آپ سے قریب رہکر زندگی لبسر کریں اور آپ کی مصاحبت سے لطف اندوز

اور بہرہ ور ہوں۔

اسی طرح سید محمد مصطفےٰ لطفی المنفلوطی (۱۸۷۶ - ۱۹۲۴) ہیں، یہ مصر کی دنیائے ادب میں مشہور شخصیت ہیں اور ادب جدید کے ارتقار کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں آپ ازہر سے متعلق تھے اور محمد عبدہ کے بلاغت کے دروس میں حاضر ہوئے اور آپ کی تعلیمات سے گہرا اثر قبول کیا۔

منفلوطی کو شعر اور مقالات نگاری میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا جدید مصری ادب کی بنیاد میں آپ کا گہرا اثر ہے، آپ کی تصنیفات دیگر بیشتر مصری تالیفات کے مقابلہ میں بکثرت مروج ہوئیں اور خصوصاً آپ کے مقالات کا مجموعہ "النظرات" نے عام مقبولیت حاصل کی۔

محمد عبدہ کے ساتھ منفلوطی کے تعلقات کے آثار اس حملہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ان مفاسد اور لطائف خیز خیالات پر وارد کیا گیا جو اسلام میں داخل ہو گئے نیز بہی اثرات آپ کی اس اصلاحی دعوت میں نظر آتے ہیں جو محمد عبدہ کی تصانیف میں جابجا پائے جاتے ہیں، منفلوطی نے اپنے اکثر قصائد میں اپنے استاد کی محبت، جانثاری اور احترام کا اعتراف کیا ہے۔

لیکن ہم اس کے باوجود منفلوطی کو قدیم روایات پر شدت کے ساتھ پابند دیکھتے ہیں چنانچہ آپ قاسم امین پر اعتراضات کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے آزادی نسواں کی دعوت دی، نیز تفسیر قرآن میں جدت پسند اشخاص کے منہج پر تنقید کرتے ہیں، خواہ وہ منہج بذات خود محمد عبدہ کا ہی کیوں نہ ہو۔

محمد عبدہ کے تلامذہ اور مقربین میں سے محمد بک حافظ ابراہیم (۱۸۷۳-۱۹۳۲) ہیں اور آپ عام طور سے شاعر نیل اور شاعر اجتماعی کے نام سے موسوم ہیں، کیونکہ آپ نے اپنی کتابوں میں اجتماعی مسائل پر شدت سے توجہ کی ہے اور خاص طور سے غریبوں

محتاجوں اور ناداروں کے متعلق رحمت وشفقت کے بے پناہ جذبات آپ کے دل میں موجزن تھے' آپ قاہرہ میں غریب والدین سے پیدا ہوئے' فاقہ وافلاس کی آغوش میں جوان ہوئے' بچپن ہی سے تنگدستی وغربت کے معنیٰ کا ادراک کیا' اور اس کا بہترین خاکہ پیش کیا' اور شفقت ومحبت سے لبریز الفاظ میں تنگدستی وافلاس کی پردہ کشائی کی'

جب حافظ نے ابتدائی مدارس میں اپنی تعلیم ختم کی تو جنگی مدرسہ سے ملحق ہوئے یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جیش مصری میں جو سوڈان میں تھا سپاہی مقرر ہوگئے یہاں چند سال تک رہے پھر مصر لوٹ آئے' اور فوج سے نکل گئے' اور محمد عبدہ سے رشتہ جوڑ لیا ان دونوں میں محبت ومودت کا اتصال ایک قصیدۂ تہنیت سے ہوا جس کو انھوں نے محمد عبدہ کی خدمت میں اس وقت پیش کیا جب کہ آپ کو ۱۸۹۹ء میں منصب افتا پر فائز کیا گیا۔ پھر اس کے بعد دیہاتوں میں دعوت وارشاد یا اصلاحی تحریک کی ترویج واشاعت کے لئے اپنے مختلف دوروں میں محمد عبدہ کی خدمت کا شرف حاصل کیا' ان دونوں میں محبت ومودت کے اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے کہ اکثر لوگ اس پر رشک کیا کرتے تھے' حافظ کہتے ہیں کہ "میں اوروں کی بہ نسبت امام سے بیحد متعلق تھا' رات دن آپ کی صحبت میں رہتا اور آپ کی خوشہ چینی کیا کرتا تھا"

اسی زمانے میں اپنے بہترین قصیدے نظم کئے جن میں صدق واخلاص کے جذبات کا اظہار کیا' ۱۹۱۱ء میں شاہی کتب خانہ کی جائیداد پر حافظ ابراہیم کا تقرر کیا گیا اور ۱۹۳۲ء تک اسی جگہ کام کرتے رہے۔

انھوں نے اپنے اصلاحی آراء وافکار کو واضح انداز میں اپنی کتاب 'لیالی سطیح' میں پیش کیا یہ کتاب اکثر وبیشتر نثر پر مشتمل ہے اگرچہ ضمناً شعر کے مصرعے بھی پائے جاتے ہیں' مولف نے اس کتاب کو اپنے اور فرزندانِ نیل اور تلامذہ کے درمیان

اور اس سطح کے مابین مکالمات کی شکل میں پیش کیا ہے، جو ایک زاہد خشک فلسفی ہے جس کی باتیں لوگ سنتے ہیں ان مکالمات میں مصری جماعت کے حالات پر آزادانہ تنقید کی گئی ہے، مثلاً وہ مشایخ طریقت کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی اس طرح توصیف کرتے ہیں کہ وہ مصر میں تمام لوگوں سے زیادہ خوشحال ہیں، کیونکہ لوگ اس کی اطاعت وعقیدت میں بیجا زیادتی کرتے ہیں اور ان کی عزت وتکریم میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ مرجاتے ہیں تو ان کے مقبرے مضبوط وشاندار بنائے جاتے ہیں اور ان کی بوسیدہ ہڈیوں سے برکت حاصل کی جاتی ہے (ص ۲۳)

مصریوں نے سرکاری ملازمت کو اپنا بہت بڑا مقصد اور تعلیم کو اس کے لئے ایک وسیلہ بنالیا ہے اس پر حافظ نے سخت تنقید کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں، کہ:

"مصری سرکاری ملازمت کی پوجا کرتا ہے، وہ اپنی تمام توجہ اس میں صرف کر دیتا اور اپنے علم کو اسی میں محصور کر دیتا ہے، کیونکہ اگر اُسے ملازمت نہ ملے تو اس کی امید بھی فنا ہو جائے اور سعی وعمل کرنے سے اس کے جذبات کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے، ملازمت میں داخل ہونے کے لئے عمر بھر انتظار ہی کرتا رہے گا"

پھر حافظ اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی ملازمت کے تصور سے علیحدہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

"اس سے بھی زیادہ دشوار چیزوں میں ان کی ہمتوں کو آمادہ کرو تاکہ ضرورت ان کے نفوس میں ایک نیا شعور پیدا کر دے، نوجوان یہ احساس کرنے لگے کہ وہ جو تعلیم پا رہا ہے حکومت کی ملازمت اختیار کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذات اور اپنی قوم کو سنوارنے کے لئے تعلیم حاصل کرتا ہے" (ص۲۷)

اسی لئے حافظ ایک نئی قسم کی تعلیم کی دعوت دیتے اور ایک ملکی یونیورسٹی کی تشکیل

کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

"امام عبدہ کے تلامذہ ملامت کے سزاوار ہیں، کیونکہ وہ حق بات کو جانتے ہیں مگر اس کی طرف دعوت نہیں دیتے، انھیں معلوم ہے کہ اس امت کے لئے بغیر کسی جامعہ کے کوئی زندگی نہیں، کیوں نہیں وہ مسلسل مالداروں کی وعظ و تلقین کے ذریعہ سرکوبی نہیں کرتے اور صبح و شام جامعہ کی تاسیس کا مطالبہ کرتے (ص ۱۲۴-۱۲۶)

اخباروں میں عام طور پر آزادی کے جو معنے رائج ہو گئے ہیں ان پر اور عوام کی تعلیم کی طرف ان کی بے توجہی ان کی ترقی اور ان کی زبان کے انحطاط پر تنقید کرتے ہیں (ص ۳۴ - ۳۸) اور کہتے ہیں کہ

"تقلید کی بندشوں کا خاتمہ کرنے میں جمال الدین اور آپ کے تلامذہ کو فضیلت حاصل ہے انھوں نے عربی زبان کو زندہ کیا اور انشا پردازی کے مردہ قالب میں زندگی کی لہر دوڑا دی، لوگ اس سے پیشتر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں مبتلا اور معنی سے نا آشنا تھے وہ اسی تاریکی میں گھرے ہوئے تھے کہ ہدایت کی روشنی کو دیکھا اور اس کے ذریعہ قرون وسطی کی ظلمتوں سے نکل گئے" (ص ۵۲)

"جمال الدین اس دنیا سے کوچ کر گئے جس طرح سقراط رحلت کر گیا، ان دونوں نے کوئی تصنیف و تالیف نہ چھوڑی، اگر محمد عبدہ نہ ہوتے تو افغانی کا اس قدر شہرہ نہ ہوتا، اگر افلاطون نہ ہوتا تو فلاسفہ یونان کے صدر (سقراط کا تذکرہ نہ کیا جاتا" (ص ۵۳)

پھر حافظ کہتے ہیں کہ :

"مغربی قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ مغربی مصنفین اپنے شاندار مباحث

کے ذریعہ عوام میں تاثیر کی روح پھونک رہے ہیں، اس کے لئے ان کو یہ چیز مساعد ہوئی کہ لوگ اسی زبان میں لکھتے ہیں جس زبان میں وہ بولتے ہیں، اس لئے شاعر کے مطالب و معانی ان کے نفوس میں سرایت کر جاتے ہیں اور غیر محسوس و لاشعوری طور پر مصنف و الشاعر کی روح ان کی روح سے گھل مل جاتی ہے، لیکن مصر میں واقعہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ یہاں لوگوں کی دو زبانیں ہیں جو باہم دیگر جداگانہ و مختلف ہیں، ایک گفتگو کے لئے مخصوص ہے اور دوسری لکھنے سے، اس طرح ان دونوں زبانوں میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی۔ (ص ۵۶)

پھر حافظ مصری زندگی کے گوشوں اور اس کے جملہ عیوب و نقائص پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں،

حافظ نے ترجمہ کی طرف بھی توجہ کی اور اس میں اپنے قلم کی جولانی دکھلائی۔ آپ نے "مکبتھ" کے ایک حصہ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور اس کو عربی اشعار کے قالب میں ڈھالنا چاہا لیکن آپ کو بڑی کامیابی دستیاب نہ ہوئی۔ پھر آپ کو وکٹر ہیوگو کی کتاب "البؤساء" بہت پسند آئی چنانچہ اس کو عربی میں منتقل کر دیا، اس کے علاوہ چند فرانسیسی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور اگرچہ آپ کو سیاست سے گہرا شغف نہ تھا لیکن بہت سے سیاسی قصائد نظم کئے، کہا جاتا ہے کہ حافظ نے عصر حاضر کی مصری تاریخ کا کوئی ایسا بڑا حادثہ نہ چھوڑا جس کے متعلق آپ نے خامہ فرسائی نہ کی ہو،

اپنے ایک قصیدہ میں قدماء نے شاعری پر جو بوجھل پابندیاں عائد کی تھیں ان کو توڑنے کیلئے نہایت فصیح و بلیغ انداز اختیار کیا ہے چنانچہ اسی کے متعلق کہتے ہیں:

آن یا شعر ان نفک قیودا ـــــ قیدتنا بہا دعاۃ المحال

زغارفعوا هذه الکمائم عنا   ودعونا نشم ریح الشمال

یہاں باد شمال سے یورپ کی طرف اشارہ ہے،

لیکن اس کے باوجود آپ کے قصائد سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قدیم حدود سے پورے طور پر نکل نہ سکے اگرچہ تجدیدی روح کا رنگ اس میں جھلکتا ہے، حافظ ابراہیم درحقیقت مصری زندگی میں ادب، مذہب اور اجتماع میں جدید رجحانات کے آئینہ دار ہیں،

ہم نے اوپر جن اشخاص کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض صراحۃً اور بعض کنایۃً اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ محمد عبدہ نے جس اصلاحی درخت کی تخم ریزی کی تھی اس کی شاخیں بیشمار گوشوں تک پھیل گئیں غالباً اس کے نمایاں آثار وہ تھے جو انشا پردازی اور فن خطابت میں رونما ہوئے،

یہ امر واقعہ ہے کہ جدید ادبی ارتقاء جنگ عظیم کے بعد ہی اپنی انتہائی منزل تک پہنچا ہے، اس کے ساتھ محمد عبدہ کی تحریک نے اُن عناصر و عوامل کی قوت میں اضافہ کر دیا جو اس سے پیشتر موجود تھے جدید ارتقائی روح کو بیدار کرنے میں اس کا وافر حصہ تھا، اس کا اثر نہ صرف ماہر مصنفین و متبحر علماء تک رہا بلکہ اس نے ایک صالح فضا پیدا کر دی جس میں انشا پردازی اور تصنیف و تالیف کا ایک نیا دور پیدا کرنا ممکن ہو گیا شیخ عبدہ نے مصر کی عقل و فکر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرانے اور دین اسلام اور اسلامی ثقافت کے درمیان اور جدید تمدن کے موجودہ مراحل کے مابین تفقت ہم و ہم آہنگی پیدا کرنے کی راہ میں جو کوششیں مبذول کیں انھوں نے عصر حاضر میں اُن روابط و تعلقات کو منقطع کئے بغیر جو موجودہ و گذشتہ اسلامی دور کے ادب کے مابین قائم ہو چکے تھے، عربی ادب کی تجدید کی راہیں ہموار کیں، اس میں کوئی شک

ہیں کہ مسلمان مصنفین اور انشاپردازی کا موجودہ گروہ استاذ امام محمد عبدہ کے لیے اس فضیلت وبرتری کا اقرار کرتا ہے۔

لیکن یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس میں غور کریں کہ محمد عبدہ کے دور میں دینی اصلاح کی دعوت وتحریک کو جو پہلا مقام حاصل تھا، وہ اب مفقود ہو گیا اور بعض دوسری تحریکات نے اس کی جگہ لے لی۔ اس لیے یہاں ہمیں ضروری ہو گیا کہ ہم ان اہم تحریکات میں نظر وتوجہ کریں اور اُن زعماء کبار پر گفتگو کریں جنھوں نے ان تحریکات میں کوشش کی۔

سیاسی تحریک

غالباً تمھیں یاد ہوگا کہ جمال الدین کی تعلیمات جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں اہم ترین بنیاد ، اساس سیاسی انقلاب تھا، آپ کا مطمح نظر یہ تھا کہ آپ اپنے اغراض ومقاصد کو بارآور بنانے کے لیے جن وسائل سے کام لیتے ہیں ان سے سیاسی ریشہ دوانیوں کو بھی حسب اقتضائے حال ایک وسیلۂ کار قرار دیا جائے۔

شاید یہ بھی تمھیں یاد ہوگا کہ جمال الدین نے اپنے پیروؤں کے ساتھ جن میں محمد عبدہ بھی شامل تھے، خدیوی اسماعیل باشا کو قتل کرنے کی تجویز سوچی لیکن جب وہ اس ارادہ سے باز آئے تو اس کو معزول کرنے کی کوشش کی، کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ نیابی حکومت یا اس کے علاوہ اصلاحات کا بارآور ہونا اسی وقت ممکن ہے جب کہ توفیق باشا کو حکومت کا والی بنا دیا جائے۔

المنار کی روایت ہے کہ محمد عبدہ نے عرابی شورش کی تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ مصریوں کا ایک وفد جس میں جمال الدین بھی تھے حکومت فرانس کے کارندے کے پاس گئے اور اس کے روبرو یہ ظاہر کیا کہ مصر میں اصلاح اس ایک وطنی پارٹی ہے جو اصلاح کی طلبگار ہے اور اصلی کوشش کر رہی ہے اور مصر میں اصلاح

وقت تک پائے تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی تاوقتیکہ توفیق باشا کو حکمران نہ بنا دیا جائے یہ خبر قاہرہ وغیرہ دوسرے ممالک میں پھیل گئی، اخبارات نے اس کو مشہور کیا یہی موقعہ تھا جس میں مصر کی آزاد وطنی پارٹی کا شہرہ ہوا۔

باوجودیکہ محمد عبدہ اپنے استاد کی بہ نسبت بہت کم تجاوز پسند تھے لیکن جس وقت جمال الدین مصر میں تھے آپ اپنی طرف سے راضی ہو گئے کہ جرأت آمیز اقدام میں کمی نہ کریں گے نیز اس کے بعد خفیہ ہیجان خیزی کے لئے کام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن اس مدت کے دوران میں جو تلخناک تجربات آپ کو حاصل ہوئے آپ کو ان کی وجہ سے سیاست میں انتہائی شک پیدا ہو گیا اور اس میں کام کرنے سے آپ غیر مطمئن ہو گئے، رشید رضا بیان کرتے ہیں کہ آپ اس کے باوجود تعلیم و تربیت میں کچھ سیاسی رنگ آمیزی بھی کر دیا کرتے تھے، کیونکہ آپ کی رائے تھی کہ کسی آدمی کی انسانیت تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ ان امور سے آشنا نہ ہو جائے جو اس کے ملکوں کی آزادی واستقلال سے محکم تعلق رکھتے ہیں، آپ حب وطن کی ترغیب دیا کرتے اور لوگوں کو وطنی مصلحتوں پر اتفاق کرنے کی ضرورت کو بیان کرتے اور کہتے کہ یہ دینی ہدایت کے منافی نہیں ہے۔

ہم ان دو ہستیوں کے اثر کو، جن میں سے ایک تجاوز پسند اور دوسرا اعتدال پسند ہے مصر کی جدید سیاسی تحریک میں ملاحظہ کر سکتے ہیں،

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں وطنی تحریک کی ناکامی کے بعد جس کی قیادت عرابی نے انجام دی تھی پھر مصر میں شعور وطنی کی تجدید ہوتی ہے، مصر میں اس وطنی تحریک کے دور کو " دور صحافی " سے نامزد کیا جاتا ہے، یہ نام بیکار یا واقعہ کے مخالف نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں اس شعور وطنی کا اظہار ان فرانسیسی اور عربی اخبارات ورسائل کے مقالات میں کیا گیا جو انگریزوں کے خلاف سخت زہر اگلا کرتے اور ہیجان

برپا کیا کرتے تھے،

مصطفیٰ کامل پاشا (۱۸۷۴ - ۱۹۰۹) جو حزب وطنی کا نوجوان زعیم تھا جس نے نئے سرے سے انقلابی روح پھونکی تھی، انتہائی وطن پرست تھا اور وطنیوں کے دلوں میں غیرت و شجاعت کی تجاوز پسند روح پھونکتا تھا،

مصطفیٰ کامل اپنے وطن کی آزادی کے گیت گاتا تھا اور اس کا اعتقاد تھا کہ یہ آزادی صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب کہ یورپی حکومتوں میں سے کوئی حکومت بالخصوص حکومت فرانس مصر میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے دخل انداز ہوجائے،

اس مقصد کے لئے اس نے انتھک کوشش کی، چنانچہ یورپ کے اکثر ممالک کی سیاحت کی اور یہاں علی الاعلان اپنے مقصد کی دعوت دیتا رہا، اور پوشیدہ طور پر بھی لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے کام کرتا رہا، خدیوی عباس دوم اس کی تمام کوششوں میں اس کی تائید کرتا اور اُسے مالی امداد بھی پہنچاتا تھا، جب اس نے دیکھا کہ اپنی غرض و غایت کے پورا کرنے کے لئے یورپی مداخلت کی طرف مائل یا اس پر اعتماد نہیں کرسکتا تو خلافت عثمانیہ کی تنظیم اور جامعۃ اسلامیہ کے تعلقات کی مضبوط و استحکام کی بڑی تمناؤں کو لئے ہوئے ترکی کی طرف اپنی توجہ پھیر دی ——— لیکن ترکی میں بھی اس کی آرزوئیں ناکام رہیں،

اس اثناء میں ۱۹۰۰ء میں جریدہ اللواء جاری کیا اس کو اور اپنی آتشیں تقریروں کو انگریزوں کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بغاوت پر آمادہ کرنے اور اپنے ملک کی آزادی کے مطالبہ کی دعوت کے لئے آلۂ کار بنایا اور بڑی حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا، اس کامیابی کا سہرا اس کے جوش حمیت اور اس کی آتشیں تحریر و تقریر کے سر ہے کیونکہ وہ لوگوں کے جذبات و احساسات سے خطاب کیا کرتا تھا، اور اُن کو برانگیختہ و

مشتعل کیا کرتا تھا،

اس کی انگریز دشمنی میں شدت وغلو کا سبب اس کی فرانسیسی تربیت اور اسکے فرانسیسیوں کے جذبات و رجحانات کے تاثر کی طرف لوٹتا ہے۔ بالخصوص اس کا سبب موسیو دلویکل جو مصر میں ۱۸۹۵ء میں چند ماہ مقیم رہا اور میڈم جولیٹ آدم وغیرہ سے اتصال ہے،

مصطفیٰ کامل اور جمال الدین افغانی کے درمیان اتصال کا سلسلہ ہے، حزب وطنی نے جس کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں اس نے ڈالی، بیان کیا ہے کہ مصطفیٰ ہی اس قدیم حزب وطنی کا وارث یگانہ اور سلسلہ جنبان ہے جس کو جمال الدین اور آپ کے خلیفۂ دعوت نے قائم کیا تھا اس کا کچھ سبب تو وطنیت میں اس کی تجاوز پسندی کی طرف لوٹتا ہے،

محمد عبدہ نے جمال الدین کی تعلیمات اور ان کی تحریک کے درمیان اور مصطفیٰ کامل اور اس کی پارٹی کے مابین ہم آہنگی و پیوستگی پیدا نہیں کی جیسا کہ اس کا خیال کیا جاتا تھا اس لئے کہ محمد عبدہ اور مصطفیٰ کامل کے درمیان جو تعلقات تھے اور ان کے درمیان مصر اور اسلام کے لئے یکساں عمل کرنے کے لئے جو تبادلہ خیالات ہوئے وہ اس قسم کے نہ تھے کہ عملی طور سے ان کے باہم اتفاق کیا جا سکے، کیونکہ ان دونوں کے مقاصد میں کوئی جوہری مشابہت نہ تھی بلکہ وسائل میں بھی ان کے باہم اختلاف تھا،

محمد عبدہ کے ساتھی اپنی طرف سے اُن اسباب کے اخلاص سے مطمئن نہ تھے جو مصطفیٰ کامل کو متحرک کر رہے تھے کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ خدیوی نے اس کو مال سے خرید لیا ہے،

لیکن جمال الدین کی تعلیمات اور مصطفیٰ کامل کے درمیان جس شخص نے ہم آہنگی پیدا کی وہ سید عبداللہ ندیم (۱۸۴۵ - ۱۸۹۶) ہیں جو جمال الدین کے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے تھے،

رشید رضا بیان کرتے ہیں کہ سید عبداللہ ندیم جمال الدین کے شاگردوں میں

انقلاب اعرابیہ کے عہد میں ولولہ انگیز اور ہیجان خیز تقریریں بہت مشہور تھے، بغاوت کی آگ بھڑکایا کرتے تھے، یہ اسی شورش کے اہل تھے اور شورش انہی کی سزاوار تھی کیونکہ یہ مبالغہ پسند اور ہنگامہ آرا تھے عوام انتہا پسندی ہی سے برانگیختہ ہوتے ہیں،

جب حکومت نے ان کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا تو یہ دیگر بغاوت پسند لیڈروں کے ہمراہ فرار ہو گئے اور ۱۸۹۱ء تک اس کے قبضے میں پڑنے سے نجات پائی، حالانکہ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص ان کے متعلق اطلاع دیگا تو اس کو انعام دیا جائے گا لیکن آئندہ سال ان کو گرفتار کر لیا گیا پھر ان کو اس شرط پر معاف کیا گیا کہ وہ مصر سے جلاوطن ہو جائیں، چنانچہ وہ فلسطین چلے گئے اور یافا میں تقریباً ایک سال تک مقیم رہے جب خدیوی عباس دوم تخت حکومت کا والی ہوا تو مصر واپس ہوئے اور ایک اخبار "الاستاذ" نامی جاری کیا، جو بقول رشید رضا جریدہ العروۃ الوثقی کے ساتھ کچھ مشابہت رکھتا تھا،

لیکن ان کی یہ جرأت اور حوصلہ مندی زیادہ زمانے تک باقی نہ رہی ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ دوبارہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ دینی تعصب کی روح کو برانگیختہ کرتے تھے اور ایسے آراء و افکار پھیلایا کرتے تھے، جو لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیں، چنانچہ دوبارہ یافا چلے گئے اور چند ماہ بعد یہاں سے آستانہ کی طرف کوچ کیا جہاں حکومت عثمانیہ نے مفتش مطبوعات کے عہدہ پر فائز کیا، یہاں جمال الدین سے آپ کی دوستی کی تجدید ہوئی اور آستانہ ہی میں مقیم رہے یہاں تک کہ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۶ء میں یہیں وفات پائی۔

سید عبداللہ ندیم پُرگو شاعر تھے، مسلسل سیاسی معاملات میں مضامین لکھا کرتے تھے، انھوں نے مختلف موضوع میں اکیس کتابیں لکھی ہیں

جب یہ یافا سے پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں واپس ہوئے تو مصطفیٰ کامل کی شہرت

سنی جو اس وقت طالب علم تھے اور اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کیا تھا اور طلباء میں ہیجان بپا کرتے تھے چنانچہ سید عبداللہ ندیم نے اس وطن پرست نوجوان کو تلاش کیا اور اس کے روبرو اپنا ماجرا بیان کیا، اور جو کچھ واقعات و مصائب ان پر گذرے تھے ان کا اظہار کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اس نوجوان کے دل میں تجاوز پسند آراء و افکار کی تخم ریزی کی، جرجی زیدان مصطفیٰ کامل نے سید عبداللہ ندیم کی بعض صفات حاصل کرلیں، اور انھیں سے خدیوی کے ساتھ اتفاق کرنے کا رحجان سیکھا تاکہ آزادی کی دعوت میں آسانی ہو اس خیال کا اولین ثمرہ یہ تھا کہ ۸ جنوری ۱۸۹۵ء میں خدیوی کی تخت نشینی کا سالانہ جشن منایا گیا،

حزب الوطنی اور اس کے تجاوز پسند مطالبہ کی دوسری اعتدال پسند جماعتوں نے جو اگرچہ اعتدال میں مختلف و متفاوت تھیں مخالفت شروع کردی، ان سب میں سب سے پیش پیش حزب الامۃ تھی، جس میں محمد عبدہ کے پیرووں کی ایک کثیر تعداد شامل تھی، ان کی طرف لارڈ کرومر نے ۱۹۰۶ء میں اپنی سالانہ رپورٹ میں اشارہ کیا ہے کہ یہ مصریوں کی ایک قلیل جماعت تھی لیکن اس کی تعداد روز افزوں بڑھ رہی تھی ان کے متعلق بہت کم سنا جاتا ہے لیکن یہ حزب وطنی سے وطنیت کے وصف میں کم مستحق نہیں تھے۔ یہ اپنے وطن کی ترقی کے راگ آلاپتے اور جامعۃ اسلامیہ کے خیال میں رنگے بغیر اپنے دینی بھائیوں کی ترقی اور ان کی پیش قدمی کے لئے کام کرتے تھے، وہ مصر میں یورپی تمدن و ثقافت کو داخل کرنے کے لئے یورپی اشخاص کے تعاون کی خواہش رکھتے تھے پھر لارڈ کرومر کہتا ہے کہ میرے خیال میں مصری وطنیت کے لئے اس کے صحیح علمی مفہوم کے اعتبار سے یگانہ آرزو کا انحصار محض حزب الامۃ کے ارکان پر ہے

جب حزب الامۃ نے ۱۹۰۷ء میں میدان سیاست میں کود پڑی تو یہ اولین سیاسی جماعت تھی جس کا مصر میں ایک نظام تھا اور ایک پروگرام تھا، یہ اولین جماعت تھی ...کے حالات زندگی میں لکھتے ہیں کہ اسی اتصال کا نتیجہ تھا کہ مصطفیٰ کامل۔

جس کے پاس ایک مفصل پروگرام تھا جس میں ملک کی سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی جملہ ضروریات و مصالح اور حاجات شامل تھیں اس کے بعد دوسری جماعتوں نے اسی کی روش اختیار کی،

اس کی مفصل اسکیم اکثر ان امور پر مشتمل تھی جس کی طرف محمد عبدہ دعوت دیا کرتے تھے، منجملہ ان کے تجویز میں یہ دعوت دی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیم کو آزاد نہ اور جبری دونوں طریقوں سے عام کیا جائے، اعلیٰ تعلیم کو ترقی دی جائے اور حکومت نیابی کے مبادی کو دیگر مجالس کے واسطہ سے بتدریج مجلس نیابی سے صوبوں کی اور مقامی مجلسوں کی طرف نشر کیا جائے اس پارٹی میں علماء اور دور اندیش اشخاص کا ایک گروہ بھی داخل ہوگیا جس میں ارباب حکومت اور ملک کے مقتدر و بارسوخ افراد شامل تھے،

حزب الامۃ کی تشکیل کے وقت حسن عبدالرازق باشا اس کے صدر تھے، جو مجلس شوریٰ القوانین کے ایک زعیم تھے جب کہ محمد عبدہ اس مجلس کے ایک رکن تھے یہ امام کے مخلص اور سچے رفیقوں اور مددگاروں میں سے تھے۔

لیکن ۱۹۰۷ء میں ان کے انتقال سے اس انجمن کو بہت صدمہ پہنچا، ان کے بعد محمود باشا سلیمان (المتوفی ۱۹۲۹ء) صدارت میں ان کے جانشین ہوئے پھر ان کے بعد احمد لطفی سید ایک مدیر الجریدہ صدر ہوئے، یہ اخبار حزب الامۃ کی زبان تھا

جب لارڈ کرومر نے مصر سے کوچ کیا اور حزب الامۃ کے بعض زعماء بھی دنیا سے کوچ کر گئے تو اس پارٹی کی سیاست میں تغیر رونما ہوگیا، پہلے یہ پارٹی اجنبی اقتدار کی تائید کرتی اور برطانوی عہدہ داروں کے ساتھ تعاون کی طرف دعوت دیتی تھی تو اب ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا شروع کر دیا جو حزب الوطنی کے اس طرز عمل سے تلخی و شدت میں کسی طرح کم نہ تھا جو وہ انگریزوں کے ساتھ برتا کرتی تھی، پارٹی کی سیاست میں اس تبدیلی و تحویل کی وجہ سے اس کے بیشتر ارکان اس سے دست بردار ہوگئے پھر اس میں

ضعف واضمحلال نمودار ہو گیا،

یہاں ہم جریدہ کے بارے میں چند امور کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں جو ۱۹۰۷ء سے اپنی ابتدائی تشکیل سے لے کر ۱۹۱۴ء میں اپنے بند ہونے تک حزب الامۃ کی زبان تھا، اس کے موسس اور مدیر احمد لطفی سید بک تھے جو وزیر تعلیمات تھے پھر جدید جامعہ مصریہ کے مہتمم تھے، آپ کے دور میں الجریدہ اُن اصلاحی آراء و خیالات کی مدافعت کیا کرتا تھا، جن کی طرف محمد عبدہ کے پیرو دعوت دیتے تھے اور بہت جلد یہ رسالہ ملک کا ایک مشہور جریدہ بن گیا۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل رئیس تحریر "السیاسۃ" نے جہاں اُن سیاسی اغراض میں گفتگو کی ہے جن کی طرف وہ جماعت دعوت دیتی تھی جو لطفی بک کے ارد گرد جمع تھی اور ہیکل ان میں سے ایک تھے جب کہ یہ وکالت کے طالب علم تھے، وہاں کہتے ہیں کہ "مصری اپنی پہلی سیاست کی ناکامی کو جس پر انھوں نے فرانس کی سیاست پر پھر یورپ پھر باب عالی کی سیاست پر اعتماد کا اجراء کیا تھا، ان کی ایک جماعت نے اندازہ لگایا کہ دوسری سیاست کی روش اختیار کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ قوم میں علم و اخلاق کے ذریعہ آزادی کے وسائل حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جائے اور بنفس نفیس اس کے دل میں ایمان کی تخم ریزی کی جائے نہ اس لئے کہ محض انگریز دشمنی اس سے مقصود ہو نہ باب عالی اور خلافت کے بلند مقام کی تمنا، بلکہ اس کا مقصد بذات خود آزادی و استقلال ہو، لطفی بک سید سابق وزیر تعلیمات اُن اشخاص کے ترجمان تھے جن کی تفکیر کا زاویہ یہی تھا۔

انھوں نے مناسب خیال کیا کہ مغربی تمدن اور مغربی سائنس کے درمیان اور مصر کی اجتماعی، دینی، اور ادبی زندگی کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے محمد عبدہ کا طریقہ اختیار کریں اور اس کو صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالیں، اسی لئے ہم

دیکھتے ہیں کہ لطفی بک خود اپنی آزادیٔ فکر، پختگیٔ رائے اور ارتقائے افکار کے ساتھ ساتھ ان تمام امور میں جو دین اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں اعتدال پسندی اور نگرانی کو پیش نظر رکھنے کی طرف مائل ہیں، انھوں نے باحثۃ بادیہ کی کتاب النسائیات کے مقدمہ میں اس کی تعریف کی ہے کیونکہ اس نے اپنی اصلاحی دعوت میں حدود شرع میں ایک معتدل روش اختیار کی، یہ محض اس طرز عمل کی مدح وستائش کرتے ہیں جس کے سزاوار ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے اور جو درحقیقت محمد عبدہ کی ساری جماعت کی اسکیم تھی۔

یہاں ایک اور چیز ہے جس سے اس مثالی نمونہ کا پتہ چلتا ہے جو اس جماعت اور اس کی ان کوششوں کا مطمح نظر تھا جن کو وہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے خرچ کرتی تھی، وہ یہ کہ ۱۹۰۸ء میں ملکی مصری یونیورسٹی کی تشکیل کی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سہرا اس جماعت کے سر ہے کیونکہ اس یونیورسٹی کی تشکیل درحقیقت سعد زغلول، قاسم امین، حفنی ناصف اور لطفی سید وغیرہ محمد عبدہ کے ساتھیوں کی کوششوں کی طرف لوٹتی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیسی یونیورسٹی کی تشکیل کا خیال سب سے پہلے مصطفیٰ کامل نے پیش کیا۔ لیکن اس نے ۱۹۰۵ء میں اس سے قطع نظر کرلیا، کیونکہ لارڈ کرومر اس تجویز سے راضی نہ تھا۔

ڈاکٹر ہیکل کہتے ہیں کہ مصطفیٰ کامل نے جب کہ وہ مصر میں مقیم تھا یہ سنا کہ سعد زغلول اور قاسم امین نے دیسی مصری یونیورسٹی کی تاسیس کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا ہے تو اس نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ ان سے پہلے اس نے اس خیال کو پیش کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہمیں کی نگرانی میں اس کی تنقید ہو، اس جامعہ میں یکے بعد دیگرے مختلف مراحل طے ہونے کے بعد ۱۹۲۵ء میں

حکومت نے اس کی نئے سرے سے تنظیم شروع کی اور لطفی سید بک کو اس کا مہتمم منتخب کیا،

مصر میں دو بہت بڑے اخبار تھے جو مخالفت کا جھنڈا بلند کئے ہوئے تھے ان میں سے ایک جریدۂ اللواء تھا جو مصطفیٰ کامل کی زیر ادارت نکلتا تھا دوسرا جریدۂ المؤید تھا جس کے مدیر شیخ علی یوسف تھے جو اسلامی محافظ رائے کے علمبردار تھے،

یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ مصطفیٰ کامل کی نگاہیں مغربی تمدن کی چمک دمک سے خیرہ تھیں جس کا بار بار تذکرہ اس کی کتابوں اور رسائل میں پایا جاتا ہے لیکن وہ اپنی اجتماعی دعوت میں نہ صرف محافظ تھے بلکہ رجعت پسندوں میں سے ایک تھے،

لیکن شیخ علی یوسف (۱۸۶۳-۱۹۱۳) ایک ماہر صحیفہ نگار تھے، ان کو اقتدار حاصل تھا جو کبھی کبھی مکر وفریب سے آمیز ہو جاتا تھا، انھوں نے المؤید کو عالم اسلامی میں ایک اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا

خدیوی عباس دوم جریدۂ المؤید پر اپنی رعایت وحمایت سے محیط تھا چنانچہ شیخ علی یوسف خدیوی کے ہم رکاب رہتے، جہاں کہیں وہ چلتا یہ بھی اس کے ساتھ چلتے، یہ بادشاہ کے اخلاص کا دم بھرتے تھے جو مصطفیٰ کے اخلاص سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا،

شیخ علی یوسف نے المؤید کی سیاست کی طرف توجہ کی اور اسے محافظ رائے کی طرف دعوت دینے کے لئے "بانگ درا" بنا دیا اس کے مخالفین کی نظر میں کم ازکم وہ مذہبی تعصب کے دفینوں کو میدان میں لانے والا بن گیا لیکن وہ محمد عبدہ اور رشید رشید رضا کا سچا دوست تھا، محمد عبدہ نے جب ایک نامعلوم کام کی وجہ سے آستانہ کی طرف سفر کیا تو علی یوسف آپ کے ساتھ تھے، المؤید نے محمد عبدہ کے ان مقالات

کی نشرواشاعت کے لئے جو ہانوتو کی تردید میں لکھے گئے تھے اپنا سینہ کھول دیا، انھوں نے محمد عبدہ اور خدیوی کے درمیان مصالحت پیدا کرانے کی بارہا کوشش کی اس کے لئے انھوں نے اپنے اور خدیوی کے درمیان جو قریبی تعلقات وخوشگوار روابط تھے اُن پر اعتماد کیا،

ہم نہیں چاہتے کہ ان خصوصیات پر محیطی نظر ڈالیں جن سے گذشتہ صدی کی ابتداء سے مصر میں سیاسی پارٹیوں کی تاریخ ممتاز ہے، بالتفصیل کے ساتھ ان اشخاص پر روشنی ڈالیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان میں کام کیا اور ان کے ارکین کے تغیر وتبدل سے ان کو کیا نقصانات پہنچے، ان تمام امور نے زیادہ تر ان کے معاملا کو مضطرب اور ان کی حالتوں کو دگرگوں کر دیا ان کے متعلق ہمارا مذکورہ بالا بیان غالباً اُن اتصالی زاویوں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ جنھوں نے ان پارٹیوں کی تاریخ کے درمیان اور محمد عبدہ کی پیدا کردہ تحریک کے مابین ہم آہنگی واتصال پیدا کر دیا،

لیکن ہمیں یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ محمد عبدہ کے پیروؤں اور آپ کے مددگاروں میں صرف ایک ایسی نمایاں ہستی ہے جو مصر کی جدید سیاسی زندگی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، یہ زعیم سعد زغلول باشا ہیں جن کو جنگ عظیم کے بعد عالمگیر اور آفاقی شہرت حاصل ہوگئی کیونکہ آپ اپنے ملک کی بولتی زبان تھے جو ملک کے حقوق کی مدافعت کرتے اور اس کی امیدوں اور تمناؤں کی تعبیر پیش کیا کرتے تھے، ہمارا مقصد نہیں کہ اس مشہور زعیم کی زندگی پر تفصیلی نگاہ ڈالیں بلکہ ہم صرف حسب اقتضائے حال اس تعلق کو پیش کر دینا چاہتے ہیں جو ان کے اور محمد عبدہ کے درمیان محکم تھے،

سعد زغلول ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے، اس طرح آپ محمد عبدہ سے عمر میں تقریباً دس سال چھوٹے ہیں یہ واضح نہیں ہے کہ آپ کے ازہر میں داخل ہونے کے وقت محمد عبدہ نے ازہر میں اپنا دور تکمیل ختم کر لیا تھا اور طلبا کو جو آپ سے تعلیمی امداد کے

طلبگار تھے ورس دینا شروع کر دیا تھا، یا یہ کہ سعد زغلول اس وقت ازہر میں شریک ہوئے جب کہ محمد عبدہ اس میں مدرس ہو چکے تھے۔ لیکن یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سعد امام کے شاگردوں میں سے ایک تھے جب کہ آپ ازہر سے ملحق ہوئے، پھر اس کے جمال الدین کے حلقۂ درس میں امام کے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوئے، مگر آپ کی تعلیم کا یہ ابتدائی عہد تھا، اس لئے آپ اونچے اسباق سے جو جمال الدین فلسفہ اور توحید میں دیا کرتے تھے بڑی حد تک استفادہ کرنے کے اہل نہ تھے،

اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ آپ ان دروس میں زیادہ مدت تک شریک نہ ہو سکے کیونکہ جمال الدین ۱۸۷۹ء میں مصر سے کوچ کرنے کے لئے مجبور ہو گئے، اس کے باوجود آپ نے جمال الدین کے اقوال سے دیگر مختلف گوشوں میں استفادہ کیا، چنانچہ سیاسی خطابت میں آپ کی کامیابی اُس مشق و مزاولت کی طرف لوٹتی ہے جس کو آپ نے جمال الدین سے حاصل کیا۔

باقی رہا سعد کا محمد عبدہ سے ربط و تعلق تو وہ ابتدائے عہد ہی سے نہایت قوی اور محکم تھا، آپ دوسروں کی طرح محض ایک شاگرد ہی نہ تھے بلکہ معتقد بھی تھے صوفیانہ طریقوں میں آپ ایک مبتدی کی طرح اپنے استاد کی توجہ کے مطیع و منقاد تھے آپ کے متعلق ان کے دل میں ذرا بھی تردد نہ تھا، طالب علمی کے زمانے میں آپ امام کے سایۂ عاطفت اور آپ کی آغوش میں آپ کے دوسرے تلامذہ کی طرح نہ تھے بلکہ آپ کے لڑکے کی حیثیت سے تھے، چنانچہ آپ محمد عبدہ کے علم و عمل، اخلاق و شمائل اور آپ کے کلام کی فصاحت و بلاغت سے مستفید ہوا کرتے تھے، اس طرح آپ کے سامنے آپ کے فیض صحبت و تربیت سے مضمون نگار، مقرر، ادیب، سیاست دان، وطن پرست اور اسلامی نوجوان بن گئے

جب محمد عبدہ کو "الوقائع المصریۃ" کی ادارت کا عہدہ سپرد کیا گیا تو آپ نے سعد زغلول

کو باوجود آپ کی صغر سنی کے رسالہ کی ادارت میں اپنا معاون منتخب کیا چنانچہ آپ نے ان اجتماعی سیاسی اور اقتصادی مسائل میں مضمون نگاری کی مشق کی جنہوں نے اعرابی شورش سے پیشتر اور اس کے پھوٹنے پھیلنے کے بعد ملک کی فضا کو تھرا دیا حکومت کے تمام معاملات وحالات سے آگاہ ہوئے اور اپنے شفیق استاد کی زیر نگرانی ادبی تحریر کی تربیت حاصل کی، ہم ان فائدوں کے اندازہ لگانے میں جس قدر مبالغہ کریں جو سعد زغلول کو اپنے استاد کے ربط وتعلق کی وجہ سے ان تمام میدانوں میں حاصل ہوئے تب بھی اس موضوع کو کما حقہ پورا نہ کرسکیں گے،

سعد زغلول کو اپنے اوائل عہد ہی میں اس اعتراف سے خوشی حاصل ہوتی تھی کہ آپ امام کے معتقدین میں سے ہیں جن کے فیضان تربیت ہی کی بدولت آپ ملک کے ایک زعیم بن گئے، جس وقت آپ نے محمد عبدہ کو خط لکھا جب کہ آپ اپنی جلاوطنی میں تھے تو اپنا اور اپنے ساتھیوں کا اس طرح تعارف کرایا کہ "یہ تمام آپ کے پیروؤں اور آپ کے معتقدین کا گروہ ہیں" پھر اپنی فکری کمزوری کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ "میری فکر پر اس دن سے ضعف طاری ہوگیا ہے جب کہ جدائی اور دوری کا دل پر صدمہ ہوا اس میں ان حقائق سے دوری پیدا ہوگئی ہے جن کو آپ ہمارے روبرو اُجاگر کیا کرتے تھے اب ہمارے سامنے وہ دھندلے ہو گئے ہیں جن سے سینہ تنگ ہوگیا ہے زبان ان کی تردید پر قادر نہیں کیونکہ اپنی مرغوب چیز کے فوت ہوجانے یا کسی مکروہ شئے سے دوچار ہوجانے کا خوف دامنگیر ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں" پھر آپ اپنے استاد سے توقع رکھتے ہیں کہ خط وکتابت کو جاری کرکے فکر کو قوت بہم پہنچائیں آخر میں اپنا خط اس طرح ختم کرتے ہیں "اللہ ہمیں آپ کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کی جدائی اپنے ملک میں زیادہ دیر باقی نہ رکھے کیونکہ آپ اس کے امام وپیشوا ہیں اگرچہ آپ کے علاوہ دوسرے قائدین

گئے ہیں۔ نیز آپ ملک کے سچے پرستار ہیں اگرچہ ملک نے آپ کی قدر و منزلت نہ پہچانی
والسلام "دستخط اس طرح کرتے ہیں اور آپ کا برخوردار سعد زغلول"

جب محمد عبدہ نے اپنا ملک چھوڑ دیا، تو سعد زغلول وکالت میں مشغول ہو گئے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی محنت و مشقت کے ذریعہ مجد و عزت کی چوٹی پر پہنچ گئے پھر محاکم اہلیہ (ولیسی عدالتوں) میں قاضی پھر عدالت خفیفہ (محکمۃ الاستئناف) میں مشیر مقرر ہو گئے خطابت میں کمال پیدا کر لیا اور قوانین سے آگاہی اور دلیل و حجت کے قائم کرنے میں مہارت حاصل کی، بحث و تحقیق کی دقت، رائے و مشورہ کی آزادی اور احکام و قوانین میں عدل و انصاف کی وجہ سے ہمہ جہتی شہرت پیدا کر لی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں سعد زغلول وزیر تعلیمات عامہ بنائے گئے اس منصب پر آپ کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ آپ اس انقلابی روح کو برانگیختہ کریں جسے مصطفیٰ کامل مدرسوں کے طالب علموں میں متواتر بھڑکایا کرتا تھا اور اس نے طلباء کے نفوس میں عظیم الشان تاثیر پیدا کر دی تھی ان میں تیزی کے ساتھ یہ تحریک پھیل گئی اور اس نظام میں شرکت مدارس میں نافرمانی کے امور میں شمار کی گئی سعد زغلول نے اس راہ میں مہتم بالشان جد وجہد صرف کی، جن اصلاحات کو آپ نے داخل کیا ان میں آپ دور اندیش تھے لیکن آپ کو پوری کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن آپ بہ نسبت کسی اور مصری کے وطن پرستوں کے حملوں کا نشانہ ہو جانے میں بیشتر کامیابی حاصل کی۔

اس کے بعد آپ وزارت حقانیہ کے عہدہ پر فائز ہوئے جب سنہ ۱۹۱۳ء میں جمعیۃ تشریعیہ کی تشکیل ہوئی تو سعد زغلول پہلے وکیل تھے جو جمعیۃ کی وکالت کے لئے منتخب کئے گئے،

اس کے بعد سنہ ۱۹۱۸ء سے لے کر جس میں آپ کو اور آپ کے علاوہ دیگر مصری وفد کے اراکین کو برطانوی وزارت خارجیہ کے سامنے مصری مسئلہ اور مصریوں کے مطالبات کو پیش کرنے کے لئے یورپ کی طرف سفر کرنے کی اجازت ملی اور یہاں سے آپ کے

مطالبہ کی ابتدا ہوئی اور آپ کے ۲۴ر اگست ۱۹۲۷ء میں وفات پانے تک جو واقعات پیش آئے ان میں ہمیں گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان حوادث نے آپ کو عزت وشہرت کے بلند درجات تک پہونچا دیا اور آپ کو مصری آزادی کا بطل بنا دیا جس کو مصری قوم دل سے محبت کرنے لگی اور عوام نے سر اور آنکھوں پر بٹھایا اور آپ خاص عام کے نزدیک مشہور ہو گئے یہاں تک کہ آپ سبھوں کے لئے تکیہ کلام بن گئے

اگرچہ ہم نے ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ایک حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے جس کے لئے خاص اہمیت ہے آپ کی زندگی کا ایک دور ہے جس کو بیان کر دینا ضروری ہے، وہ برطانوی اقتدار کے متعلق آپ کے موقف کا مکمل تغیر پذیر ہو جانا ہے آپ اپنی قومی زندگی کے بڑے حصہ میں برطانوی اقتدار کے مخلص دوست تھے برطانوی ارباب نے ادارہ کی اصلاح کے لئے جن تجاویز کا ارادہ کیا آپ نے ان کی اعانت کی اور آپ کو وزارت تعلیمات عامہ کے لئے اس وقت منتخب کیا گیا جبکہ مدارس وطنی ہیجان وتلاطم کا سرچشمہ تھے' آپ کے موقف سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کو آپ پر پورا اعتماد و وثوق حاصل تھا لیکن ۱۹۰۹ء میں مجلس وضع قوانین میں حکومت کے مطالبات خصوصاً نہر سویز کی مدت کے اضافہ کے متعلق جو وطن پرستوں کے جذبات کو مشتعل کرنے اور ان کی قومی مخالفت کو ہیجان میں لانے کا باعث تھی' آپ کی مدافعت ایک سنئے شاہد کی حیثیت سے تھی'

لیکن جس وقت آپ نے برطانویوں کے ساتھ تعاون کرنے کا یہ میلان ظاہر کیا تو در حقیقت بذات خود اس مسلک پر چل رہے تھے جس پر محمد عبدہ چل چکے ہیں اور جو بعد میں آپ کے پیرووں کا ایک بنیادی مقصد ہو گیا۔

لارڈ کرومر نے ۱۹۰۶ء کی اپنی سالانہ رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ سعد زغلول محمد عبدہ کے پیرووں میں ایک ممتاز وسربر آوردہ زعیم تھے' اسی کی طرف اپنی تقریریں

جو مصر سے نکلتے وقت کی تھی اشارہ کیا ہے کہ "میں نے سعد زغلول کے ساتھ صرف تھوڑی مدت تک تعاون کیا لیکن میں نے اس کم عرصہ میں پہچان لیا کہ میں آپ کا کس قدر احترام کرتا ہوں"

رشید رضا کہتے ہیں کہ "پھر سعد زغلول اپنی معیشت میں اور اپنے اجتماعی و قانونی افکار و خیالات میں مغرب زدگی کے دور میں داخل ہو گئے اور آپ کے نزدیک مصری وطنیت کا جذبہ جامعۃ اسلامیہ کے خیال پر غالب آ گیا جس کی طرف المنار دعوت دے رہا تھا آپ یہ کہنے لگے کہ مسلمان صرف دینی اصلاح کے ذریعہ جس کی طرف آپ کے استاد اور آپ کے استاد کے استاد یہ دونوں حکیم دعوت دیتے تھے صحیح معنی میں ترقی کر سکتے ہیں"

اگرچہ چند ایسے عوامل ہیں جو سعد زغلول کے موقف میں اس تبدیلی کے باعث ہوئے لیکن وہ ان حالات کے مقابلہ میں جن سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں زیادہ تر سیاسی اعتبارات سے متصل و وابستہ ہیں کیونکہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جن لوگوں میں آپ اس سے پہلے انگریزوں کی اعانت کرنے میں زیادہ معتدر تھے اب آپ ان کے لئے سخت ترین دشمن بن گئے اور اپنے ملک کی آرزوؤں کی مدافعت کرنے لگے اور اپنے ملک کی آزادی کامل کے مطالبہ میں کسی قسم کی نرمی کے روادار نہیں۔

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے غالباً وہ محمد عبدہ کی تعلیمات کے اثر کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے اور کس طرح ان تعلیمات نے عصر حاضر کے مصری سیاسی زعماء و قائدین میں سب سے بڑے مقتدر قائد و پیشوا کو تیار کرنے میں حصہ لیا۔ یہ وہی زعیم ہے جو سرزمین مصر سے پیدا ہوا اور جس کا گوشت پوست اور خون مصری تھا۔

لیکن مصر پر جو مسلسل حوادث رونما ہوئے اور سیاسی افکار و نظریات میں جو پختگی اور

ترقی کے آثار پیدا ہوئے، ان سبھوں نے مل کر سعد زغلول کے لئے بلحاظ آپ کے وطنی اقتدار کے اور بلحاظ آپ کے علم وفضل کی آراستگی کے کامیاب سیاسی زعماء کے درمیان اولین مقام عطا کیا، قوم کی استعداد وصلاحیت آپ کی پیشوائی وقیادت کو قبول کرنے کے لئے آپ کی کامیابی کا ایک زبردست عنصر ومحرک تھی، اس کے ساتھ ساتھ امت کی قیادت کے لئے آپ میں فطری استعداد وصلاحیت پائی جاتی تھی، رشید رضا فرماتے ہیں "اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ کی استعداد اسی طرح ضائع ہوجاتی جیساکہ آپ کے استاد کی استعداد رائیگاں گئی جو سعد کی استعداد کی بہ نسبت بہت بڑھی ہوئی تھی۔

اجتماعی اصلاح

محمد عبدہ کی تحریروں اور صحیفۂ المنار میں جو جوہری افکار نمایاں ہیں ان میں اہم ترین جوہری عنصر لڑکیوں کی ایسی تعلیم وتربیت تھی جو مردوں کی تعلیم سے کسی طرح کم نہ ہو اور اجتماعی زندگی اور ان عادات کی اصلاح جن سے ممالک اسلامیہ میں عورت کی زندگی دوچار ہورہی ہے، محمد عبدہ اور آپ کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ اسلام بہ اعتبار ایک ایسا دین ہونے کے جو تمام عالم انسانی کے لئے نازل کیا گیا ہے عورت کی تکریم اور اس کے مقام کے اقرار میں جس قدر اس کی خوبیاں اجاگر ہورہی ہیں اس قدر کسی اور چیز میں آشکار نہیں ہیں، چنانچہ اسلام تمام جوہری امور میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو تسلیم کرتا ہے۔

باقی رہا تعدد ازدواج تو باوجودیکہ قرآن نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ چند اجتماعی ضرورتوں کی بنا پر تھا، اس کے ساتھ ساتھ اس نے تعدد ازدواج کے لئے چند شروط مقرر کردیئے ہیں اور اس کا تحفظات سے احاطہ کرلیا ہے کوئی شخص اگر ایک سے

زیادہ بیویاں کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام بیویوں پر توجہ اور انصاف کرنے پر قادر ہو اور عدل و انصاف کے ساتھ ہر ایک کو ان کے حقوق دے سکے

کہا جاتا ہے کہ اس عدل و انصاف کا عملی طور پر ناممکن اور محال ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ ایک بیوی پر اکتفا کرنا ہی اصل ہے اور یہی ازدواجی زندگی میں اعلیٰ مثال ہے،

شریعت نے دوسری چیزیں بھی پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے یہی مراد ہے، مثلاً احکام وراثت میں جب شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کی ایک سے زیادہ بیویاں ہو تو ان تمام کو میراث سے جو حصہ ملے گا وہ صرف ایک بیوی کا حصہ ہوگا

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ جب قرآن کے مقاصد اور اس کے مطالب سے ناآشنا ہو گئے اور ان کے درمیان جہل و نادانی پھیل گئی تو معمولی اسباب کے لئے تعدد ازدواج اور کثرت طلاق کا دور دورہ ہو گیا، اس نے ممالک اسلامیہ میں عورت کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کو بگاڑ دیا،

لہٰذا اب ان حالات کی اصلاح کرنا ضروری ہو گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے لئے تعلیم کے راستے کھول دینا اس کو اس کے اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے تیار کر دینا ہے جو دین اسلامی نے اس کو عطا کیا ہے،

یہی محمد عبدہ کی دعوت و تحریک تھی، لیکن آپ کے نوجوان ساتھیوں اور معتقدین میں سے ایک شخص اس تحریک کی لگاتار مدافعت کرتا رہا، یہ نوجوان قاسم امین بک (۱۸۶۵ - ۱۹۰۸) تھا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء میں اپنی وفات تک یہ محمد عبدہ کے مددگاروں اور آپ کے معتقدین کی بہ نسبت اب تک جوان تھا قاسم امین نے حقوق نسواں کی مدافعت کا ایک ایسا میدان اختیار کیا جس میں اس کی کوششیں نمایاں ہوئیں، اپنے مقالات سے رائے عامہ کو اس حد تک مشتعل کر دیا جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی

۱۸۹۹ء میں اس کی کتاب "آزادی عورت" منظر عام پر آئی پھر اس کے ایک یا دو سال بعد اس کی دوسری کتاب "المرأۃ الجدیدۃ" شائع ہوئی اس میں اس نے اپنی پہلی کتاب کی مدافعت کی اور جس قدر تنقیدیں اس پر کی گئی تھیں ان کی تردید۔

ان دونوں کتابوں کے شائع ہونے کے وقت المنار نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے رائے عام میں ایک ایسا اثر پیدا کر دیا جو کسی جدید کتاب نے پیدا نہ کیا۔

چاروں طرف سے مصنف پر حملے کیے گئے اور اس کی طرف سے لوگوں میں عام بدظنی پھیل گئی، کیونکہ انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ قاسم امین کی تعلیمات اور اس کی دعوت و تحریک جماعت اسلامی کی بنیادوں کو ڈھا رہی ہے، ایک معاصر مضمون نگار نے جریدہ "السیاسۃ" میں بیان کیا ہے کہ اس نے قاسم امین کی کتابوں کا نیز ان کی تردید میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ تیس سے زائد کتابیں اور رسالے اس کے آراء و نظریات پر تنقید یا اس کی ذات پر حملہ کرنے کے لئے لکھے گئے تھے لیکن آج قاسم امین کا نام مصر میں بحیثیت بطل تحریک نسواں کے گونج رہا ہے اسی نے نسوانی تحریک کی تاسیس کی اور اس کی شاندار عمارت کھڑی کی۔

قاسم امین ان معدودے چند اشخاص میں سے ایک تھا جنھوں نے محمد عبدہ کا ساتھ دیا اور آپ کے ساتھ مودت و محبت کا ثبوت پیش کیا، آپ کی وفات کے بعد ان کا رشتہ حیات بھی کوئی زیادہ دراز نہ تھا، قاسم امین دیسی عدالت خفیفہ میں مشیر تھا، علم قانون سے لگاؤ کی وجہ سے جس کو فرانس میں حاصل کیا تھا اخلاق، اجتماع، علم النفس وغیرہ اس قسم کے علوم معاشرت کی بھی تعلیم پائی

المنار کا حکم اس کے بارے میں یہ تھا کہ عملی اشخاص کے مقابلہ میں علمی و فکری اشخاص سے زیادہ قریب تھا اس کے جو دینی و اجتماعی نظریات و افکار تھے وہ حقیقت

کی بہ نسبت وہم وخیال سے زیادہ نزدیک تھے،

لیکن قاسم امین نے اپنے مقصد و مدعا کو حاصل کرنے کے لئے مصائب و مشکلات کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی' اس نے اپنی زندگی کے آخری دو سالوں میں جب کہ یہ اس کمیٹی کا معتمد تھا جو جامعہ مصریہ کی تشکیل کے لئے عمل کرتی تھی جس کا افتتاح ڈسمبر ۱۹۰۸ء میں یعنی اس کی وفات کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہوا تھا جو گاتار جد وجہد خرچ کی اور مسلسل کام کیا اس کو ہم ضرب المثل کے طور پر پیش کر سکتے ہیں'

قاسم امین اپنے ابتدائی دور میں نہ تو تعلیم نسواں کی طرف زیادہ توجہ کرتا تھا اور نہ اصلاح نسائی کا اُسے زیادہ خیال تھا' لیکن جب اس نے فرانسیسی مصنف کے اُن دقیق مشاہدوں کا مطالعہ کیا جو اس نے مصر کی عائلی زندگی اور بالخصوص پردے کے متعلق لکھے تھے تو فرانسیسی زبان ہی میں اس کی تردید میں مضامین لکھے اور پردہ کی بلحاظ اس کے جماعت کے نگران و پاسبان ہونے کے مدافعت کی' اور یورپی زندگی میں جو اختلاط اور انتشار پایا جاتا ہے اُس پر نہایت شدت اور درشتگی کے ساتھ تنقید کی،'

اسی وقت سے اس نے مغربی تصنیفات کا مطالعہ شروع کر دیا جس میں عورت کے جماعت سے تعلق پر بحث کی گئی تھی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے یقین کر لیا کہ ادبی اور مادی دونوں گوشوں میں مصر کی حقیقی ترقی کا انحصار عورت کی ترقی پر موقوف ہے چنانچہ اس نے اپنی کتاب "تحریر المرأة" لکھی اور اپنی اصلاحی دعوت کا رخ ملک کے روشن خیال طبقہ کی طرف پھیر دیا' یہ وہی طبقہ تھا جس کا اعتقاد تھا کہ اب اس کو اصلاح کی ضرورت کا احساس پیدا ہو چکا ہے،

قاسم امین اپنی اس کتاب میں شیخ عبدہ کے اُس بیان کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت کے لئے اسلام میں ایک بلند مقام حاصل ہے اس کی رائے یہ ہے کہ

ممالک اسلامیہ میں عورت جو پست ترین درجہ تک پہنچ گئی ہے اس کا سبب ان اقوام کی موروثی بری عادتیں اور اخلاق ہیں جو اسلام میں داخل ہوئیں ان اخلاق کے دوام و استمرار میں ممالک اسلامیہ میں استبداد پسند حکومتوں کا تسلط سب سے بڑا سبب تھا، جب مردوں پر ظلم و ستم ڈھایا گیا تو وہ اپنے گھروں میں صنف نازک کے حق میں ظالم بن گئے، اس لئے عورت کی ترقی کے لئے تعلیم اولین ضرورتوں میں سے ہے،

قاسم امین نے اس امر سے بحث کی ہے کہ تعلیم و تربیت کا اثر عورت کے فرائض میں کہاں تک ہے اور عورت کا مقام عائلی زندگی میں اور تمام جماعت میں کس حد تک ہے وہ لکھتا ہے کہ مصری قوم نے اپنی نصف تعداد یعنی عورتوں کی جہالت کی وجہ سے بے اندازہ نقصان اٹھایا ہے، یہی وجہ ہے اس قوم نے ایسی زندگی بسر کر دی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ جہنم بھی اس سے زیادہ سخت ہو (ص ۳۲) اس لئے عورت کے افکار و خیالات کی ترقی اور خرافات سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اس کو تعلیم دینے کی سخت ضرورت ہے، اس کو بعض علوم و فنون میں ابتدائی تعلیم دلانا واجب ہے، تاکہ وہ کسی علمی شعبہ میں علیحدہ اور مستقل طور پر اپنے حسب خواہش اپنی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش کرے،

قاسم امین کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاقی و روحانی کشش اور اسی طرح طبعی جسمانی جاذبیت میاں بیوی کے درمیان ازدواجی خوشگوار زندگی کے لئے ضروری ہے لابدی ہے کہ عورت کے ذہنی، فکری اور اخلاقی قوتوں کی تربیت کی جائے تاکہ وہ اپنی گھریلو زندگی کو بہترین بنائے اور اپنے بچوں کی تربیت کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے،

یہ آراء و نظریات مغربی فکر کے مقابلہ میں تکیہ کلام شمار کئے جاتے ہیں نیز عصر

حاضرین مصر کے رہنمایان تعلیم کی بہ نسبت اسی طرح خیال کیے جاتے ہیں، لیکن جس وقت قاسم امین نے ان کی طرف علی الاعلان دعوت دی تو مصر میں رائے عامہ نے اس کو شاذ و نادر آرار اور مانوس رویہ کے خلاف اشتعال انگیز خیالات میں شمار کیا کیونکہ عام طبقہ نے اس وقت تک تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کی تھی یا اس کیطرف مائل ہونے کے لئے وہ تیار نہ تھا

قاسم امین نے پردہ کے خلاف جو مضامین لکھے انھوں نے اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج برپا کرنے پر لوگوں کو آمادہ کر دیا لیکن اس نے فوراً ہی پردہ کو باطل قرار دینے کی دعوت نہ دی بلکہ درحقیقت پردہ کی مدافعت کرتا تھا اور اس کو اُن آداب کا ایک جز شمار کرتا تھا جن کی پابندی واجب ہے لیکن اس کا مطالبہ یہ تھا کہ پردہ شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین کے مطابق ہونا چاہیئے، مگر آجکل لوگ جس پردہ سے روشناس ہیں وہ شریعت کے مقصد و احکام کے مخالف ہے کیونکہ لوگوں نے پردہ کے بارے میں سخت مبالغہ سے کام لینا شروع کر دیا تھا اور سمجھتے تھے کہ پردہ کے احکام اسی قسم کے ہیں،

قاسم امین کا خیال یہ تھا کہ پردہ نہ تو اخلاق کو درست کر سکتا ہے اور نہ ان کی حفاظت کا ذمہ دار و کفیل ہے، بلکہ اس کے برخلاف وہ انسانی نفوس کو یہ اعتقاد رکھنے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ جنسی اختلاط اور میل جول کا مقصد وحید صرف شہوانی اغراض ہیں، اس کی رائے یہ تھی کہ لڑکیوں کی عزلت گزینی درآں حالیکہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں جب کہ ان کو اپنی دیگر سہیلیوں سے ملنا اور ان سے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے ان کے لئے مضر رساں ہے، عورتوں کو گوشۂ خمول میں ڈال دینا اور ان کو آغوش کسل و کاہلی میں چھوڑ دینا ان کے اخلاق و کردار کو بگاڑ دینے کا موجب ہے، لہذا ضروری ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں کو عام سوسائٹی میں میل جول پیدا کرنے کی آزادی کی

اجازت دیجائے تاکہ وہ بھی رفاہ عام کے امور میں شریک ہوں اور قومی کاموں میں دلچسپی لیا کریں۔

قاسم امین نے شادی اور عائلی زندگی پر گفتگو کے دوران میں عورت کو ایسی تعلیم دلانے کی طرف دعوت دی ہے جو اجتماعی عادات و اطوار کے تبدل اور ممالک کے قوانین کی تبدیل کے مناسب و موزوں ہوں تاکہ شادی اور عائلی زندگی کا اندازہ لگانے میں لوگوں کی نظر وسیع اور بلند ہو جائے اور تفکیر، اخلاق انجذاب مادی اور جسمانی جاذبیت میں میاں بیوی کے ذوق و وجدان کی ہم آہنگی کی تحقیق ہو جائے نیز شادی سے قبل عورت اور مرد کے لئے تعارف کی راہیں ہموار کرنا ضروری ہے اور مرد کو جس طرح اپنی شریکۂ حیات کے انتخاب کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی انتخاب کا مساوی حق دیا جائے۔

پھر قاسم امین تعدد ازدواج پر حملہ کرتا ہے کہ اس میں عائلی زندگی کو بگاڑنے والے اسباب پائے جاتے ہیں۔ ایک ہی بیوی کی مدافعت میں شیخ عبدہ کا رویہ اختیار کرتا ہے کیونکہ آپ کی رائے تھی کہ یہی رویہ شادی کے لئے اعلیٰ مثال ہے۔

نیز وہ نظام طلاق میں قوی اصلاح کو ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ مسیحی مذہب لوگوں سے کمال مطلق کا مطالبہ کرتا ہے یہ ایسا کام ہے جس کی نہ تو حکومتوں کو توفیق ہوئی اور نہ کلیسا نے خود اس پر اتفاق کیا، لیکن طلاق مصر میں نہایت آسان اور کثیر الوقوع ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ بعض فقہ کے مذاہب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شوہر کی زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں خواہ اس نے طلاق کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، قاسم امین کی رائے یہ ہے کہ طلاق میں نیت کا تقرر ضروری ہے، وہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جو اس کے احکام کی ترتیب و تنظیم کرے، اس کے بموجب طلاق صرف قاضی کے روبرو اور گواہوں کے

حضور میں ہی واقع ہو سکتی ہے، نیز طلاق سے بیشتر دونوں فریقوں میں مصالحت و موافقت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضروری ہے،

قاسم امین نے اس امر کی دعوت دی ہے کہ عورت کو بھی طلاق کا حق دیا جائے، یہ ایسا امر ہے جس سے بعض فقہ کے مذاہب پوری طرح انکار کرتے ہیں؟

جب قاسم امین کی وفات ہوگئی تو اس کی کتابوں نے غیض و غضب کی جو آگ بھڑکائی تھی وہ برابر باقی رہی، ایک مضمون نگار جس کی رائے جریدہ "السیاسۃ" میں شائع ہوئی جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے کہتا ہے کہ ہم ہمیشہ بعض ان اشخاص کو دیکھ رہے ہیں جو قاسم امین کے آراء و نظریات سے رضامند نہیں ہیں، لیکن جن اشخاص کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت میں راستی پر تھا ان کی تعداد پیہم بڑھ رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قاسم امین کی تعلیمات نے ملک میں ایک فکری انقلاب رونما کر دیا،

ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں کہ:

"گو قاسم امین کو انتقال کئے بیس سال کا عرصہ ہو گیا اگر وہ آج زندہ ہوتا اور اپنی دعوت کے اثرات دیکھتا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ جبری تعلیم زندگی کے مختلف گوشوں میں یہ عظیم الشان تحریک نسواں یہ حریت جس سے عورت بہرہ ور ہو رہی ہے اور شخصی احوال کی تشریح میں یہ اصلاح کس طرح پوری ہوئی ہے اور آئندہ پوری ہونے کی توقع کی جا رہی ہے تو وہ حیران رہ جاتا پھر اس کی یہ حیرت رشک میں تبدیل ہو جاتی یعنی وہ ان اثرات کو دیکھ کر رشک کرنے لگتا پھر اس خوشی کے بعد اپنے دور کی جامد روح کی طرف سے عائد کردہ محافظت کی وجہ سے اس کو اپنی کتابوں میں جو مضامین مجبوراً لکھنے پڑے ان پر افسوس کرتا

پھر ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ:

"قاسم امین کی دونوں کتابوں "تحریر المرأۃ" اور " المرأۃ الجدیدہ" کو پڑھنے والا امین کے اس پروگرام کی شان کا اندازہ لگا سکتا ہے جس نے اس دور والوں کو اس امر کے لئے آمادہ کر دیا ہے کہ وہ قاسم امین کی دعوت کو اس حیثیت سے دیکھیں کہ اس کے ظہور پذیر ہونے کے زمانے سے اس نے اُس دور والوں کے عادات و اطوار کی بنیادیں ہلا دیں آج وہ مروجہ عادات و آرا، کی ایک تصویر سے بڑھ کر نہیں ہے اور وہ اس موضوع میں لکھی جانے والی ہزاروں کتابوں کی ایک کتاب ہے، یہ کتابیں اکثر اوقات اُس کتاب پر سبقت اور فوقیت ا ہیں لے جاتی

اسی طرح قاسم امین کے ادب اور سائنس میں جو آرا، و خیالات تھے وہ اپنے زمانے سے بڑھ چڑھ کر تھے لیکن ہم اس کو تفصیل سے بیان نہیں کریں گے بلکہ ہم صرف یہ اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قاسم امین کا یونیورسٹی کی تشکیل سے ایک مہتم بالشان مقصد تھا وہ یہ کہ ادب اور زبان میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا جائے جیسا کہ اس کی دونوں کتابوں نے تعلیم نسواں اور پردہ میں انقلاب رونما کر دیا تھا،

مصر میں عورت کی اصلاح کے متعلق قاسم امین نے جو دعوت دی اس کو خلاف توقع بہت بڑی مدد پہنچی چنانچہ اس دور میں جب کہ قاسم امین اور اس کی کتابوں کے خلاف غیظ و غضب کے شرارے برابر بھڑک رہے تھے ملک حفنی ناصف (۱۸۸۶ء ۱۹۱۸) اصلاحی میدان میں اتر آئی اور ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے مابین حقوق نسواں کے متعلق لکھنا اور بحث کرنا شروع کر دیا،

ملک حفنی ناصف کی ایک صاحبزادی تھیں جو محمد عبدہ کے پیروؤں اور آپ کے فاضل شاگردوں میں سے تھے ان کی صاحبزادی کی نشو و نما آزاد ترقی پسند افکار و اسالیب میں ہوئی انھوں نے متعدد ابتدائی مدارس میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل

کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں مدرسۂ معلمات میں شرکت کی اور ۱۹۰۰ء میں ابتدائی تعلیم کی ڈگری حاصل کی، یہ پہلا سال تھا جس میں لڑکیوں کو مذکورہ بالا ڈگری کا امتحان دینے کے لئے اقدام کرنے کی اجازت دی گئی، پھر انھوں نے ثانوی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۰۳ء میں ڈپلومہ حاصل کیا اور اس کے بعد حکومت کے مدارس میں لڑکیوں کو تعلیم دینے میں مصروف ہوگئیں

۱۹۰۷ء میں انھوں نے عبدالستار باسل بک سے شادی کرلی، یہ قدیم عربی ذی اثر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ملک نے اس شادی کے بعد اپنا مستعار نام "باحثۃ البادیہ" رکھ لیا، اور ۷ اراکتوبر ۱۹۱۸ء میں وفات پائی، ان کی تعزیت کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کے صدر وزیر معارف تھے، اس میں مصر کے فاضل اور دانشمند اشخاص شریک ہوئے

ان اشخاص میں سے روشن ضمیر طبقہ نے باحثۃ البادیہ کی نہ صرف تعزیت ادا کی بلکہ بعض نگران کار اساتذہ نے بھی اس کے فضائل ومناقب پر روشنی ڈالی، اس کی وفات کے بعد پہلا سالانہ یادگار جلسہ جامعہ مصریہ میں سیدہ ھدی ھانم شعراوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ان دونوں جلسوں میں باحثۃ البادیہ کا ذکر خیر کیا گیا اور اس کی بے انتہا ستائش کی گئی، اس کے جس قدر مناقب اور خوبیاں بیان کی گئیں اس سے پیشتر مصر میں کسی عورت کے متعلق لوگوں نے بیان نہیں کیا تھا؛

باحثۃ البادیہ کے مقالات اور تقریروں کا مجموعہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے ان میں بلا پس وپیش ان اکثر مسائل کو شامل کیا ہے جن کو قاسم امین بک کی کتابوں نے سخت اور تیز بحث وجدل کا موضوع قرار دیا تھا، اس نے اپنے مقالات میں جو مسائل پیش کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

"شادی کا نظریہ اور اس کے بارے میں عورتوں کی شکایت، پردہ یا بے پردگی

ہمارے مدارس اور ہماری نوخیز لڑکیاں، لڑکیوں کی تربیت گھر اور مدرسہ میں، شادی تعدد زوجات، شادی کی عمر، غازہ .... وغیرہ"

اپنے مقالہ "مبادی النساء" میں عورتوں کی غلطیوں اور ان کی ان کمزوری کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے جو خاندان کی بدبختی اور شادی کی ناکام زندگی پر مساعد ہوا کرتے ہیں، پھر مردوں کے عیوب و نقائص پر دوسرے مضامین لکھے اور بعض مقالات میں چند ایسے عوامل و محرکات سے بحث کی ہے جو مرد کو اپنے خاندان میں اس کی خوشگوار تاثیر کو ضائع کر دیتے ہیں، نیز ایک شخص کے لئے دو بہنوں کو شادی کر دینے کی برائیاں ظاہر کی ہیں، غرض اس قسم کے ان خاص مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جو گھریلو زندگی سے متعلق ہیں،

تعلیم نسواں پر مردوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اپنی بعض تقریروں میں ان کی تردید کی ہے اور عورتوں کی مقدرت اور کفایت کو حتیٰ کہ سپہ گری، جنگ اور سیاست کے معاملات میں ان کی دسترس اور مہارت کو جبکہ ان کے لئے اس کے مواقع فراہم کئے جائیں بیان کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ عورتوں کو ان کی فرصت کے اوقات میں تمام مفید کاموں سے دلچسپی اور ان میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے، نیز ان کو وکالت، طب وغیرہ اس قسم کے جائز پیشیوں میں مشق آزمائی کا حق ملنا چاہئے،

اس کی انتہائی آرزو تھی کہ ایک ایسا دستور نافذ کیا جائے جس میں ان معاملات و امور میں اس کے آراء شامل ہوں، وہ حسب ذیل دس نقاط میں ان کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔

(۱) لڑکیوں کی صحیح دینی تعلیم یعنی قرآن اور سنت صحیحہ کی تعلیمات،

(۲) لڑکیوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم دلانا اور ابتدائی تعلیم کو تمام طبقات کے لئے

جبری قرار دینا۔

(۳) لڑکیوں کو گھریلو انتظام کی علمی و عملی تعلیم دینا، قانون صحت، تربیت اطفال اور ضروری طبی علاجات سے روشناس کرانا

(۴) مکمل طور سے طبی تعلیم دلانے کے لئے لڑکیوں کی ایک خاص تعداد فراہم کرنا، اسی طرح فن تعلیم کے لئے ان کو مخصوص کرنا تاکہ وہ مصر میں عورتوں کی ضروریات کو انجام دے سکیں۔

(۵) جو لڑکی مذکورہ بالا علوم کے علاوہ ترقی یافتہ علوم و فنون حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کو مطلق آزادی دینا،

(۶) بچپن ہی سے لڑکیوں کو راست بازی، علمی جد و جہد، صبر و تحمل وغیرہ فضائل و اخلاق کا عادی بنانا

(۷) منگنی کے بارے میں شریعت کے طریقہ کی اتباع کرنا، دونوں شادی نہ کریں گے تاوقتیکہ محرم کے سامنے شادی سے پہلے نہ جمع ہو جائیں۔

(۸) پردہ میں اور گھر سے باہر نکلنے میں ترکوں کی عادت کا اتباع کیا جائے جو آستانہ میں مروّج ہے۔

(۹) وطن کی مصلحت کی نگہداشت اور اجنبی اشیاء سے بے نیازی برتنا۔

(۱۰) نقطۂ دہم کو اس طرح لکھا: ہمارے مرد بھائیوں کا فریضہ ہے کہ اس دستور کو نافذ کریں،

یہ واضح ہے کہ باحثۃ البادیہ قاسم امین کے آراء و افکار سے گہرے طور سے متاثر تھی اور یہ اسی کی اقتدا کرتی تھی اور اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتی تھی حالانکہ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتی ہے کہ وہ قاسم امین کے مسلک کی طرف منسوب نہیں ہے غالباً اس قول سے اس کی یہ مراد ہو گی کہ وہ قاسم امین کے مذہب پر اس حد تک نہیں چلتی تھی جہاں تک وہ چلا ہے

آلنسہ "می" قاسم امین اور باحثۃ البادیہ کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کہتی ہے
کہ "یہ انکار اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے اپنے اس قول میں الفاظ سے کام نہیں
لیا میں یہ کہنے کی جرات نہیں کرتی کہ وہ اس کو نہیں سمجھی" میں یہ کہنے کی کس طرح
جرأت کر سکتی ہوں جبکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ قاسم امین کا موضوع پر بہت گہرا اثر تھا
اس نے اپنے قلم کی اس طرح مردانہ وار جولانی صرف اس لئے دکھائی کہ قاسم امین کے
قلم نے اس کی طرف الہام کیا' اسی نے اس کے لئے نفوس میں راہ پیدا کرنے کیلئے
فراہم کیا اور اس کے افکار میں استعداد و قابلیت پیدا کر دی' اس نے قاسم امین کی طرح
چند معینہ نقاط کا احساس کیا اس کی اصلاح بھی تقریباً وہی ہے جس کا مطالبہ قاسم امین
کیا کرتا تھا........ اس لحاظ سے وہ بہ اعتبار فکر اور جرأت کے قاسم امین کی بیٹی
ہے اور عورتوں کے امور کی اصلاح کی دعوت دینے میں اس کی تلمیذ ہے' ان دونوں
کے مابین اختلافات کے باوجود اس حقیقت کی تردید نہیں کی جا سکتی"

باحثۃ البادیہ قاسم امین کی بہ نسبت سخت محتاط اور نگران کار تھی' آلنسہ "می"
اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ "وہ افکار جدیدہ اور آداب نو آفریدہ کے مختلف شعبوں
کے مابین سخت جانچ پڑتال کیا کرتی تھی' جب کبھی ایک قدم آگے بڑھاتی پیچھے مڑ کر دیکھ
لیا کرتی' تاکہ وہ اس کا ثبوت فراہم کرلے کہ وہ وہی طریقہ اختیار کر رہی ہے جو گذشتہ
و آئندہ کے درمیان رابطہ و تعلق پیدا کرتا ہے' جب کہ کبھی اصطلاحی نصوص میں تبدیلی کرتی
تو امکان بھر مالوفہ عادات کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قالب اعتدال میں اس کو
ڈھالنے کی کوشش کرتی'

لیکن جب کبھی تم اس کی چیخ پکار سنو گے تو بسا اوقات تمہیں خیال پیدا ہو گا
کہ وہ یہ سب اس لئے کر رہی ہے کہ تمہیں سختی کے ساتھ یہ جتلا دے کہ وہ نڈر اور
بے خوف ہے' تمہیں کبھی اسی قسم کا اندازہ کرنا پڑے گا کہ وہ اس لئے چیخ رہی ہے

کہ تمھیں ایک انسانی آواز سنا دے خواہ اس کی آواز اپنی وحدت فکریہ میں ہیبت و رعب سے دور ہو، لیکن قاسم امین نہ تو چیختا، نہ خائف ہوتا اور نہ مرتعش ہوتا تھا"

باحثۃ البادیہ نے ابطال حجاب پر جہاں گفتگو کی ہے وہاں اس کی جانچ پڑتال اور نگہداشت اپنی انتہائی شکل وصورت میں اجاگر ہوتی ہے کیونکہ قاسم امین نے فوراً ہی پردہ کو چھوڑ دینے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ وہ بھی باحثۃ البادیہ کی طرح یہ خیال کرتا تھا کہ ایک عرصۂ دراز گزرنے کی ضرورت ہے جس میں لڑکیاں اپنا پردہ چھوڑنے سے پہلے تعلیم پائیں لیکن وہ دونوں جنسوں کے درمیان باہمی میل جول کی مطلق آزادی کی طرف اس وقت کے مروجہ افکار وعادات کی اجازت سے بڑھ کر دعوت دیا کرتا تھا، مگر باحثۃ البادیہ ابطال حجاب کے موافق نہ تھی اس کا یہ اختلاف دینی محرکات یا اقتصادی عوامل پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کا نظریہ اجتماعی اسباب کی وجہ سے تھا اس کا خیال تھا کہ پردہ کے ابطال سے دونوں جنسوں کے درمیان بہت زیادہ میل جول کی آزادی لازم آتی ہے اس کی رائے میں یہ نہایت ہی نامرغوب فعل ہے۔

باحثۃ البادیہ کہتی ہے کہ "جب ہم سوسائٹی کے مختلف طبقات کو جاتے ہیں اور ہر طبقہ کی عورتوں کے ان کے مردوں کے ساتھ اختلاط کے درجہ کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں پورے طور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جو عورتیں زیادہ میل جول رکھتی ہیں وہی زیادہ تر فساد وضرر کا موجب بنتی ہیں"

قاسم امین اور باحثۃ البادیہ دونوں اس امر کے قائل ہیں کہ شادی کے قبل مرد اور عورت کے درمیان تعارف ضروری ہے لیکن قاسم امین کا جہاں یہ نظریہ تھا کہ اختلاط کے آزادانہ مواقع دیئے جائیں تاکہ تعارف طبعی ہو، وہاں باحثۃ البادیہ کی رائے یہ تھی کہ دو یا تین ملاقاتیں اس امر کے لئے کافی ہیں کہ ایک دوسرے کے اخلاق سے واقف ہو جائیں اور ہر ایک یہ محسوس کرے کہ ایک دوسرے میں کشش وجاذبیت ہے یا نہیں۔

نیز زوج اور زوجہ کے دونوں خاندان کی بابت سوال کرنے سے دونوں کے باقی حالات سے واقفیت ہو سکے،

۱۹۱۱ء میں باحثۃ البادیہ نے موتمر مصری کے روبرو عورتوں کے مطالبات پیش کیے، جو دس نقاط پر مشتمل تھے جن کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، اس نے عورتوں کو مسجدوں میں جا کر عبادت کرنے اور لڑکوں اور لڑکیوں کی جبری تعلیم دلانے کا مطالبہ کیا، مردوں کے لئے فنی مدارس میں تعلیم کے جو مواقع دیے جاتے ہیں کو عورتوں کے لئے بھی یہ مواقع فراہم کرنے پر زور دیا۔ نیز شادی اور طلاق کے معاملات میں اور ان کے علاوہ دیگر مسائل میں اصلاح کا مطالبہ کیا،

یہ مطالبات اُس وقت رد کر دیے گئے[1] لیکن باحثۃ البادیہ نے اس راہ میں

---

[1] باحثۃ البادیہ نے موتمر مصری کے سامنے متعدد مطالبات پیش کیے دوسروں کے ساتھ دیگر مطالبات میں شرکت کی مثلاً ملکی معارف کے ادارہ کی تشکیل کرنا جس میں مختلف ملکی مدارس شامل ہوں، اور جہاں ملک کی ضروریات کے مطابق مکمل تعلیم دی جائے، ابتدائی تعلیم کو جبری کرنا اور لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم مفت دلانا، اور صنعتی و زراعتی علمی تعلیم کی نشر و اشاعت کو ضروری قرار دینا نرسوں کے مدرسہ کے دائرہ کی توسیع، مردوں کے مطابق عورتوں کو طبی تعلیم دینا عورت کو امور خانہ داری، تربیت اطفال کی تفصیلی تعلیم دلانا اور اس کے لئے ایک مدرسہ کی تشکیل، بدعتوں اور برے رسوم و رواجات کو دور کرنا مثلاً برے اذکار، ماتم و خوشی کی محفلوں میں اسراف، جنازوں کے پیچھے عورتوں کا چلنا، مقبروں میں رات گذارنا قبروں کی پختگی میں بے جا اسراف کرنا وغیرہ کی روک تھام، رفاہ عام کے لئے ہر صوبہ کے مرکز میں دواخانے اور عطار خانے قائم کرنا اور زرعی انجمنوں کی امداد کرنا اور ان کو عام کرنا، ان مطالبات پر موتمر نے بالاجماع اتفاق کیا اور ان کو لجنۂ منتقدیہ میں پیش کر دیا لیکن باحثۂ بادیہ نے دیگر مطالبات سے انکار کر دیا مثلاً عورتوں کو مسجدوں میں وعظ سننے اور

ہر قسم کی مدافعت جاری رکھی اور اصلاح کے لئے پیہم بحث و مجادلہ میں معروف رہی حالانکہ اپنی وفات سے چند دن پیشتر اس کے قلم کا زور ٹوٹ چکا تھا کیونکہ وہ بقول خود کسی چیز کے بار آور ہونے کے امکان سے مایوس ہو گئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ کون سا راستہ اختیار کرے'

لامحالہ ہمارے مذکورہ بیانات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مصریں اس دور سے پیشتر عورت کی تعلیم کی راہ میں کچھ بھی کام نہیں کیا گیا' اس لئے کہ مثلاً لڑکیوں کی تعلیم مصر میں اُس وقت کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ ۱۸۲۹ء میں یعنی قاسم امین اور باحثۃ البادیہ سے بہت زمانہ پیشتر امریکی وفود کے آنے سے مصر میں لڑکیوں کے پہلے مدرسہ کی تشکیل عمل میں آ گئی تھی۔

۱۸۷۳ء میں خدیوی اسماعیل باشا نے تعلیم البنات کے لئے پہلا سرکاری مدرسہ قائم کیا۔ لیکن عورت کے حقوق کا بالکلیہ اعتراف محض عرصہ دراز کی پختگی اور جدوجہد کا نتیجہ ہے اس راہ میں قاسم امین اور باحثۃ البادیہ نے کام کیا اور ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص طریقہ اختیار کیا'

آلنسہ می" کہتی ہے کہ" اس اثر کا تعین نہایت دشوار ہے لیکن ہم اس امر کا تصور نہیں کر سکتے کہ اگر یہ دونوں نہ پیدا ہوتے اور کتابیں نہ لکھتے تو حالت کیا ہو جاتی اس میں کوئی شک نہیں کہ مصر میں موجودہ نسائی تحریک جو قاسم امین کے فضل کا اعتراف کرتی اور اس کی قیادت کو تسلیم کرتی ہے محض اس کی دعوت کا اثر اور اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے' چنانچہ مصر میں آجکل عورتوں کی تین متحدہ انجمنیں ہیں

بقیہ ص ۳۹۵) اور انہیں نمازیں پڑھنے کی آزادی دینا جیسا کہ ترکی مسیحی اور یہودی عورتوں کو آزادی حاصل ہے۔ اور حکومت کے نزدیک بلا ضرورت تعدد زوجات کو رد کرنے کی کوشش کرنا وغیرہ (دیکھو موتمر مصری کی کارگزاریوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۱۱ء ص ۱۸۰ ـــــ ۱۸۵) معرب

ان میں سے ہر ایک کا ایک رسالہ ہے، اتحاد لنسائی مصری نے جس کی تشکیل ۲۶ مارچ ۱۹۲۳ء میں سیدہ ھدی ہانم شعراوی کی زیر صدارت ہوئی، اجتماعی، سیاسی اور تعلیمی اصلاحات کے لئے ایک پروگرام نشر کیا ہے جس میں مرد اور عورت کی مساوات، قوانین شادی کی اصلاح، سولہ سال تک لڑکی کی شادی کی عمر کا تعین، صحت عامہ کی طرف توجہ اور تربیت اطفال کی نگہداشت وغیرہ کا مطالبہ کیا گیا تھا،

علمبرداران دین

محمد عبدہ کی دعوت و تحریک جن اصول پر قائم ہے ان میں اہم ترین اصول یہ تھا کہ حقیقی اسلام یا بالفاظ دیگر اسلام اس کی اصلاح کے بعد تمام وجوہ سے بہترین دین ہے اور بہ نسبت اور ادیان و مذاہب کے اس کے اندر عصر حاضر کے ساتھ موافقت کی زیادہ صلاحیت واستعداد پائی جاتی ہے، اس اولین قضیہ کا نتیجہ یہ تھا کہ محمد عبدہ کے ساتھیوں نے تمام موز و نیت کے ساتھ اسلام کی صلاحیت کے اظہار پر کام کرنا شروع کر دیا اس میں انھوں نے اچھوتے پن اور جدت کے لئے پوری مقدرت و کفایت کا اظہار کیا، انھوں نے قرآنی نصوص اور اس کے علاوہ دیگر اسلامی اساسی مصادر کے درمیان اور عصر حاضر کے اکثر و بیشتر ترقی پذیر علمی آرا اور نظریات کے مابین موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے میں کوئی دقت و دشواری نہ پائی،

سب سے پہلے انھوں نے دفاعی کوششوں کے التزام پر اکتفا کیا لیکن انھوں نے اس کے بعد اپنے میدان کا رخ یعنی جہادی کی طرف پھیر دیا، چنانچہ انھوں نے جدید علمی تنقیدی وسائل کو جو یورپ و امریکہ میں رائج تھے استعمال کیا، مغربی علم و حکمت کے تاریخ اور مغربی مصنفین کی کتابوں سے جو مسیحی اصول اور مسیحی عقائد و نظریات کے لئے ملحدوں اور عقلیت پرستوں کے حملوں پر مشتمل تھیں استفادہ کیا،

ہم نے گذشتہ محمد عبدہ اور رشید رضا کی تحریروں کے بعض نمونے جو مجلہ المنار میں لکھے گئے تھے بیان کر دیا ہے اب ہمارے لئے ضروری ہوگیا کہ یہاں ایک ایسے شخص کا ذکر کریں جو لوگوں میں سب سے زیادہ اس میدان میں ۱۹۲۰ء میں اپنی وفات تک سرگرم کارکن رہا یہ شخص ڈاکٹر محمد توفیق صدقی (۱۸۸۱ء – ۱۹۲۰ء) تھے جو قیدخانہ "طرہ" میں جو قلعہ سے قریب ہے طبیب تھے جس وقت ڈاکٹر صدقی طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی وقت سے انھوں نے اپنا خاص مطالعہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے انھوں نے مذہبی مدافعت کے بارے میں مضامین اور کتابیں لکھنے پر بہت بڑی توجہ صرف کی۔

مسیحی مبلغین نے دین اسلام کے بارے میں بحث وجدل کی حیثیت سے جو کچھ لکھا تھا اس کو یہ پڑھتے تھے چنانچہ ان کے دل میں بہت سے شکوک وشبہات پیدا ہوگئے، پھر المنار کا مطالعہ کیا تو خاص مطالعہ کی طرف توجہ کی جس میں ان کو ان شبہات سے چھٹکارا پانے کے لئے امید کی بجلی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، اس نے ان کو رشید رضا کی زیر ہدایت ونگرانی ایک خاص قسم کے درس و مطالعہ پر اقدام کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا انجام کار وہ تسلیم ورضا کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ گئے جس کی دین اسلام میں کوئی نظیر نہیں ملتی جیسا کہ محمد عبدہ نے ان کی تصویر کھینچی ہے۔

ڈاکٹر صدقی اس دین کے متعلق اپنے عقیدہ کی اس طرح توصیف کرتے ہیں:

"یہی وہ دین اسلام ہے جو برہان عقلی پر قائم ہے اور جو انفرادی واجتماعی اصلاح، استقامت اور اطاعت سے ترکیب پذیر ہے"

اس مطالعہ کے نتائج مقالات کے سلسلہ میں ظاہر ہوئے جس کو المنار نے "الدین فی نظر العقل الصحیح" کے عنوان سے نشر کیا، پھر اس کے بعد یہ مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہوگئے۔

رشید رضا کہتے ہیں کہ دین، نبوت اور قرآن کے بارے میں ڈاکٹر صدقی کے آراء و افکار محمد عبدہ کی کتابوں کا مظہر ہیں، باقی رہا اسلامی کتابوں اور عربی تصنیفات میں آپ نے جو مطالعہ کیا تو وہ رشید رضا کی ہدایت میں تھا، توفیق صدقی کے مقالات میں اسلام باعتبار آخری اور مکمل دین کے جلوہ گر نظر آتا ہے،

"آسمان اور قرآن" سے متعلق جو مقالہ انھوں نے لکھا ہے اس سے ان کے ایک خاص مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، اس میں انھوں نے وصفی علم الفلک پر بحث کی ہے زمین، ستاروں اور ان کے محوروں، ثابت و سیار ستاروں وغیرہ کو تعلیمی شکل و صورت میں پیش کیا ہے جو پڑھنے والے کے لئے فائدہ مند ہیں وہ اپنے مقالہ میں استدلال کرتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات علم جدید کے موجودہ نتائج کے ساتھ متفق ہیں قرآن میں وارد ہوا ہے کہ ستاروں کے چند گروہ ایسے ہیں جن کے درمیان قوت کشش و جاذبیت کا ربط پایا جاتا ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جس کے اہل یورپ مدعی ہیں کہ انھوں نے اس کا اکتشاف کیا ہے حالانکہ قرآن اس اکتشاف میں ان سے کئی سو سال سبقت لے جا چکا ہے یہ قرآن مجید کا ایک کھلا اور روشن معجزہ ہے

ڈاکٹر صدقی کہتے ہیں کہ عالم کے اختتام کے وقت وہ قوت کشش و جاذبیت مسترخی ہو جاتی ہے جو افلاک کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے اور ستارے منتشر و پراگندہ ہو جائیں گے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ ۸۲ آیۃ ۱ اور سورۃ ۸۴ آیۃ ۱ میں وارد ہوا ہے

ڈاکٹر صدقی کا نظریہ یہ ہے کہ ہفت افلاک جن کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے وہ سات آسمان ہیں، کیونکہ سما لغت میں ہر وہ چیز ہے جو انسان کے اوپر بلند ہے یا اس کے سر سے اونچی ہے آسمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تہ بر تہ طبقات ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا محور دوسرے محور پر ہے،

چونکہ ہمارا نظام شمسی ایک معین فلک کے ارد گرد گھومتا ہے جس کی حقیقت

کو ہم تحقیقی طور پر نہیں پہچان سکتے اس لئے یہ واضح ہے کہ دوسرے افلاک بھی ثابت ستاروں کے اطراف گھومتے ہیں۔ یہ لعید از قیاس نہیں کہ یہ تمام افلاک ایک مرکز کے اطراف جو نسبتہً تمام میں مشترک ہے گھومیں اور تمام کو اپنے اندر جذب کریں اور اس کے نظام کو برقرار رہیں، یہ مرکز عرش یا آسمانوں اور زمین کی کرسی ہے،

ڈاکٹر صدقی کا یہ نظریہ ہے کہ غالباً یہ مرکز جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے "عرش الہٰی" ہے اس کو وہ خاص قوتیں جو اس میں اللہ نے ودلعیت کر رکھی ہیں اپنی جگہ ثابت و برقرار کئے ہوئے ہیں ہم ان کی طبیعت و مزاج سے ناواقف ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کہتا ہے کہ "وہ آٹھ فرشتے ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں" (سورۃ ۵۹ آیہ ۱۵)۔

اسی طرح ہم ڈاکٹر صدقی کے مقالہ میں بہت سی ایسی چیزیں پاتے ہیں جن کو قرآنی آیات اور موجودہ علمی و طبی مسائل کے مابین توافق و تطابق پیدا کرنے کے لئے اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اوپر جس قدر ذکر کیا گیا ہے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے،

ڈاکٹر صدقی نے اپنے قلم کی ایک اور میدان میں جولانی دکھائی ہے یہ میدان مسیحیت کے خلاف جدل و مباحثہ کا ہے، ان کے بہت سے مقالات مجلۃ المنار کی چودھویں اور سولھویں دونوں جلدوں میں شائع ہوئے پھر بعد میں ان میں سے بعض مقالات مستقل طبع ہوئے، ان میں سے بعض اس قدر تلخناک اور ہیجان خیز تھے کہ بقول المنار انھوں نے مبلغین کی سوسائیٹوں کو مشتعل کر دیا انھوں نے ارباب اقتدار کے روبرو صدائے احتجاج بلند کی، ڈاکٹر صدقی کو اس قسم کے مقالات لکھنے سے ممنوع قرار دیا گیا، اس کے بعد المنار نے اعلان کیا کہ عنقریب ان کے مقالات میں صلح کن روش اختیار کی جائے گی۔

ڈاکٹر صدقی نے اپنے ایک مقالہ میں "صلیب وکفارہ" کے عقیدہ پر بحث کی ہے جس میں وہ اسلامی رائے کو تسلیم کرتے ہیں جو یہ ہے کہ یہوذا اسخر یوطی کو حضرت مسیح کے بدل سولی دی گئی۔

ڈاکٹر صدقی اس رائے کی تائید میں برنابا کی طرف منسوب انجیل کی عبارتوں اور سرنتین اور بوکراتین جیسے بعض اولین مسیحی فرقوں کے اقوال سے کرتے ہیں نیز انھوں نے اناجیل کے دلائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صدقی نے ایک اور کتاب لکھی اور اس کا نام "نظرات فی کتب العہد الجدید والعقائد النصرانیہ" رکھا اس میں اسفار عہد جدید کے اقتباسات اور ان سے پیدا شدہ نتائج واستدلات اور ان کے خارجی شواہد کے ذریعہ شرح وبسط کے ساتھ بحث وتنقید کی ہے

وہ اسی طرح انجیل یوحنا اور دوسرے تینوں اناجیل کے درمیان جو اختلافات موجود ہیں ان پر بیشتر تعلیقات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پولس نے جس کے اور اس کے علاوہ دیگر حواریوں کے درمیان عداوت تھی اسفار عہد جدید کو جو وضع کیا ہے ان کا اکثر وبیشتر حصہ اور اس کے اکثر بیانات تناقض اور مبالغہ آمیزیوں پر مشتمل ہیں پولس خود مدہوشانہ دوروں میں مبتلا تھا جب یہ صحیح ہے تو وہ ایسے افسانہ و داستان کی تفسیر کرتا ہے جس میں اس کی عیسائیت کی تخیل اور اپنے خوابوں کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صدقی کی اس کتاب میں اسفار عہد جدید کے خلاف بیشمار اعتراضات ہیں جن کو فقہی بنیادوں پر قائم کیا ہے ان میں سے بعض ایسی عبارات ہیں جو انجیل میں وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کا علم محدود ہے ان سے ڈاکٹر صدقی حضرت مسیح کی الوہیت کی نفی میں استدلال واستناد کرتے ہیں ـــــــ اس کے علاوہ حضرت مسیح کی شخصیت بذات خود ان بیشمار آراء ونظریات کو تسلیم نہیں کرتی جن کی مثالی

تصویر ان انجیلوں میں پیش کی گئی ہے؛

نیز ڈاکٹر صدقی نے ذکر کیا ہے کہ نصوص میں بہت سی تحریفات ہیں مثلاً وقت کی تحدید میں جس میں سولی کا واقعہ پیش کیا اختلاف ہے اس کے بعد صاحب موصوف اسی اسلوب پر بحث کرتے ہوئے دلیل کے ساتھ یہ ثابت کرتے ہیں کہ عیسائیت کا حضرت مسیح کے بارے میں سولی پر لٹکائے جانے کا عقیدہ غلط ہے اس کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتی، انجیل کے وہ نصوص جن پر اس عقیدہ کا دار و مدار ہے ان میں تحریفات و شکوک ہیں؛

باقی رہ گئے محمد فرید وجدی (۱۸۷۵) تو وہ محمد عبدہ کے پیروؤں میں سے ایک ہیں جنھوں نے دینی تائید اور دینی مدافعت میں بیشتر کتابیں اور مضامین لکھے اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اجتماعی دراسات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ابھی اسی مجلۃ الہلال نے جو عربی ادبی پرچوں میں بلند پایہ ہے ذکر کیا ہے کہ فرید وجدی نے تقریباً مسلسل تیس سال درس و مطالعہ جاری رکھا ہے آگے چل کر کہتا ہے کہ غالباً فرید وجدی مصری زندگی کے اجتماعی پہلو کو پہچاننے میں فرد یگانہ ہیں؛

انھوں نے نصرت دین اور اس کی مدافعت میں جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اہم کتاب وہ ہے جو ۱۸۹۹ء میں لکھی جو "المدینۃ و الاسلام" کے نام سے مشہور ہے۔

رشید رضا نے اس کتاب کی بہت ہی تعریف کی ہے آپ لکھتے ہیں کہ دینی تعلیمات کو جدید سانچے میں ڈھالنے میں سوائے محمد عبدہ کے رسالہ توحید کے کوئی کتاب "المدینۃ والاسلام" کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور نہ اس موضوع میں بجز اس کے کوئی کتاب اس سے پہلے لکھی گئی، نیز رشید رضا بعض ان مسائل کو بیان کرتے ہیں جن میں فرید وجدی نے محمد عبدہ کا طریقہ نہ صرف آپ کے اسلوب میں اختیار کیا بلکہ انھوں نے ان موضوعات پر بھی

وہی طریقہ اختیار کیا جس پر محمد عبدہ نے خامہ فرسائی کی تھی

ڈاکٹر محی الدین نے ترکی میں تاریخ تجدید کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں ذکر کیا ہے کہ فرید وجدی ان مصریوں میں سے ایک ہیں جو ترکی اصلاح کے درمیان اور دینی تحریک و نہضت کے مابین جس کو محمد عبدہ نے مصر میں زندہ کیا قوی ربط وصلہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرید وجدی محتاط پہلو کی طرف مائل نظر آتے ہیں، اس کا اظہار اس کتاب میں ہوتا ہے جو قاسم امین کی کتاب المرأۃ الجدیدہ کے رد میں لکھی،

فرید وجدی نے بلا اعانت دشرکت غیرے بیسویں صدی کا دائرۃ المعارف لکھا اور اس کے دس جزء شائع کئے اور بہت سی ایسی کتابیں لکھیں جو بعض علمی و فلسفیانہ پہلوؤں کا حل پیش کرتی ہیں،

۱۹۲۱ء میں وجدیات کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں بہت سے دلی مقالات پرندوں وغیرہ کی زبانی مکالمات کی شکل میں شامل ہوا کرتے تھے اس میں دوسرے مقالات بھی شائع ہوتے تھے، جو دینی، علمی اور فلسفیانہ مباحث و موضوعات پر مشتمل تھے، جن کا طرز بیان سادہ سلیس اور پڑھنے والوں کے لئے سہل تھا، اس رسالہ کے صرف ۷ اعدد ہی نکل سکے اور اس کا آخری نمبر ۱۵ اپریل ۱۹۲۲ء میں نکلا۔

فرید وجدی نے دفاع دین میں جو کتاب المدنیۃ والاسلام لکھی ہے سب سے پہلے اس کو فرانسیسی میں تصنیف کیا پھر عربی میں منتقل کیا، اس کے ذریعہ انھوں نے یورپیوں کو دین اسلام کی حقیقت و ماہیت سے روشناس کرنا چاہا، نیز انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام انسان کو سعادت دارین حاصل کرنے کا ضامن اور اس کی دینوی و اخروی زندگی کی راحت کا کفیل ہے، اسلام اس لحاظ سے ضروری ہے کہ

اہل مغرب اپنے نشاط عمل اور جدوجہد سے عالم اسلامی کے اکثر و بیشتر حصوں پر
قابض ہو گئے ہیں لیکن اب تک وہ اسلامی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کے
بعض مصنفین کی ہذیان سرائیوں کی وجہ سے اسلام کے مخالف اعتقاد رکھتے ہیں کیونکہ
وہ اپنے محکوموں کے دین کو محض عبث اور اپنی عقول کے لئے بوجھل اور ان کے
تدارک کے لئے تنگ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کا اقرار محض اپنے عواطف و
جذبات کے احترام کی وجہ سے کرتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ علوم عصریہ اور معارف
طبیعیہ مستقبل میں شائستہ و مہذب ہو جائیں گے" (المدینۃ والاسلام ص ۶)

آگے کہتے ہیں کہ " اہل یورپ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو الزامات و اتہامات
عائد کئے گئے ہیں ان کو سچ سمجھنے میں معذور ہیں جب تک ان کے روبرو وہ رسوم اور بدعتیں
جن کو کم عقلوں نے ایجاد کر رکھا اور جن کو عوام نے قبول کر لیا ہے، اور ان پر اوہام
باطل اور گمراہ کن شکلوں کا اضافہ کر دیا ہے جن سے انسانی طبیعتیں دور بھاگتی اور
جو اصول مدنیت کے سراسر منافی ہیں، دین کے مظاہر میں سے نظر آ رہی ہیں تو ان کو حق
حاصل ہے کہ وہ ان کے خلاف عمل کریں ہم کیونکر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اہل یورپ
ہمارے دین کی حقیقت سے روشناس ہوں اور اس کو تمام سعادتوں کے لئے ایک
واحد وسیلہ سمجھیں درآنحالیکہ وہ دین اسلام میں سے صرف یہ ظاہری رسمیں اپنی آنکھوں
سے روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً سڑکوں پر ڈھول اور طبلوں کے پیچھے اور جھنڈوں
کے نیچے چیخ پکار، میلادوں میں جو اکثر و بیشتر مصری علاقوں میں منعقد کئے جاتے ہیں ادب
اور عقل کے منافی منکرات کا مظاہرہ، ہزاروں راستہ چلنے والوں کے سامنے بڑے بڑے
جلوس اور حلقہ بندیاں اور ذکر و اذکار میں شدید شور و غل وغیرہ اس قسم کے اور بیشمار
خرافات ہیں جن کو اگر ہم ذکر کریں تو گفتگو طویل ہو جائے گی اور ہم اپنے موضوع سے ہٹ
جائیں گے، اس حالت میں کیا ہم ان اشخاص کی تردید کر سکتے ہیں جو ہمارے دین کے

متعلق نکتہ چینیاں کرتے یا اسلام پر فحش الزامات عائد کرتے ہیں؟

جب تک یہ منکرات اور خرافات جاری رہیں گے اور اس قوم کا عقلمند طبقہ ان سے دور ہی رہے گا اور اپنے اندر اس سیلاب عظیم کو روکنے کا میلان نہ پائے گا جو نہ صرف ہمارے عوام کو منکرات اور گناہوں کے ارتکاب پر آمادہ کیے ہوئے ہے بلکہ خالص عقیدۂ توحید سے بھی خالی کر گیا ہے کیا اسلام کے متعلق اہل یورپ اپنی اس بدظنی میں معذور نہیں ہیں؟ (ص ۶)

فرید وجدی کے اس کتاب سے دو مقصد ہیں ایک اصلاح کی دعوت دوسرا حقیقی اسلام کی طرف سے مدافعت،

ہم اس کتاب کی روح کو اس کی عبارت سے جو جابجا اس کے اندر آئی ہے سمجھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ "انسانی ترقی اور بنا عمران کی تحسین میں جو بھی مبنی بہ تجربات اصول اور مشاعر و احساسات کے مشاہدوں پر قائم شدہ نظریہ اثر انداز ہوا ہے وہ محض یا تو قرآنی آیت کی آواز کا نتیجہ یا کسی حدیث نبوی کی پکار ہے یہاں تک کہ دیکھنے والے کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کرۂ زمین کے علماء کی طرف سے انسانیت کی شان کو بلند و بالا کرنے کے لئے جو نشاط و جد و جہد کی جا رہی ہے اس کا مقصد و منتہا صرف یہ ہے کہ دیانت اسلامیہ کی صحیح بنیادوں پر تجرباتی دلائل قائم کیے جائیں" (ص ۳۰)

اس طریقے سے فرید وجدی نے یہاں ایک خاص قسم کی بحث کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ انھوں نے غیبی و روحانی مباحث پر قلم اٹھایا مادی فلسفہ کی تردید کو اپنے رسالہ وجدیات میں خاص اہمیت دیتے ہیں اور روحانی مباحث اور غیبی تجربات و مشاہدات کے موجودہ نتائج کی بنا پر خلود روح پر استدلال کرتے ہیں رسالہ وجدیات میں کامیل فلاماریون کے مقالہ "موت اور اس کے اسرار" کے عنوان، کا ترجمہ بھی شامل ہے

ح

..یا استدلال کیا ہے کہ اسلام میں خلاصی انسانی نظامات میں اک بلند پایہ نظام یعنی (ص ۸، ۱۱ وغیرہ)

اور مختلف ملل و مذاہب والوں سے اسلام نے جو معاملہ کیا وہ دیگر ادیان کے مقابلہ میں رواداری کا عظیم الشان

اس سے غرض بقول فرید وجدی کے حیات بعد الممات پر دلیل و حجت قائم کرنا ہے نیز یہ اُن روحانی و غیبی آراء و نظریات کو اپنے دائرۃ المعارف میں پیش کرتے ہیں، چنانچہ جہاں انھوں نے جنات پر گفتگو کی ہے وہاں ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہت سے شیوخ نے جن کے صدق روایت میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جاتا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے جن کو دیکھا ہے اور ان سے گفتگو کی ہے، یہ ایسا امر ہے جو نہ تو عقل کے منافی ہے اور نہ قوانین مخلوقات کے معارض، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ بعض ارواح کو مادہ کا لباس پہنائے ہوئے پیدا کرے اور بعض ارواح کو مادہ سے بری و معرا، کیا کوئی اس قسم کے اعتقاد پر اعتراض کر سکتا ہے جب کہ یورپ میں یہ حقیقت واضح و آشکار ہو گئی کہ یہاں ارواح مادہ سے مجرد و معرا ہو کر ظاہر ہوئیں اور احضار ارواح کے جلسوں میں لوگوں سے گفتگو کی،

ایک اور مصنف کی شخصیت کو ہمیں فراموش نہ کرنا چاہئے، جس نے دین کی نصرت اور مدافعت میں بیشمار کتابیں لکھی ہیں، ہم اس بارے میں پروفیسر رحمان کی رائے پر اعتماد کرتے ہیں جس کا بیان ہے کہ آپ محمد عبدہ کے پیرووں میں سے ہیں،

یہ مصنف شیخ طنطاوی جوہری سے مشہور ہیں جو مدرسہ دار العلوم میں عربی ادب کے استاد تھے، ڈاکٹر ارشمان نے آپ کی تین کتابوں کا تجزیہ کیا ہے جن میں سے ایک کا نام ہے "التاج المرصع بجواھر القرآن و العلوم"

یہ کتاب پچیس باب یا جوہر پر منقسم ہے، مصنف نے اس میں قرآن کی آیتیں کو اُن کے موضوعات کے موافق چھ ابواب میں لکھنا چاہا، آپ کی غرض و غایت اس سے اسلامی عقائد کے اصول کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

آپ کی دوسری کتاب "جمال العالم" ہے اس کتاب کا بیشتر حصہ جیسا کہ اس کے عنوان سے پتہ چلتا ہے، حیوان، پرند، کیڑے، مکوڑوں وغیرہ طبعی مطالعات کے سلسلہ سے عبارت ہے، اس کے علاوہ اس میں علمی یا دینی رنگ کے دوسرے دراسات بھی پائے جاتے ہیں۔

آپ کی تیسری کتاب کا نام "النظام والعالم" ہے، یہ تینوں کتابیں اور خصوصاً آپ کی دوسری کتاب اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ ان میں فطرت سے غیر مخفی محبت اور دلبستگی پائی جاتی ہے، ان میں ہم انگریزی مصنف 'جان لاک' کا اثر پاتے ہیں جو نیچر کی محبت میں مشہور ہے، اس کا سب سے زیادہ اثر علامہ طنطاوی کی اُن تحریروں میں نمایاں ہے جو آپ نے زندگی کی لذت آفرینی جمال فطرت اور عجائب کائنات کے متعلق لکھا ہے،

شیخ طنطاوی نے اپنی پہلی کتاب اسلامی دفاع اور دیگر قوموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت میں لکھی، جاپان آپ کی نگاہوں کا مرکز اور تمناؤں کی جولانگاہ تھا، چنانچہ اپنی یہ کتاب میکادو کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی اور ۱۹۰۶ء میں جاپانی موتمر ادیان کے روبرو پیش کی، آپ کے دوست محمود بک سالم نے اس کتاب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے لئے آپ کی اعانت کی تاکہ ترکی، ایران اور روس میں اس کی نشر و اشاعت میں آسانی ہو،

یہ کتاب ایک حد تک مولف کے سوانح حیات پر روشنی ڈالتی ہے، اس میں ازہر میں آپ کے درس و مطالعہ اور ایک طرف یونانی فلسفہ اور جدید علم کے درمیان اور دوسری طرف قرآن کے مابین موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے آپ نے جو کوششیں کی ہیں ان کا بیان پایا جاتا ہے، اس کتاب سے ہمیں پتہ چلے گا کہ غزالی کی تعلیمات اس کتاب کے مصنف پر گہرے طور پر اثرانداز ہوئی ہیں

ڈاکٹر ہارمان نے صراحت کی ہے کہ شیخ طنطاوی شیخ عبدہ کے اسکول سے متعلق تھے اپنی اس رائے کو اس نے ان ہردو کی تصنیفات کے آراء و نظریات کے مابین موازنہ کرکے محکم کیا ہے'

شیخ طنطاوی نے اپنی پہلی کتاب میں قرآن مجید کی آیتوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے ۱۹۵ کی سورت اور سورہ ۲۵ کی وہ آیتیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کائنات میں بیان کی گئی ہیں' انھوں نے ہی آپ کی ہمت کو علم طبعی کے درس ومطالعہ کے لئے چونکایا' یہ بذات خود اُن اساسی آیات میں سے ایک ہے جن سے محمد عبدہ نے اللہ کی معرفت کی طرف نظری بحث ومجادلہ اور متکلمانہ مناقشات کے بجائے آثار کائنات میں غور وفکر کرنے کی دعوت دینے کے لئے استدلال کیا ہے۔

شیخ طنطاوی نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس میں وہ تمام صیغے دہرائے ہیں جن کا وجود محمد عبدہ کی تعلیمات میں جابجا ملتا ہے' مثلاً آپ کا قول اسلام عقل اور فہم کا دین ہے نہ کہ تقلید وجمود کا' جب علم کا فہم خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جائے' تو فہم دین کا ایک صالحہ ذریعہ بن جاتا ہے' نیز تقدیس اولیاء میں مبالغہ آمیزی سے آپ کا انکار نیز آپ کا یہ قول کہ فقہی مذاہب میں سے صرف ایک مذہب کا اتباع اسلام میں جمود وتاخر کا سبب ہے' اور اجتہاد تمام علتوں اور شکایتوں کے لئے بہترین حل ہے' ...... غرضکہ یہ تمام اقوال محمد عبدہ کی تعلیمات کی غمازی کرتے ہیں'

باقی رہا وہ بیان جو ہم نے آپ کی دوسری کتاب کے متعلق پیش کیا ہے تو وہ آپ کی جملہ تصانیف کے مزاج کی تصویر کشی ہے' یہ بعینہ وہی آئینہ ومزاج ہے جس سے محمد عبدہ کا اسکول ممتاز ہے جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ قرآن تمام عناصر پر مشتمل ہے

جو تمام مسائل کے حل کے کفیل و ذمہ دار ہیں۔

یہ نقش ادھورا رہ جائے گا اگر ہم ایک اور شخصیت کا تذکرہ نہ کریں، اس میں ہم ڈاکٹر فیلیپ حتی جامعہ پرنسٹون کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ شیخ عبدالقادر مغربی کی کتابوں میں آزاد منش تنقیدی روح جلوہ گر ہے، جو جمال الدین اور محمد عبدہ کے تصانیف پر مشتمل ہے اور مغربی ان دونوں کے شاگرد تھے،

ڈاکٹر فیلپ حتی نے شیخ مغربی کے مقالات کا جو دو جلدوں میں طبع کیا ہے دقیق مطالعہ و تجزیہ کیا اس میں اس نے دینی، اجتماعی، ادبی اور تاریخی پہلوؤں پر بحث کی ہے،

سب سے پہلے ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۴ء میں یہ مقالات مصری اخباروں میں شائع ہوئے، ڈاکٹر حتی نے ان کی بعض ایسی عبارتوں کا اقتباس کیا ہے جو المغربی کی تعلیمات اور شیخ عبدہ کی تعلیمات کے درمیان مشابہت پر روشنی ڈالتی ہیں، ان فقرات میں سے صرف ایک عبارت کو ہم ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، کیونکہ یہ المغربی کی تمام رائے جس کی وہ دعوت دیتے تھے آئینہ دار ہے۔ وہ ان کا یہ قول ہے کہ "اسلام میں کچھ چیزیں آمیز ہو گئی ہیں، ان کی اصلاح ضروری ہے، اس اصلاح کو دینی تحریک کے رونما کرنے سے شروع کرنا چاہیئے جس کی غرض و غایت فہم دین کے لئے احکام قرآن کی طرف رجوع تفکیر صحیح کے قوانین و اصول کا اتباع اور بیشتر عادات و رسوم کو چھوڑ دینا ہو جن کو لوگ اسلام شمار کرتے ہیں لیکن یہ درحقیقت اسلامی روح سے کوسوں دور اور زبردستی اس کے اندر ٹھونسے گئے ہیں۔"

دسواں باب

جدید معاصر طبقہ

غالباً تم نے اوپر کے بیان سے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ڈاکٹر توفیق صدقی امام محمد عبدہ کے تمام پیروؤں میں صرف ایک نوجوان تھے، اس صفت میں محمد فرید وجدی بھی شریک ہیں اگرچہ وہ ڈاکٹر موصوف سے عمر میں کسی قدر بڑے تھے، المنار نے صراحت سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام کے پیروؤں میں سے ہیں، اس امر میں کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ ہم ان کی کتابوں میں اس کا ثبوت بھی پاتے ہیں،

لیکن عصر حاضر میں مصر میں مصنفین و علماء کا ایک ایسا گروہ ہے جو عمر میں ڈاکٹر صدقی سے کسی قدر کم ہے اور وہ تجدید و ارتقا کی طرف اپنے جذبات و عواطف میں اس قدر اولی نشاط کا اظہار کرتا ہے جو کبھی آزادی کے دائرہ سے باہر پہنچ جاتا ہے، اس گروہ کے متعلق ہم اس باب میں گفتگو کریں گے،

یہ امر فطری ہے کہ ہم محمد عبدہ کی تعلیمات سے ان مصنفین کے مبلغ تاثر کی جستجو کریں، سب سے پہلے یہاں جو حقائق آشکار ہوتے ہیں جن میں جدل و مناقشہ کی گنجائش نہیں وہ یہ ہیں کہ محمد عبدہ نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی جب کہ ان مصنفین میں سے اکثر افراد سن شباب میں تھے اور ان کے درس و تحصیل کا ابتدائی دور تھا یہ آسان نہ تھا کہ ان کے اور محمد عبدہ کے مابین عہد و ایں تک شخصی روابط و تعلقات پیدا ہو جائیں اور نہ یہ قرین قیاس کہ آپ کا اثر ان کے نفوس کی گہرائیوں میں اتر جائے

اگرچہ رشید رضا امام محمد عبدہ کے جانشین تھے اور آپ کے بجائے زعامت کے وارث ہوئے انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے استاد کے بارے میں اپنے آرار کے سخت محافظ ہیں اور آپ کے مقابلہ میں بہت کم رواداری ہیں، لیکن اس قوی نفوذ و اقتدار کے ذریعہ جدید طبقہ کے نوجوان مفکرین پر احتفاظ کی آپ کو قدرت حاصل نہ تھی، غالباً یہ آپ کے اُستاد کو میسر ہوجاتی اگر وہ زندہ ہوتے،

یہاں ایک اور امر ہے جو اس موضوع سے متعلق ہے، لیکن وہ ان مصنفین کے بارے میں محمد عبدہ کے اثر کی تحدید میں مشقت کو اضافہ کر دیتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام نوجوان مفکرین مغرب سے ادبی اور فکری تعلقات و اتصالات پیدا کر چکے ہیں، جن کی بڑی اہمیت ہے، بعضوں نے مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور یہاں ایک طویل زمانہ گزارا اور بعض مغربی علماء و مفکرین کی تصنیفات کے مطالعہ میں منہمک رہے اور ان کے مطالعہ میں بعض مغربی علماء سے اعانت طلب کی جو مصر میں تعلیمی پیشہ کی مزاولت کیا کرتے تھے۔

لیکن ان اعتبارات کے باوجود ہمیں یہ شک پیدا نہیں ہوتا کہ قطع نظر تمام کے ان بعض مصنفین کی روح اور ان کے جذبات و احساسات جدید مشکلات کے مقابلہ میں محمد عبدہ کے آراء سے متاثر ہوئے ہیں، گو امام کے پیہم اثر سے ان کو سابقہ نہیں پڑا، پھر بھی وہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں ہیں، ہمارا مطمح نظر یہاں یہی ہے کہ محمد عبدہ کے آرا و افکار نے ان بعض مصنفین و مفکرین پر جو اثر ڈالا ہے اس کا انکشاف کریں،

یہ واضح ہے کہ ہماری اس کتاب میں اُن تمام مولفات میں بحث کرنے کی گنجائش و وسعت نہیں جنھیں عصر حاضر کے فاضل مصنفین نے لکھا ہے ہماری اس بحث کا مقصد اگر جدید مصری ادب کا استقصاد (استقرا) ہوتا تو ہم ضرور ان تمام

کا ذکر کرتے لیکن ہم نے اپنی بحث کو ایک محدود معین پہلو پر منحصر رکھا ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جدید اہم مصنفین میں سے صرف تین کا انتخاب کریں، یہ فی الحال تمام مصنفین کے مثالی نمونہ کے لئے کافی ہیں، ان تین کے نام یہ ہیں مصطفےٰ عبدالرازق استاد فلسفہ جامعہ مصریہ، طٰہٰ حسین استاد ادب عربی جامعہ مذکورہ، علی عبدالرازق جو مصطفےٰ عبدالرازق کے بھائی ہیں اور محاکم شرعیہ میں قاضی تھے مذکورہ بالا اشخاص پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے اُن اشخاص کا تذکرہ ضروری ہے جو اس سے متعلق ہیں منجملہ ان کے محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸) مدیر "السیاستہ" ہیں، انھوں نے پیرس یونیورسٹی سے اقتصاد سیاسی میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ہے، پہلے ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ الجریدہ سے ان کا جو تعلق تھا اس سے ان کا میلان جدید آراء و نظریات کی طرف معلوم ہوتا ہے جن کو لطفی سید اور ان کے پیرو رائج کئے ہوئے تھے یہ آراء و افکار مذہبی اتصال کی بہ نسبت زیادہ تر ادب اور طبیعت سے متعلق تھے، ہیکل جریدۃ السفور میں جو "الجریدہ" کے بعد نکلا اور اپنے اخبار "السیاستہ" میں ان آراء کی طرف مسلسل توجہ کیا کرتے تھے،

ہیکل نے محمد عبدہ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اپنے آراء کا استفادہ نہیں کیا جیسا کہ المنار نے اس کی تصویر کھینچی ہے لیکن وہ اس تحریک کے بعض پہلوؤں اور خصوصاً اس پہلو سے جس کی طرف قاسم امین نے اعتنا برتا اور جس پر ہیکل کو حیرت و استعجاب ہوتا تھا بالکلیہ بعید نہ تھے، اسی لئے جہاں انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ اپنی کتاب "تراجم مصریہ و غربیہ" کی تالیف تک پہنچے اور نیز جدید مصر کی تاریخ کی اہم شخصیات پر زندہ پر گفتگو کی ہے وہاں یہ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں یہ مصر میں وکالت کی تعلیم پا رہے تھے اُسی وقت سے انھوں نے قاسم امین کی کتابوں اور اس کے متعلق جو کچھ تنقیدیں کی گئی ہیں ان کو پڑھے

کی طرف توجہ کی، اس کے بعد ان کے نفس میں ایک خیال جاگزیں ہو گیا جس کو ہیکل نہایت دقیق شمار کرتے ہیں،

باقی رہا یہ ذکر کہ محمد عبدہ کا اثر عباس محمود عقاد (۱۸۸۹) اور عبدالقادر مازنی میں کہاں تک ہوا تو غالباً ہیکل کے تعلق کے مقابلہ میں یہ تاثر ان دونوں میں بہت دور کا لگاؤ رکھتی ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان اور محمد عبدہ کی جماعت کے مابین شخصی تعلقات اور تعارف کے روابط بہت کم ہیں، عقاد سعد پاشا زغلول کے رفیق کار رہتے، لیکن یہ رفاقت آخری سالوں میں حاصل ہوئی جبکہ سعد زغلول کی تاریخ میں سیاست کو پہلا مقام حاصل ہوا،

باقی رہ گئے مازنی تو خود ان کا بیان ہے کہ انھوں نے محمد عبدہ کو دو مرتبہ دیکھا، پہلی بار جب کہ وہ دس سال کے بچے تھے، ان کے بڑے بھائی نے ان کو محمد عبدہ کے گھر روانہ کیا تاکہ آپ سے کچھ امداد طلب کرے، شیخ عبدہ نے لطف وعنایت سے ان سے ملاقات کی حالانکہ آپ اس وقت آپ کی محفل میں بڑے بڑے ملنے والے جمع تھے، آپ نے اپنے دوست شیخ ابوخطوۃ کو ان کے مطالبہ کو قبول کرنے کے لئے واسطہ بنایا۔

عقاد اور مازنی کی ادبی تصویروں کو کیف آور بنانے میں انگریزی ادب ایک اہم عنصر ہے، یہ دونوں اُن مصری مصنفین میں سے ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ مشرق اپنے اسلامی عربی قالب کو چھوڑے بغیر جس میں مشرقی تمدن اور مشرقی ثقافت ڈھلی ہوئی ہے۔ مغربی آداب اور مغربی علوم کے ذخیروں سے اکتساب کر سکتا ہے،

پروفیسر گب کا خیال یہ ہے کہ عقاد اور مازنی کا مذکورہ بالا نظریہ ڈاکٹر ہیکل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی بہ نسبت محافظین کے زیادہ قریب ہے،

ڈاکٹر منصور فہمی (۱۸۸۶) استاذ فلسفہ جامعہ مصریہ غالباً ان تمام کی بہ نسبت محمد عبدہ کی روح سے قریبی تعلق رکھتے تھے، ڈاکٹر منصور فہمی نے فرانس میں پانچ سال بسر کئے، یہاں سربون یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم پائی، اس مدت کے اختتام پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پائی اور اپنا ایک رسالہ "المرأۃ والاسلام" کے نام سے پیش کیا،

ان کے اپنے وطن واپس ہونے کے بعد یہ رسالہ ان کی راہ میں بہت سی مشکلات ومصائب سے دوچار ہونے کا باعث ہوا، اس نے عوام کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کر دیا اور ان کی مخالفت شدید ہوگئی یہاں تک کہ چند سال تک ان کے درمیان اور جامعہ مصریہ میں ان کے منصب کے درمیان روک ٹوک رہی

سنہ ۱۹۲۲ء میں جب محمد عبدہ کی یاد زندہ کرنے کے لئے جلسہ منعقد ہوا تو ڈاکٹر منصور بھی ایک مقرر تھے، چنانچہ انھوں نے محمد عبدہ کے اخلاق آپکی استقلال راستے اور تربیت وتعلیم میں آپ کے جو افکار وخیالات تھے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی، پھر بیان کیا کہ انھوں نے استاذ امام کو صرف ایک مرتبہ دیکھا ہے جب کہ وہ بچے تھے اور ابتدائی تعلیم پا رہے تھے اور اس بڑی ہستی کے متعلق اکثر تذکرے سنا کرتے تھے،

سنہ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر منصور نے اپنے مقالات کا مجموعہ "خطرات نفس" کے نام سے شایع کیا، اس میں اخلاق، ارتقا، دینی نگہداشت، جامد محافظت سے بیزاری، حریت فکر کا احترام، ہر فرد کو عقلی قوتوں سے کام لینے کا حق وغیرہ مباحث کا انکشاف ہوتا ہے، اس کتاب کے اکثر مقامات میں محمد عبدہ کی تحریروں کا عکس جھلکتا ہے کیونکہ ان دونوں کے مابین عبارت آرائی یا اظہار خیال میں مشابہت کی بہ نسبت امور کی طرف نظر کرنے میں زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔

لیکن منصور فہمی کے بہت سے آراء و نظریات ایسے ہیں جو تقریباً محمد عبدہ کے معتقدات و افکار سے میل نہیں کھاتے، مثلاً فنی اندازہ کے عاطفہ کا احترام جو انسانی جمال میں فکر و تامل کے لئے حرکت دیتا ہے (ص ۲۹) یا بافلوفا کی تحریکات میں غور و خوض (ص ۴۵) احترام کرنا جو تقریباً روحانی ہو جاتا ہے اور مصور اکبر کی تقدیس اور اس کی پرستش کے شعور تک پہنچا دیتا ہے۔

یورپ جانے والی خواتین کے روبرو انھوں نے جو تقریر کی تھی کہ تم بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کیلئے اپنے وطن کو چھوڑ رہی ہو یہ دقت واحد میں ان کی دیرینہ محافظت اور ان کے تجدید کی طرف رجحان کی تصویر کھینچتی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ

"تمھارے سرزمین مصر چھوڑنے سے قبل تمھارے کانوں میں یہ درد نمائی دے گا کہ تم ایسی قوم سے تعلق رکھتی ہو جس کا ماضی ہے اور اس کی روایات ہیں، تمھارا فرض ہے کہ تم ماضی میں تبدیلی کرو لیکن اس کی تحقیر نہ کرو (ص ۱۳۴)

اس سرسری نگاہ کے بعد جو عصر حاضر کے زعماء ادب کے اوپر ڈالی گئی ہے ہمیں ضروری ہو گیا کہ مذکورہ بالا تینوں مصنفین پر بحث کی طرف رجوع کریں جن کے متعلق ہم نے تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا،

مصطفیٰ عبدالرازق (۱۸۸۵) کا محمد عبدہ سے جو تعلق ہے اس میں ہمیں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں، یہ تعلق ان مصنفین کے صلات کی بہ نسبت جن کے متعلق ابھی ہم نے گفتگو کی ہے۔ نہایت واضح اور متین ہے، یہ اور ان کے بھائی علی حسن عبدالرازق پاشا کے لڑکے ہیں جو محمد عبدہ کے مخلص دوست تھے اور مجلس شوریٰ القوانین میں آپ کے مددگار تھے اور سنہ ۱۹۰۷ء میں حزب الامۃ کے صدر تھے مصطفیٰ اور علی یہ دونوں جامعہ ازہر میں استاذ الامام کے شاگرد رہ چکے ہیں، ان میں مصطفیٰ جامع ازہر میں پہلے

داخل ہوئے اور امام کی شاگردی کا شرف حاصل کیا کیونکہ یہ اپنے بھائی سے عمر میں بڑے ہیں، مصطفیٰ عبدالرازق درحقیقت محمد عبدہ کے تلامذہ میں زیادہ قریب ترین تلمیذ تھے،

شیخ محمد عبدہ سے آل عبدالرازق کے جو تعلقات و روابط تھے اور ان میں امام کی جو تاثیر تھی اس پر رشید رضا نے روشنی ڈالی ہے اور بیان کیا ہے کہ اس خاندان کے افراد نے ایک جمعیت کی ترکیب دی تھی تاکہ اخلاق و فضائل کی تخم ریزی کی جائے اس انجمن کے ارکان اپنے گھر میں ہفتہ میں ایک مرتبہ جمع ہوا کرتے تھے، محمد عبدہ کی وفات کے بعد ان کا جو پہلا اجتماع ہوا اس کی غرض و غایت محمد عبدہ کی یاد کا احیاء تھا، چنانچہ افراد خاندان نے امام کی تعریف کی، تفصیل سے آپ کی مدح سرائی کی۔ آپ کی وفات پر حسرت و افسوس کا اظہار کیا، اس اجتماع میں مصطفیٰ عبدالرازق اور علی عبدالرازق نے بلحاظ محمد عبدہ کے تلامذہ کے تقریر کی۔

رشید رضا نے امام کے مکتوبات و رسائل کے مابین ایک خط نشر کیا ہے، جس کو آپ نے مصطفیٰ عبدالرازق کی طرف لکھا تھا، مصطفیٰ نے چند اشعار آپ کی خدمت میں روانہ کئے تھے جن میں آپ کی مدح سرائی کی تھی، شیخ نے اس کے جواب میں ایک بلیغ العبارۃ خط لکھا جو محبت و مودت سے لبریز تھا اور آخر میں اس قول پر ختم کیا "لیکن میں تمہارے لئے خلوص دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے تمہارے انجام سے بہرہ ور کرے جیسا کہ تمہارا آغاز ہے، تمہارا باطن حق کے لئے خالص ہو جائے اور راہ حق کی طرف تمہیں رہبری کرے اور اپنی قوم کو مجتمع کرنے کے لئے تمہارے نفس میں جوش نشاط عطا کرے والسلام"

جب مصطفیٰ نے ۱۹۰۹ء میں جامع ازہر سے شہادت عالمیہ حاصل کی تو فرانس روانہ ہو گئے اور یہاں "دیرکائیم" وغیرہ فاضل علماء سے علم الاجتماع اور علم الاخلاق

کی تعلیم پائی۔
جب اپنے وطن لوٹے تو دینی درس گاہوں کے سکریٹری معین کئے گئے پھر اس کے بعد محاکم شرعیہ میں مفتش کے عہدہ پر فائز ہوئے، ۱۹۲۷ء میں جامعہ مصریہ میں فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے، آپ کی ادبی تصنیفات میں محمد عبدہ کی زندگی کے دراسات اور آپ کی تعلیمات شامل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے استاد کے عہد کے پاسبان اور آپ کی دیرینہ محبت و مودت پر قائم ہیں،
مصطفیٰ نے مسیو برنار میشل کے ساتھ ملکر رسالہ توحید کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کے شروع میں مقدمہ لکھا جس میں محمد عبدہ کی زندگی کی تاریخ پر تفصیل سے بحث کی اور اس میں آپ کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے،
۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں شیخ مصطفیٰ نے جامعہ مصریہ میں محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا جن میں امام محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کے آراء پر گفتگو کی ہے،

جب امام محمد عبدہ کی وفات کی سترہویں سالانہ یادگار کا جلسہ منعقد کیا گیا۔ تو مصطفیٰ نے خطبۂ صدارت پڑھا جس میں محمد عبدہ کی زندگی کا خلاصہ بیان کیا اس کے ساتھ دوسرے خطبات جو اس وقت ۱۹۲۲ء میں دئے گئے تھے شائع ہوئے،
لیکن مصطفیٰ باوجود محمد عبدہ کے مبادی پر دفاعی تمسک کے امام کی پیدا کردہ تحریک و نہضت کے عقلی گوشوں پر بہ نسبت اس کے دینی پہلوؤں کے زیادہ تر خصوصی اعتنا برتتے ہیں، یہ ایسی حقیقت ہے جو شیخ مصطفیٰ کے رجحانات و مقاصد کے درمیان اور امام عبدہ کے دیگر پیروؤں کے مابین جو المنار کی زعامت کے مطیع و منقاد ہیں، ایک جوہری فرق قائم کرتی ہے، کیونکہ انھوں نے بہ مقابلہ کسی اور شئے پر اہتمام کرنے کے زیادہ تر اصلاح دینی کی اہمیت پر توجہ صرف کی ہے،

یہ عقلی اہتمام جس کا مصطفیٰ اظہار کرتے ہیں ایک طرح سے ان کو اس جدید طبقہ سے قریب کر دیتا ہے جس نے اجتماعی و اخلاقی اصلاحات کا بہت کم اہتمام کیا اور اپنی اولین غرض و غایت علمی بحث و نظر میں حریت فکر اور استقلال رائے کو قرار دیا، لیکن ان تمام کے باوجود ہمیں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصطفیٰ عبدالرازق تمام جدید طبقہ کے مقابلہ میں محمد عبدہ سے زیادہ قریب ہیں یہ آپ کے مسلک پر چلتے اور آپ کی روش اختیار کرتے اور آپ ہی کی تعلیمات کا اتباع کرتے ہیں

ڈاکٹر طہٰ حسین (۱۸۸۹ء) جدید طبقہ کے دست راست ہیں، بچپن میں ایک مہلک مرض کی وجہ سے ان کی بصارت جاتی رہی، لیکن وہ اس کے باوجود نہایت ذکی و فہیم عالم ہیں، بلا خوف و خطر مغربی ادبی تنقید کو عربی ادب کے مطالعہ پر منطبق کرتے ہیں اور اس مطالعہ کو قدیم تنقیدی اسالیب کی بندشوں سے جو اس کی پیشقدمی کی راہ میں حائل ہیں آزاد کرانا چاہتے ہیں اور علمی بحث کی شان کو مصر میں دوبالا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مصری ادبی عربی علمی بحث بلحاظ اپنی قدر و قیمت اور باعتبار اپنے نتائج کے مغربی علمی بحث کے مشابہ ہو جائے۔

طہٰ حسین اپنی ابتدائی تعلیم مصر کے بالائی حصہ کے مدرسہ میں حاصل کرنیکے بعد جامع ازہر میں داخل ہوئے اور یہاں کئی سال تک رہے، یہاں تک کہ آخری امتحان دینے سے پیشتر اپنے استقلال رائے اور اپنے ترقی یافتہ افکار کی بنا پر جامع ازہر سے منقطع ہو گئے، پھر جامعہ مصریہ سے ملحق ہو گئے اس وقت اس کے دروازے کھلنا شروع ہو گئے تھے، خوش قسمتی سے انھوں نے اس جامعہ میں اطالوی مستشرق پروفیسر "نلینو" جامعہ توبنجن کے پروفیسر "ربنولیتان" اور پروفیسر "وسانتلانہ" سے تعلیم پائی۔

۱۹۱۴ء میں جامعہ مصریہ سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی، یہ پہلے

طالب علم تھے جنھوں نے مذکورہ درس گاہ سے یہ ڈگری پائی، پی۔ ایچ۔ ڈی کے امتحان کے لئے جو رسالہ پیش کیا وہ "ابو العلاء معری" کے متعلق تھا جو اس کے اشعار کی بحث پر مشتمل تھا، یہ رسالہ ۱۹۱۵ء میں شائع کیا گیا۔

جامعہ نے ان کی تحصیل کے تفوق و برتری کا اندازہ لگایا اور ان کو فرانس روانہ کیا اور وہاں کے علمی وفد سے انھیں ملحق کر دیا، جامعہ سربون پیرس میں تین سال تعلیم پانے کے بعد امتیازی طور پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، فرانس کے دوران قیام میں "کالج دی فرانس" میں پروفیسر "کازانوفا" نے جو محاضرات (لیکچر) دیئے ان میں بھی شریک ہوا کرتے تھے، ڈاکٹریٹ کے امتحان کے لئے فرانسیسی میں ایک مقالہ تیار کیا جس کا موضوع "فلسفۂ ابن خلدون پر تحلیل و تنقید" تھا۔

جب سے طٰہٰ حسین نے جامعہ مصریہ میں درس و تدریس کا کام کیا چند کتابیں لکھیں، جن میں سے پہلی کتاب دراسات کا مجموعہ تھی، جو باہمی ارتباط سے متفاوت تھی، اس میں اسلامی ثقافت اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر جیسا کہ عربی ادب میں خصوصاً ابو نواس کے زمانے میں پائی جاتی تھی بحث کی گئی تھی۔

یہ دراسات ہفتہ واری مقالات کی شکل میں ظاہر ہوئے جن کو جریدہ السیاسۃ نشر کیا کرتا تھا، پھر یہ ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوئے جس کا نام "حدیث الاربعاء" تھا۔

ان کی ایک اور کتاب ہے جو تمام کتابوں میں بہت زیادہ اہم ہے وہ کتاب الشعر الجاہلی ہے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی، جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اس پر سخت تنقیدیں کی گئیں، شاید ہی اس قدر درشت تنقیدیں کسی اور کتاب پر کی گئی ہوں گی۔ اس کتاب کے مصنف پر یہ الزامات عائد کئے گئے کہ وہ دینی بنیادوں کو منہدم کرتے ہیں۔

چونکہ جامعہ مصریہ حکومتی درسگاہ تھی جو سرکاری مال سے زندہ تھی اور جس کی نگرانی وزارت معارف کرتی تھی اس لئے احتجاج کرنے والوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور انھوں نے ڈاکٹر طہ حسین کو ملازمت سے برطرف کرنے پر اصرار کیا، اور ان کی کتاب ضبط کرنے اور ان پر جرمانہ عائد کرنے کا مطالبہ کیا نیز یہ کہ یونیورسٹی سے یہ بازپرس کی جائے کہ اس نے اپنے اندر اس الحاد کی تعلیم کو کیونکر مباح رکھا حالانکہ اس کا دارومدار حکومت کے اموال پر ہے'

پارلیمنٹ میں اس موضوع کو پیش کیا گیا اور یہاں سخت بحث و مناقشہ رونما ہوا، اگر رئیس وزارت کے بعض رفقاء مداخلت نہ کرتے تو یہ اختلاف پارلیمانی ذمہ داریوں تک پہنچ جاتا اور وزارت کا اعتماد اس پر جاتا رہتا، آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اس کتاب پر جرمانہ عائد کیا جائے جس نے شعور دینی کو چیلنج دیا ہے، ڈاکٹر طہ حسین نے اتہام انفہ جامعہ کے ارباب اقتدار تک پہنچایا لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر شیخ ازہر وغیرہ نے اس قضیہ کو عدالت میں پیش کر دیا، لیکن پارلیمنٹ نے عمیق مطالعہ کے بعد دعوی محفوظ کر دیا۔

ڈاکٹر طہ کی کتاب میں اساسی نظریہ یہ ہے کہ جاہلین کی طرف جو اشعار منسوب ہیں ان کے بیشتر حصہ میں کسی قسم کی جاہلیت کے اثرات نہیں پائے جاتے، وہ اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ پہلے پہل ان کے دل میں ادب جاہلی کی صحت کے متعلق شکوک گزرے لیکن بحث و مباحثہ کے بعد ایک ایسے نتیجہ پر پہنچے جو تقریباً یقین کی ... حد تک گزر چکا تھا وہ یہ تھا کہ "جس کو ہم بکثرت ادب جاہلی کا نام دیتے ہیں، وہ کسی طرح جاہلی نہیں ہے بلکہ وہ ظہور اسلام کے بعد کا ایجاد کردہ ادب ہے لہذا وہ اسلامی ہے جو جاہلیوں کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ تر مسلمانوں کی زندگی، ان کے میلانات و خواہشات کا آئینہ دار ہے" پھر وہ کہتے ہیں کہ صحیح

ادب جاہلی میں سے صرف چند چیزیں باقی رہ گئی ہیں جن میں کسی شی کی تصویر کا عکس نہیں جھلکتا اور نہ کسی چیز کا اس سے اظہار ہوتا ہے، اس عصر جاہلی کے لئے صحیح ادبی صورتوں کے استخراج میں اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے"۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال یہ ہے کہ انتحال شعر اور شاعری کو ایسے شعراء کی طرف نسبت دینے کے لئے جن کے نام جاہلیت میں مشہور تھے چند محرکات سبب بنے ہیں، مثلاً سیاسی دعوت کی نشر و اشاعت کی خواہش یا عصبیات کی رضاجوئی، یا ایسے اغراض و مقاصد کو کام میں لانا جو افسانہ نویسوں، داستان خوانوں، نحویوں، محدثوں، علماء کلام اور اصحاب تاویل کے پیش نظر تھے غرض کہ یہ تمام داعیات اس کا موجب تھے۔

لیکن دینی جذبہ کے مناقشہ نے مخالفین کے غیظ و غضب کی آگ خاص طور سے بھڑکا دی، جاہلی شاعری اس کے لئے ایک ایسا سرچشمہ تھا جس سے استشہاد کیا جاتا اور اسلامی عقائد کی صحت کی دلیل یا قرآن کے اسالیب اور اس کے الفاظ اور اس کے نظامات فکر کی استقامت کی حجت کے لئے اس سے سیرابی حاصل کی جاتی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کہتے ہیں کہ "علماء نے جاہلی شعراء سے ہر چیز پر استشہاد کیا ہے، اگر تم لغت اور ادب کی کتابیں، تفسیریں اور مقالات کا مطالعہ کروگے تو اس عربی جاہلی شاعری کا تمہارے دل میں عجیب و غریب شکل و صورت میں قوی اثر پیدا ہوگا، یہاں تک کہ تمہیں خیال پیدا ہونے لگے گا کہ ان میں سے کوئی عالم جب کبھی علمی فروع میں کوئی اختلاف دیکھتا اور ضرورت کے وقت اس کو کوئی دلیل یا تدبیر اس کے ازالہ کی نہ دکھائی دیتی تو قبل اسلام عربوں کے کلام سے اپنے حسب منشاء اقوال پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے دوران کلام میں بعض ایسے آراء

ونظریات کا علی الاعلان اظہار کیا ہے جو ان کے الحاد و دہریت کی دلیل شمار ہوتے ہیں مثلاً انھوں نے اس کا انکار کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسمٰعیل نے کعبۃ اللہ تعمیر کیا' ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں انبیاء کے تاریخی وجود میں شک کیا ہے' نیز انھوں نے عوام الناس کے اس مشہور عقیدہ سے انکار کیا ہے کہ ساتوں قرائتیں نبی کریم صلعم سے مروی ہیں' نیز وہ منکر ہیں کہ اسلام حضرت ابراہیمؑ کا دین تھا اور وہ محمد (صلعم) کے قبل بلاد عرب میں پایا جاتا تھا لیکن کتاب کی حقیقی قدر وقیمت اس میں نہیں کہ وہ اسلامی عقائد پر تشکیک وشبہات پر مشتمل ہے' جنھوں نے محافظین کو مشتعل کر رکھا ہے' بلکہ اس کی وقعت صرف اسی لئے ہے کہ اس نے ادب عربی کے مطالعہ و درس میں تنقیدی مناہج واصول کا اتباع کرنے کی دعوت دی ہے'

ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی کتاب کے ابتدائی ابواب میں عربی ادب کے درس میں جن اسالیب ومذاہب کا اتباع کیا گیا ہے ان پر شدید نقد وجرح کی ہے اپنی پوری کتاب میں اُس جذبہ ورجحان کا مذاق اڑایا گیا ہے جو قدماء کے ہر قول کو قبول اور ان کے ہر کلام کو بلا تنقید وجرح اور بحث وتحیص کے تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے' نیز یہ کہ قدماء خود تنقیدی اسالیب و اصول سے بہت کم واقف تھے'

ڈاکٹر طہ لکھتے ہیں کہ" میں یہ چاہتا ہوں کہ متقدمین نے ادب اور تاریخ ادب میں جو کچھ کہا ہے ہم اس کو صرف بحث وتثبیت کے بعد ہی قبول کریں پھر اس پر زور دیتے ہیں کہ یہ جس منہج کی طرف تنقیدی بحث کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں وہ عنقریب قدیم علم کی کایا پلٹ دے گا اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر عربی ادب کی قوت نمو اور حیات پر فتح پانے کا ارادہ ہے تو سب سے پہلے ضروری کہ اُسے دینی علوم کے حدود وقیود سے رہائی دلائی جائے جو اس کو اپنے اندر

جکڑے ہوئے ہیں، کیونکہ ادب کا آجکل اس لحاظ سے درس و مطالعہ کیا جا رہا ہے
کہ وہ فہم قرآن و حدیث کا وسیلہ ہے، بذاتہ ادب کا درس نہیں دیا جا رہا ہے، اگر
قرآن و حدیث کا سمجھنا بغیر ادب کے ممکن ہوتا تو ادب کے درس سے استغنا آسان
تھا لیکن طرفہ یہ کہ خود لغت کو متقدمین نے مقدس لغت شمار کر لیا کیونکہ وہ قرآن اور
دین کی زبان ہے اسی لئے لغت صحیح علمی بحث کے تابع و منقاد نہ ہو سکی،

پھر کہتے ہیں کہ "میں سمجھتا ہوں کہ تم اب میری موافقت کرو گے کہ اس لحاظ
سے حریت عربی زبان کی ادبی تاریخ کے نشأ و ارتقا کے لئے اساسی شرط ہے، خیالہ
میں ادبی تاریخ کا آزادی کے ساتھ درس دینا چاہتا ہوں جیسا کہ ماہر علم طبیعیات
علم الحیوان یا علم النبات کا مطالعہ کرتا ہے، میں اسی درس و مطالعہ میں کسی قوت
و طاقت سے مرعوب نہیں ہوتا، نیز میں یہ چاہتا کہ زبان اور آداب کی شان اُن
علوم کی شان کی طرح ہو جو پہلے اپنی آزادی اور استقلال سے بہرہ ور ہوئے ہیں
جن کی آزادی و استقلال کے حق کا اعتراف تمام حکومتوں اور طاقتوں نے کیا ہے
صرف اسی شرط اور اصول پر عربی ادب زمانے کی ضروریات کے ہم آہنگ ہو کر
جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں زندگی و نمو پا سکتا ہے......"

ورنہ مجھے اس کی کیا پڑی ہے کہ میں ادب کا ایسا مطالعہ کروں یا درس
دوں جس سے متقدمین کے اقوال ہی کو دہرا سکوں؟ کیوں نہیں قدماء کے بیان
ہی پر اکتفا نہیں کر لیا جاتا؟ کیا میں ادب کا اس لئے درس دوں اور مطالعہ
کروں کہ میں اپنی زندگی اہل السنۃ کی مدح سرائی اور معتزلہ شیعہ اور خوارج
کی مذمت میں محدود کر دوں حالانکہ ان تمام میں نہ کوئی شان ہے، نہ منفعت، اور
نہ علمی غرض و غایت؟

مجھے کون ایسی زحمت دیگا کہ میں ادب کا اس لئے مطالعہ کروں کہ اس

کے ذریعہ اسلام کا مبلغ یا الحاد کی عمارت ڈھلانے والا ہو جاؤں، حالانکہ میں نہ یہ چاہتا ہوں کہ مبلغ ہو جاؤں اور نہ یہ خواہش کرتا ہوں کہ ملحدوں سے مباحثہ و مناقشہ کروں، میرے لئے ان تمام کے بجائے میرے اور خدا کے مابین جو دینی حفظ ہے وہی کافی ہے؟"

اس طرح ڈاکٹر طہ چاہتے ہیں کہ ہر قسم کے میلانات و خواہشات سے علیحدہ اور تمام نوع کے عواطف و جذبات سے خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی، مبرا و منزہ ہو کر ادب کا علمی درس دیا جائے، لیکن ان تمام امور سے اثر پذیر ہونا انسانی طبیعت کا خاصہ ہے اور اس سے گریز کی کوئی صورت نہیں، اسی لئے متقدمین عرب و عجم باہم دیگر تعصب برتتے تھے اس لحاظ سے ان کا علم فساد سے بری نہ رہا۔

پھر کہتے ہیں "بیشک! جب ہم عربی ادب اور اس کی تاریخ پر بحث کرنا چاہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے قومی عواطف واحساسات اور تمام تعصبات کو بھول جائیں اور اپنے دینی جذبات و میلانات اور ان سے متعلقہ تمام اشیاء کو فراموش کر دیں"۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں علم و فلسفہ کے مباحث کے پیش کرنے میں جدید اہل علم و فلسفہ کا جو مسلک ہے وہ بحث میں اختیار کروں گا، میں ادب میں وہ فلسفیانہ منہج اختیار کرنا چاہتا ہوں جس کو دیکارٹ نے حقائق اشیاء کی بحث و جستجو کے لئے پیدا کیا ہے"

ان کی تمام کتاب سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بحث میں ذہنی پہلوؤں پر اولین توجہ صرف نہیں کرتے تھے گو وہ تھوڑی بہت اہمیت ان کو دے چکے تھے لیکن ان کا اولین مطمح نظر اور مقصد مغربی علماء کی نظر میں مصری علمی دراسات

کو بلند و بالا کرنے کی آرزو اور علمی پہلو پر منحصر تھا، وہ بیک وقت یہ کوشش
کرتے تھے کہ ان کے طریقۂ بحث سے جو برا اثر جمہور میں پیدا ہونے کا امکان
ہے اس میں تخفیف کر دیں، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ
انسان کے لئے

وقت واحد میں دو رجحان ہوں ایک عالم کا رجحان جو تنقیدی مسلک پر چلتا ہے
دوسرا ایسے شخص کا رجحان جو دینی تعلیمات کو تسلیم کرتے ہوئے قبول کرتا ہے؛
مثلاً وہ اخبار السیاستہ ہفتہ وار میں لکھتے ہیں کہ "ہم میں سے ہر شخص تھوڑے
سے غور و فکر سے اپنے نفس میں دو ممتاز شخصیتیں پا سکتا ہے ایک شخصیت عالمہ
جو بحث و تمحیص، تنقید و تحلیل کرتی اور کل جو ایک نظریہ قائم کر چکی تھی آج اسمیں
تغیر کر دیتی ہے اور کل جس خیال کی بنیاد اٹھا چکی تھی آج اسے منہدم کر دیتی ہے
دوسری شخصیت شاعرہ ہے جو لذت و الم، مسرت و غم، رضا و غضب اور رغبت
و رہبت جیسے تاثرات سے بغیر نقد و تبصرہ اور بلا بحث و تحلیل متاثر ہوا کرتی ہے،
یہ دونوں شخصیتیں ہمارے مزاج اور ہماری تکوین و ترکیب سے وابستہ ہیں، ہم ان
میں سے کسی ایک سے گریز نہیں کر سکتے" اس کی کیا وجہ ہے کہ پہلی شخصیت
عالمہ، باحثہ اور ناقدہ ہے اور دوسری شخصیت مومنہ، مطمئنہ ہے اور مثل اعلیٰ
کی خواہش مند و حریص"؟

اس مبدا و خیال کو ساتھ لیکر بڑھتے ہیں اور مسلمہ طور پر یہ ثابت کرتے ہیں
کہ وہ ایک مسلمان کی طرح ہیں جو حضرت ابراھیم اور حضرت اسماعیل اور ان سے متعلقہ
امور کے وجود میں جن کو قرآن نے پیش کیا ہے کسی قسم کا تشکک و شبہ نہیں کرتا لیکن
وہ ایک عالم کی طرح ہیں جو مناہج بحث کی رو سے اس کا یقین کرنے کے لئے بے چین
و مضطرب ہے، اس لئے وہ ابراھیمؑ و اسماعیلؑ کے علمی تاریخی وجود کو اس وقت تک

تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تا وقتیکہ علمی دلیل سے ان کا وجود نہ ثابت کر دیا جائے
یہ بہت مشکل ہے کہ ہم طہٰ حسین کی تصنیفات میں ایسے معینہ مسائل کا سراغ
لگائیں جو محمد عبدہ کی تعلیمات سے وابستہ ہیں، جب طہٰ حسین ازہر میں داخل
ہوئے تو امام نے اپنے اور اس درس گاہ کے درمیان جو تعلقات تھے وہ منقطع کر لئے
تھے، لیکن ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ طہٰ حسین امام کی
تعلیمات سے ایک حد تک روشناس تھے، غالباً محمد عبدہ نے اس زمانے میں ازہر
کے نصاب تعلیم کے خلاف جو انقلاب پیدا کیا تھا اسی نے طہٰ حسین کے حوصلے
بڑھا دیئے اور آزادی فکر کی طرف مائل ہونے کا اشارہ کیا،

جب یہ صحیح ہو گیا کہ وہ امامؒ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تو ان کالجوں میں اپنی
عربی تعلیم کے علاوہ فرانسیسی ادب اور یونانی ادب کی تعلیم پانے نے ان کی
فکری صیقل کاری میں گہرا اثر کیا جس کی وجہ سے ان میں اپنے اور محمد عبدہ
کی تعلیمات کے مابین فکری وابستگیوں اور تعلقات کے وجود کو تسلیم کرنے کا
جذبہ پیدا ہو گیا،

بہر حال ہمیں اس میں ذرا بھر شبہ نہیں کہ ڈاکٹر طہٰ حسین اور محمد عبدہ کی
تحریک کے درمیان کوئی ربط و صلہ نہیں پایا جاتا جیسا کہ آج المنار اس کی تصویر
کھینچ رہا ہے

بلکہ رشید رضا کا خیال یہ ہے کہ طہٰ حسین اور ان کے متبعین اسلام سے
برگشتہ ہیں، ان کی کتاب کا مقصد جامعہ مصریہ کے طلباء اور ان کی کتاب کا مطالعہ
کرنے والے تمام اشخاص کو اسلامی دین میں نہ صرف تشکیک پیدا کر دینا ہے
بلکہ ان کے عقائد کو بگاڑ دینا اور ان کو کفر پر آمادہ کر دینا ہے

پھر آپ فرماتے ہیں، کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی آخری کتاب میں جو

آرا و معتقدات پیش کئے ہیں ان میں کوئی مستند علمی صحیح دلیل نہیں ہے، بلکہ وہ محض بُہ فریب تخیلات اور باطل مفروضات ہیں' ان کے ذریعہ سے انھوں نے اسلام سے اپنی برگشتگی کا ثبوت دیا ہے' یہ ان کے عمل اور مسلمانوں میں اس کی بری تاثیر کا نتیجہ ہے جس کی انھوں نے لاپروائی سے تصریح کی ہے۔

ہمیں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رشید رضا نے جہاں اپنے نامزدہ "مصر میں الحاد کے نئے پروپیگنڈہ" پر گفتگو کی ہے وہاں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ڈاکٹر طہ حسین کی کتابیں اس پروپیگنڈے کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہیں' یہ ایسی کتابیں ہیں جو امام غزالی اور ابن خلدون جیسے ائمہ اسلام کی جن کی مغربی علماء تعظیم و تکریم کرتے ہیں تحقیر و توہین کرتی ہیں اور جن لوگوں پر الحاد و زندقہ کا الزام عائد کیا ہے مثلاً ابوالعلاء معری تو یہ ان کی شان دوبالا کرتی اور جو مذاق' دلگی' اور بیہودگی و خرافات گوئی میں مشہور ہیں مثلاً ابو نواس وغیرہ تو یہ ان کی ثقافت و تہذیب کی مدح سرائی کرتی ہے،

اب ہم یہاں علی عبدالرازق (۱۸۸۸) پر گفتگو کریں گے' ان کا موقف اپنے بھائی مصطفٰے عبدالرازق کے اور طہ حسین کے مابین معتدل و متوسط ہے' ایک طرف تو وہ امور دین میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے اور دینی معاملات میں شک و شبہ کو اپنے دل میں دخل نہیں دیتے جیسا کہ طہ حسین نے کیا' اور دوسری طرف محمد عبدہ کی تعلیمات کے اتباع کی طرف قوی میلان کا اظہار نہیں کرتے، جیسا کہ ان کے بھائی نے کیا ہے' بیشک! انھوں نے امام کی تعلیمات سے ایک حد تک اثر قبول کیا ہے لیکن اکثر و بیشتر جوہری پہلوؤں میں حد سے یہ اثر تجاوز کر گیا۔

علی عبدالرازق ۱۸۸۸ء میں مصر کے ایک درمیانی دیہات میں پیدا ہوئے دس برس کی عمر کے ہوئے تو جامعہ ازہر میں شریک ہوئے اس درسگاہ میں اپنے جد

ابتدائی سال انھوں نے بسر کئے وہ وہی سال تھے جن میں محمد عبدہ اور ازہر کے درمیان جو تعلقات و روابط تھے ان کا خاتمہ ہو گیا، علی اس وقت کمسن تھے، ان کی تحصیل کا ابتدائی دور تھا، اسی لئے ہم ان کے اور محمد عبدہ کے درمیان جو علائق و روابط تھے ان میں کوئی وزن قائم نہیں کر سکتے، لیکن خلوص و محبت کا جو رشتہ ان کے اور امام کے مابین محکم تھا اور ان کے بڑے بھائی کا امام کے اسباق میں حاضر رہنا ان دونوں نے ان کو امام سے شخصی تعارف حاصل کرنے کا موقعہ آسان کر دیا، اگر امام کے درمیان اور علی عبدالرازق کے باپ اور ان کے بھائی کے مابین تعلقات نہ ہوتے تو یہ تعارف ان کو میسر نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ علی عبدالرازق امام کے دروس میں بہت کم عرصہ تک شریک رہے، پھر شیخ احمد ابوخطوہ سے جو محمد عبدہ کے دوست تھے اور جو جمال الدین کے تلمیذ بھی تھے اسلامی قانون کی تعلیم پائی، ۱۹۱۰ء کی ابتدا میں دو یا تین سال کی مدت تک جامعہ مصریہ کے محاضرات (لیکچر) میں شریک رہے، یہاں پروفیسر نلینو کے ادب عربی کی تاریخ کے محاضرات اور پروفیسر سانتلا کے تاریخ فلسفہ کے اہم لیکچروں سے استفادہ کیا، ۱۹۱۱ء میں جامعہ ازہر سے شہادت عالمیہ حاصل کی اور اس کے دوسرے سال ازہر میں بلاغت اور اس کی تاریخی تبدیلیوں پر لیکچر دیئے، ۱۹۱۲ء میں انگلستان کا سفر کیا اور یہاں انگریزی زبان سیکھنے کے بعد اقتصادی اور سیاسی علوم میں علمی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ اکسفورڈ سے ملحق ہو گئے، لیکن جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے ایک سال سے زیادہ عرصہ کے بعد مصر کی طرف مجبوراً لوٹ گئے، اپنے وطن واپس ہونے کے بعد ۱۹۱۵ء میں محاکم شرعیہ میں قاضی مقرر ہوئے سب سے پہلے اسکندریہ کے دارالعدالت میں پھر اس کے بعد ملک کے دیگر عدالتوں میں کام کیا۔

اسکندریہ کے دوران قیام میں اسکندریہ کی درس گاہ میں جو جامعہ ازہر سے ملحق تھی عربی ادب اور تاریخ اسلام کا درس دیتے رہے اسی زمانے میں اسلامی قضائی تاریخ کا پیہم مطالعہ بھی جاری رکھا ۱۹۲۵ء کا زمانہ آیا تو اپنے ان دراسات کے نتائج اپنی ایک کتاب میں نشر کئے جو خلافت کے بارے میں لکھی تھی اور اس کا نام "الاسلام واصول الحکم" رکھا اس کتاب میں نظام خلافت کو منہدم کرنے کی دعوت دی ہے اور بعض ایسے جدید آراء و نظریات پیش کئے جنھوں نے ان کے خلاف رجعت پسندوں اور بالخصوص ارباب دین کو برافروختہ کر دیا، اس کتاب کو عظیم الشان اہمیت دی گئی، اس میں شدید جدل و مباحثہ کیا گیا اور اس کے مولف کو ہر طرف سے آماجگاہ تیر مطاعن گردانا گیا، تھوڑی ہی مدت میں اس کتاب کی تردید میں چند کتابیں لکھی گئیں جن میں سے شیخ محمد بخیت مصر کے سابق مفتی کی کتاب ہے (جس کا نام "حقیقۃ الاسلام واصول الحکم" ہے)

معاملہ بحث و جدل اور علی عبدالرازق پر سخت تلخناک تنقیدوں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ایک اور چیز تک تجاوز کر گیا، چنانچہ ۱۲ ر اگست ۱۹۲۵ء میں سربرآوردہ علماء کی ایک مجلس تادیبی طور پر شیخ ازہر کی صدارت اور سربرآوردہ علماء کی مجلس کے چوبیس ارکان کے روبرو ان الزامات و الہامات میں غور و خوض کرنے کے لئے منعقد ہوئی جو علی عبدالرازق اور ان کی کتاب پر عائد کئے گئے تھے، بالاجماع یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ یہ کتاب مخالف دینی امور پر مشتمل ہے، اس مجلس نے ثابت کر دیا کہ اس کتاب کے مولف نے ایسا مسلک اختیار کیا ہے جو "ایک مسلمان کے شایان شان نہیں چہ جائیکہ ایک عالم کے لئے سزاوار ہو" نیز مذکورہ مجلس نے مولف کو علماء کے زمرہ سے خارج کر دینے، جامعہ ازہر اور دیگر درسگاہوں کے رجسٹروں سے اس کا نام محو کرنے اس کو ملازمت سے برطرف کرنے اور اس کو کسی عمومی خدمت

کے فرائض، خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی، انجام دینے کی صلاحیت و اہلیت نہ رکھنے کی قرار داد پیش کی،

یہ مقدمہ قانون داں قاضیوں کی مجلس تادیب کے روبرو بھی پیش کیا گیا، علی عبدالرازق نے سربر آوردہ علمار کی مجلس کے عدم اختصاص کی مدافعت کی کیونکہ مجلس کی یہ عبارت "شہادت عالمیہ کے نامناسب" ایسے امور کی طرف اشارہ کرتی ہے جو شخصی سلوک کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن مجلس تادیب نے سربر آوردہ علمار کی مجلس کے اختصاص کا فیصلہ کیا کیونکہ "شہادت عالمیہ کے وصف کے ناموزوں" جو عبارت ہے بلا کسی قید کے مطلق وارد ہوئی ہے جس کو سلوک شخصی پر منحصر نہیں کیا جا سکتا،

جب علی عبدالرازق نے اپنی مدافعت میں کہا کہ ان کے لئے اعتقاد مطلق کی آزادی حاصل ہے جس کی کفالت ۱۹۲۳ء کے صادر شدہ دستور نے کی ہے تو مجلس تادیب نے اس کا جواب یہ دیا کہ حریت کی ضمانت محدود بالنص ہے کہ وہ قانون کی حدود میں ہو، دستور نے جس حریت کو ممنوع قرار دیا ہے وہ محض کسی دین یا کسی عقیدہ کے قبول کر لینے کے سبب سے جنائی محاکمہ یا وطنی حقوق کی محرومی ہے،

مزید برآں یہ کہ دستور کے احکام اس کے خلاف نہیں ہیں کہ ہر ادارہ کے لئے جیسا کہ ازہر ہے یا دوسری عدالتیں ہیں خاص ناموس اور معین قانون ہو جو علماء اور سرکاری ملازمین پر منطبق آتا ہو،

پھر مجلس تادیب نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ جس دن سے سربر آوردہ علمار کی مجلس نے علی عبدالرازق کو زمرۂ علماء سے خارج کرنے کی قرار داد پیش کی ہے اسی دن سے ان کو ملازمت سے معزول کر دیا جائے، چونکہ شرعی عدالتوں میں

عہدۂ قضاء علماء کے فرائض میں سے تھا یعنی یہ ایک دینی عہدہ تھا اسلئے سربرآوردہ علماء کی مجلس کی قرارداد کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی عبدالرازق کو ان کے منصب سے بھی معزول کردیا جائے، اس طرح ارباب دین نے اُن خوفناک جدید آراء و نظریات کا فیصلہ چکایا جن کو علی عبدالرازق نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا، اس سے بڑھکر انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ "اس خطرناک طریقہ کے نتائج سے جو مولف نے ایجاد کیا ہے خوف زدہ ہیں" ہم ذیل میں علی عبدالرازق اور رجعت پسندوں کے مابین جو اختلاف ہے اس کے جوہری اسباب و وجوہ کو مجمل طور پر بیان کرتے ہیں،

سب سے پہلے جس امر کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ علی عبدالرازق خلافت کو باعتبار اس کے اسلامی نظامات میں ایک نظام ہونے کے منہدم کردینا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت نظری نقطۂ نظر سے ایک عام ریاست ہے جو دینی و دنیوی امور میں آنحضرت صلعم کی نیابت میں انجام دی جاتی ہے یہ ریاست ان لوگوں کی تھی جو مسلمانوں کے معاملات و امور کی تولیت میں آنحضرت صلعم کے جانشین ہوئے، چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو دینی و دنیوی معاملات میں علی الاطلاق حکمراں قرار دے لیا، ان کی سلطنت اور ان کے اس اقتدار و حکمرانی کو صرف شرعی حدود ہی مقید کرسکتے ہیں، پھر مولف کہتے ہیں لیکن ہم جب اُن تمام دلائل کو معیار صحیح پر پرکھتے ہیں جو عام طور سے خلافت کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں تو ہمیں یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ وہ حکومت کی قسموں میں سے اس خاص قسم کی حکومت کی تائید کے لئے کافی نہیں ہیں،

علی عبدالرازق کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت یہی دونوں رہبری و رہنمائی کے لئے اولین سرچشمے ہیں، ان میں محض غیر محدود و عام عبارتیں پائی جاتی ہیں، اگر تم ان کو ان کے صحیح نقطۂ نظر سے سمجھو گے تو مویدین خلافت کے دعویٰ کی کسی

صورت سے تائید نہ کرو گے، پھر مولف اُس دلیل سے بحث کرتے ہیں جو صدر اول سے مسلمانوں کے اجماع کی سند میں پیش کی جاتی ہے کہ خلیفہ کا تقرر امتہ اسلامیہ پر فرض ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اجماع کا اثبات ایک تاریخی حقیقت کی طرح ممکن نہیں، کیونکہ خلافت اسلامیہ کا مقام اسلامی باغیوں اور منکروں کا نشانہ بنا رہا، اس کی مخالفت کے مختلف ادوار رونما ہوئے، جو کبھی اسلام کو تقویت بہم پہنچاتے اور کبھی کمزور کرتے، کبھی اس کی اہمیت وعظمت کو دوبالا کرتے اور کبھی اس طرح گذر جاتے کہ ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا، یہی حال خلفاء راشدین کے چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب کے عہد سے ترکی کی جماعت اتحاد و ترقی کے دور تک رہا، یہ مخالفتیں اور عوارض اجماع کے دعویٰ کو غیر صحیح ثابت کرتے ہیں اور اس کی تردید کرتی ہیں کہ اجماع منعقد ہوا تھا،

پھر اس دلیل کا تجزیہ کرتے ہیں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ امام کے انتخاب و تقرر ہی پہ دینی قوانین و احکام اور رعایا کی اصلاح و فلاح کے اظہار کا دار و مدار ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ:

"اگر فقہاء کا امامت و خلافت سے وہ منشاء ہے جس کو علماء سیاست حکومت سے تعبیر کرتے ہیں تو ان کا یہ قول صحیح ہے کہ شعائر دینی کو قائم کرنا اور رعایا کی صلاح و فلاح یہ دونوں اس خلافت پر منحصر ہیں جو حکومت کے معنی میں ہے، خواہ یہ حکومت کسی شکل اور کسی قسم کی کیوں نہ ہو... لیکن اگر وہ خلافت سے ایک خاص قسم کی حکومت جس سے وہ روشناس ہیں مراد لیتے ہیں تو ان کی دلیل ان کے دعوے کی نسبت بہت کوتاہ اور ان کی حجت ناکافی ہے"

آگے کہتے ہیں

"معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ اسی دین کے لئے کبھی یہ نہیں چاہتا جس کی لقاء حیات کا ذمہ اس نے اپنے اوپر لیا ہے کہ اس کی عزت و ذلت ایک خاص حکومت سے متعلق ہے اور نہ ہی خدا کا منشا ایک خاص قسم کے امراء سے ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اپنے مسلمان بندوں کیلئے یہ چاہتا ہے کہ ان کا بننا بگڑنا خلافت کا رسن بن جائے اور نہ ہی نہ اس کون و فساد کو خلفاء کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتا ہے"

"لہذا معلوم ہوا کہ ہمیں نہ تو اپنے دینی امور کے لئے اور نہ اپنے دینوی امور کیلئے اس قسم کی خلافت کی ضرورت ہے اگر ہم چاہیں تو اس سے بھی زیادہ کہہ لیں کیونکہ خلافت اسلام اور مسلمانوں کے لئے نکبت و زوال کی جڑ اور شر و فساد کا سرچشمہ بن گئی تھی اور رہے گی"

علی عبدالرازق اور رجعت پسندوں کے درمیان اختلاف کا دوسرا سبب یہ ہے کہ خلافت کا نفس خیال بہ اعتبار اس کے دینی و دینوی امور میں نبی علیہ السلام کی نیابت میں عام ریاست ہونے کے ہے جو نبی علیہ السلام کے وظیفہ اور طبیعت رسالت کے لئے غیر صحیح تصور پر مبنی ہے پھر وہ اس امر سے آگاہ کرتے ہیں کہ یہ بہت مشکل ہے کہ ہم نبی علیہ السلام کی حکومت کے متعلق کسی شئے کو قطعی طور پر تسلیم کریں کیونکہ اس موضوع میں غموض و ابہام محیط ہے

"باقی رہے وہ امور جو نظام قضاء سے متعلق ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی علیہ السلام کے حضور میں بعض نزاعات پیش ہوئے جن کا آپ نے فیصلہ کیا لیکن قضاء نبوی میں سے جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں ان میں اس قضاء کی نہ تو کوئی بیّن شکل و صورت پائی جاتی ہے اور نہ اسکا کوئی نظام تھا خواہ اس کا نظام ہی کیوں نہ رہا ہو"

"قضاء کے علاوہ دیگر حکومتوں کے اعمال اور ان کے اساسی فرائض و واجبات بھی عہد رسالت میں واضح طور پر موجود نہ تھے

پھر مصنف نے ان مختلف اقوال پر بحث کی ہے جو ممکن ہے کہ اس کیلئے سبب ہوں لیکن وہ صرف ایک علت و سبب پر رضامند ہیں وہ یہ کہ محمد ؐ نے حکومت کے قیام کی کوشش نہیں کی اور نہ یہ آپ کی رسالت کا جزء تھی چنانچہ آنحضرت صلعم صرف ایک پیغمبر تھے خالص دینی دعوت کے لئے، جس میں نہ کسی ملوکیت کا شائبہ تھا اور نہ کسی حکومت کی دعوت آمیز تھی' نیز یہ کہ آنحضرت صلعم کے لئے نہ کوئی ملک تھا اور نہ حکومت' آنحضور صلعم نے کسی ایسی مملکت کی تاسیس کے لئے جو اس لفظ کی سیاست اور اس کے مرادفات سے مراد لی جاتی ہے کوشش نہ کی' آپ محض اپنے پیش رو رسولوں کی طرح ایک رسول تھے' نہ آپ بادشاہ تھے نہ کسی سلطنت کے موسس' اور نہ کسی مملکت کے داعی'

آپ کی امت کے لئے آپ کی انتہائی طاقت و قوت اور آپ کے قول کا مکمل نفوذ و اثر نبوت کی قوت اور رسالت کی طاقت تھی' یہ وہ مقدس قوت ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ مخصوص ہے' اس میں ملوکیت کا کوئی معنی و مفہوم نہیں پایا جاتا نہ بادشاہوں کی قوت اس کے مشابہ ہے اور نہ کوئی شہنشاہ اس کی برابری کرسکتا ہے'

یہ دعوت الی اللہ اور اس کے پیغام کو پہنچانے کی زعامت ہے کسی بادشاہ کی زعامت نہیں' یہ محض پیغام اور دین ہے' اور نبوت کا حکم ہے' بادشاہوں کا فرمان نہیں"

دینی اقتدار اور دنیوی بادشاہت کے فرق کو واضح کرنے اور اول الذکر کو نبی کے لئے بجز موخر الذکر کے مخصوص کرنے کے لئے مولف عود کرتا ہے اور پڑھنے والے

کو چکنا کرتا ہے کہ:

"ان دونوں حکومتوں کو مخلوط نہ کیا جائے اور نہ دونوں ولایتوں کا حکم اس پر مشتبہ نہ رہے، ایک ریاست رسول بحیثیت اس کے رسول ہونے کے اور دوسری بادشاہوں اور امرا کی ریاست"

حقیقت یہ ہے کہ علی عبد الرازق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے جو اصول و قواعد اور آداب و قوانین پیش کئے ہیں ان میں ایسی چیزیں ہیں جو قوموں کی زندگی کے مظاہر سے مس کرتی ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ:

"اگر تم ان تمام کو اکٹھا کر لو تو یہ تمام ایک مختصر سا جزو بھی نہیں بن سکتے جو کسی متمدن یافتہ حکومت کے لئے سیاسی اصول و قوانین کو لازم ہوا کرتے ہیں، یہ حکومتی اعمال میں سے نہیں ہیں بلکہ ان وسائل میں سے ایک وسیلہ ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین کو مستقیم کرنے اور دعوت کی تائید کے لئے ملجا قرار دیتے تھے"

اس طرح علی عبد الرازق دین و دولت کے مابین اسلام کی جوہری طبیعت میں امتیاز اور حد فاصل کی اساس قرار دیتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ چونکہ نبی علیہ السلام کی زعامت دینی تھی سیاسی نہیں اس لئے آپ کی سلطنت کے جانشین کا تصور آپ کی ذات سے اس امر کو ساقط کر دیتا ہے کہ آپ نبی تھے اور ایک خاص رسالت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، آپ نے اس رسالت کا فریضہ ادا کر دیا جب کہ دین مکمل ہو گیا اور اسلام کے پیروؤں کے درمیان وحدت دینی کی تکمیل کر دی، آپ کی رحلت کے ساتھ ہی رسالت ختم ہو گئی زعامت کا بھی خاتمہ ہو گیا، کسی کو روا نہیں کہ وہ آپ کی زعامت کا جانشین ہو، جیسا کہ یہ کسی کے لئے جائز نہیں کہ آپکی رسالت میں آپ کا جانشین ہو،

اس کے علاوہ کسی دینی زعیم و پیشوا کی ضرورت ہی نہیں جو نبی علیہ السلام کا خلیفہ بنے کیونکہ آنحضرت صلعم کے لئے کوئی سیاسی زعامت نہ تھی جو آپ کے بعد کوئی آپ کا جانشین بنے، اس امر کی دلیل کہ اس سے آپ کا منشا یہی تھا یہ ہے آپ نے اپنے بعد کسی خلیفہ کو نامزد نہیں فرمایا جب آپ رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے تو مسلمانوں نے دیکھا کہ اپنے عہد گزشتہ پر عود کرنا ان کے لئے ناممکن ہے اور ان کو حکومت کی کوئی شکل اختیار کرنا لازمی ہے تو انھوں نے حضرت ابوبکر سے بیعت کر لی تاکہ آپ ان کے معاملات کو سنبھالیں اور ان کی جمیت کے شیرازہ کو نہ بکھرنے دیں لیکن آپ کی یہ بیعت کسی معنیٰ سے بھی دینی نہ تھی، بلکہ یہ صرف ایک سیاسی حکومت تھی، اسی قالب میں جدید سلطنت ڈھالی گئی جس کی مسلمانوں نے تشکیل کی تھی،

اس کے علاوہ یہاں بہت سے ایسے اسباب پائے گئے، جو حضرت ابوبکر اور آپ کے مابعد خلفاء کو خلیفہ رسول اللہ کے لقب سے نامزد ہونے کا باعث ہوئے پھر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ لقب ایک دینی رنگ اختیار کر گیا، اور سلاطین نے اس غلطی کو چند اسباب کی بنا پر جو غیر مخفی ہیں لوگوں کے درمیان رائج کر دیا،

چونکہ نبی علیہ السلام کی حکومت روحانی تھی جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اس لحاظ سے آپ کے پیروؤں کی ہدایت کے لئے جو قانون آپ نے پیش کیا ہے وہ محض خالص دینی قانون ہے جس سے انسان اور اس کے پروردگار کے مابین تعلقات کی تنظیم کا قصد کیا گیا۔ باقی رہے دنیوی معاملات اور تمدنی مصالح و ضروریات تو شریعت کا ان میں کوئی دخل نہیں اور نہ یہ اس کے مقاصد میں داخل ہے،

"جن چیزوں کو اسلام نے مشروع قرار دیا اور جن کے ذریعہ نبی علیہ السلام

نے مسلمانوں کے نظامات اور قواعد و آداب اور تعزیرات پیش کیے ہیں، وہ محض ایک دینی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور انسان کی دینی مصلحت کیلئے خالص ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ ان کا مقصد نہیں،

باقی رہے تمدنی قوانین تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ہماری عقول کے درمیان خلا رکھا ہے، اور لوگوں کو ان کے انتظامات میں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی عقلوں کی ہدایت و تجربات پر عمل پیرا ہوں" دنیا کے ابتدائی سرے سے لے کر اس کے انتہائی سرے تک اور اس کے اندر جو کچھ اغراض و مقاصد ہیں ان کا انتظام اللہ کے نزدیک بہت آسان ہے، لیکن اللہ نے انسان کے اندر عقلی قوت بھی عطا کی ہے اور ان انتظامات کو اسی پر چھوڑ دیا ہے"

اس طرح مولف اسلامی تمدنی زندگی کو شرعی احکام کے قیود اور ان کے لئے جو تقدیس و دوام کی صفت ہے اس سے آزاد کرانا ہے۔ اس کا منشا شریعت کی اصلاح نہیں جیسا کہ المنار کا خیال تھا جو مولف کے ساتھ اس قول میں ہمنوا ہے کہ شریعت میں جمود پیدا ہو گیا اور اس کا برا نتیجہ ظاہر ہو گیا ہے، لیکن وہ یہ دعوت دیتا ہے کہ شریعت کو بہ اعتبار اس کے تمدنی نظامات کے سختی سے چھوڑ دیا جائے

مولف جس آخری نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ

"دین میں کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کو تمام علوم اجتماع اور سیاست میں دوسری قوموں پر مسابقت کرنے سے روکے اور وہ اس فرسودہ نظام کو منہدم کر دیں جس کے آگے انھوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے اس کے بجائے اپنے ملکی قوانین اور اپنی حکومت کے ضوابط و نظام کو نئے پیمانہ پر جو انسانی عقول کا نتیجہ ہیں اور محکم اساسوں پر جن پر قوموں کے تجربات شاہد ہیں کہ وہ بہترین اصول حکومت ہیں تعمیر کریں"

علی عبدالرازق نے خلافت کو منہدم کر دینے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اس اسلامی عام عقیدہ کے بیّن مخالف ہے جس نے نظریۂ امامت کو ملحوظ رکھا چنانچہ وہ اسی کی زیر سرپرستی عصر حاضر تک زندہ و پائندہ ہے، اگرچہ تاریخی خلافت بذات خود کئی صدیوں سے روپوش ہے۔

در حقیقت علی عبدالرازق نے جو آرائے پیش کی ہے وہ ان کو سربرآوردہ علماء کی مجلس کے فیصلہ کے مطابق خوارج کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے نہ کہ جمہور مسلمین کے گروہ میں۔

یہاں ہمیں یہ اشارہ بھی کر دینا ضروری ہے کہ علی عبدالرازق اس موضوع میں المنار کے مخالف ہیں، چنانچہ المنار اہل السنۃ کا موقف اختیار کرتا ہے، رشید رضا نے اپنی حجت کی تائید خلافت کے لئے اپنی کتاب میں قرآن اور حدیث اور اجماع سے اپنے مالوفہ طریقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رشید رضا نے انتخاب خلیفہ، حکومت شوریٰ اور جمہوری حکومت کے بارے میں اپنی حسب عادت جن آراء و افکار کا اظہار کیا ہے اور ان کی مدافعت کی ہے وہ وہی آراء ہیں جن کو دور حاضر کی سیاسی تفکیر میں بہت زبردست اثر و نفوذ پیدا ہو گیا ہے، جن کے متعلق رشید رضا کا یہ خیال ہے کہ اسلامی اصول و قواعد جیسا کہ ان کو آپ نے سمجھا ہے تمام ضروریات زندگی پر مشتمل و بسیط ہیں، رشید رضا کا نظریہ ہے کہ ان تمام امور کی تکمیل و تحقیق صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ نظام خلافت کی حفاظت کی جائے، پھر آپ اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ جو ابتدائی ظاہری اور ہنگامی تجویز قرار دی گئی ہے اس کے اعتبار کو چھوڑ دیا جائے، اور کسی امر مبرم سے قطع نظر نہ کیا جائے نیز خلافت کا معاملہ ایک موتمر اسلامی کے حوالے کر دیا جائے جو تمام امم اسلامیہ کے ممتاز

نمائندوں سے تشکیل پذیر ہو'

چنانچہ اس قسم کی موتمر بالفعل ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوئی۔ اس کے روبرو رشید رضا نے موجودہ دور کی مناسبت سے خلافت کا نظام پیش کیا جو خلیفہ کے علی الاطلاق اقتدار کی حدبندی کرے اور اس کی بیعت پر امم اسلامیہ کے اجماع کا کفیل و ذمہ دار ہو

آپ کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ ایک ایسے مدرسہ کی تشکیل تھی جہاں سے ایسے خلفاء اور مجتہدین فارغ ہو کر نکلیں جن میں شرعی طور پر اہل حل و عقد کے صفات اور قضاء شرعی کی شروط جمع ہوں اور مملکت خلافت میں حکومت کے احکام و نظامات تشریح اسلامی کی بنیادوں پر رکھے جائیں جو المنار کے مباحث پر متفق ہے'

"باقی رہیں وہ اسلامی جماعتیں جو اپنی حکومت میں مستقل اور آزاد نہیں ہیں اور نہ سلطان خلافت کے احکام کی اتباع پر قادر ہیں تو ان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات مثلاً اسلام کے خالص دینی پروپیگنڈہ، اس کے دفاع، اس کو الحاد وجود سے محفوظ کرنے، بدعتوں اور خرافات سے بچانے، دینی طریقہ تعلیم جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا رواج اس کے علاوہ احسان و تقویٰ کے کاموں پر باہمی تعاون اور مخلوق کی بھلائی کے لئے سیاسی کاموں وغیرہ میں شغف و انہماک میں مرکز خلافت سے مربوط و وابستہ رہے'

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ علی عبدالرازق دین و دولت کے مابین تفریق اور تمدنی امور میں احکام شریعت کی پابندی سے اعراض کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہ اپنے اس دعوے میں اس اسلامی فکر سے متصادم ہیں، جو یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ محمد صلعم نے جس طرح دین کی تکمیل کی ہے اسی طرح دولت کو بھی قائم کیا ہے، لامحالہ نظام

شریعت، شرع کے مقدس فرائض میں سے ہے جس سے مدنی زندگی اور دینی زندگی دونوں میں بھی اکتساب ضروری اور واجبی ہے،

سربرآوردہ علماء کی مجلس نے علی عبدالرازق نے اپنے نظام فکر کے لئے جو روش اختیار کی ہے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے بیان کیا ہے "انھوں نے اپنا ایک علمی مذہب پسند کرلیا ہے"

لیکن محمد عبدہ باوجودیکہ دینی عبادات کی روحانیت پر اصرار کرتے ہیں لیکن آپ اسلام کے تمدنی اقتدار اور دینی اثر ونفوذ کی وحدت کی مدافعت کرتے اور یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ شریعت کے اصول کی حفاظت اور ان میں عظیم پیمانہ پر اصلاح کیجائے المنار صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ "دین سے حکومت و دولت کو جدا کردینے کا دعوی کرنا گویا لامحالہ کائنات سے حکومت اسلامیہ اور اس کے غلبہ واقتدار کو نیست ونابود کرنا اور عرصۂ وجود سے شریعت اسلامیہ پر خط نسخ پھیر دینا' اور مسلمانوں کو ایسی قوم کا تابع بنا دینا ہے جن کے دین کا کوئی جادۂ مستقیم نہیں ہے...... ہم اور عیسائی اس معاملہ میں دو متضاد و متناقض گوشوں پر ہیں کیونکہ اگر ہم ان کی پیروی کریں تو گویا ہم نے اپنا نصف دین چھوڑ دیا۔

محمد عبدہ کی تعلیمات کے درمیان اور علی عبدالرازق کے آراء و نظریات کے مابین اگر کسی قسم کا ربط و تعلق ہے تو ان دونوں کے مابین جو روحانی اور عقلی مشابہت ہے اس میں عام طور سے بحث کرنا چاہیئے نہ کہ کسی خاص اور معین امر میں،

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں بہت سے ایسے مشابہت کے پہلو ہیں جو غالباً اس امر کی دلیل ہیں کہ علی عبدالرازق محمد عبدہ کے آراء وافکار سے گہرے طور پر متاثر ہوئے اور ان کی روح نے ان سے اکثر وبیشتر سیرابی حاصل کی ہے،

چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی جس میں تاریخی پہلو سے روشنی

ڈالی ہے اور خلافت کا صدر اسلام سے مطالعہ کیا ہے وہ اپنے اس نہج میں اس طریقہ کے مشابہ ہیں جن کو محمد عبدہ نے اُس وقت اختیار کیا جب کہ وہ تاریخی مقدمہ لکھا جس کو رسالۂ توحید میں درج کیا ہے'

علی عبدالرازق محمد عبدہ کی طرح اسلام کا باعتبار اس کے روحانی دین ہونے کے تصور کرتے ہیں' اگرچہ وہ دین و دولت کے مابین حد فاصل قائم کرتے ہیں جس کے محمد عبدہ قائل نہ تھے پھر وہ آپ کی طرح تسلیم کرتے ہیں کہ تمام انسانوں کا ایک ایسے واحد اور عام دین کے مطیع و منقاد ہو جانا ممکن ہے جو ان کی باہمی ترکیب و تالیف کرتا اور ان کو وحدت دینیہ میں منسلک کر دیتا ہے اگرچہ وہ اپنی سیاسی وحدتوں میں مختلف کیوں نہ ہو' وہ محمد عبدہ کی طرح اُن اشخاص کی مخالفت کا جذبہ رکھتے ہیں جو دین کو صرف اسی کی جامد شکل و صورت سے جانتے ہیں' نیز وہ آپ کے استقلال الفکر اور آپ کی وسعت نظر میں آپ کے مشابہ ہیں'

لیکن ہمارے دل میں یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ علی عبدالرازق کے آراء و نظریات میں انتہائی آزادی ہے اور جو قدیم روایات و شعائر پر شدید بغاوت کا علم لہراتے ہیں ان کے طریقہ تنقید میں اور مورخین کے مذاہب و نظریات کو پختہ سمجھنے اور اسلام کے سوانح نگاروں کے مناہج و اسالیب کے اختیار کرنے اور اسی طرح خلافت کے موضوع کو ایک عام شکل میں بحث کرنے میں مغربی علم کے آثار جھلکتے ہیں'

وہ اُن مصادر و ماخذات کی طرف رخ کرنے میں جن کی طرف انھوں نے اپنی بحث میں علمی تنقیدی طریقہ اختیار کرنے کی غرض سے رجوع کیا اور عصر حاضر کی ضروریات و مقتضیات کی رعایت کو ملحوظ کرنے کے جذبہ میں ان تجاوز پسند مجددین کے مشابہ ہیں جن کے نمائندے ڈاکٹر طہ حسین ہیں'

یہ المنار کی نظر میں دین کے دشمن ٹھہرے حالانکہ ان سے توقع تھی کہ وہ الحاد کے

فتنوں کا مقابلہ کرنے اور دہریت کے سیلاب کی روک تھام کے لئے بہترین رفیق و مددگار ہونگے،

لیکن ہم کسی قدر اعتماد و اطمینان کے ساتھ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ علی عبدالرازق اپنی روح اور اپنی عقل میں استاذ الامام کی طرف منسوب ہوتے ہیں، وہ اور ان کے بھائی مصطفیٰ عبدالرازق باوجود ان دونوں کے درمیان فہم و تاویل میں جوہری اختلاف ہونے کے، یکساں اُس تحریک کے جدید آزاد انقلاب کی نمایندگی کرتے ہیں جسے محمد عبدہ نے رونما کیا تھا،

اس قسم کا قطعی فیصلہ کرنا اُن تجدد پسند حضرات کے حق میں نہایت دشوار ہے جن کے آئینہ دار ڈاکٹر طٰہ حسین ہیں، لیکن ہم اس کے باوجود ان کے مقاصد و اغراض اور ان کے ان خاکوں میں سے جس کو انھوں نے اپنا نصب العین قرار دیا اکثر و بیشتر اجزا کا انکشاف کر سکتے ہیں جن سے اس امر کا ثابت کرنا ممکن ہے کہ وہ محمد عبدہ اور آپ کے عمل کے قرض دار ہیں،

اگر ہم یہ فیصلہ کریں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ نیا اسکول بذات خود اپنے وجود کے لئے استاذ الامام کے رہین منت ہے، اور اکثر و بیشتر جوہری امور میں آپ ہی سے مشتق اور آپ ہی سے صادر ہوا ہے۔

خاتمہ لقلم معرّب

۱۹۲۷ء میں ہمارے جلیل القدر فاضل استاد شیخ مصطفیٰ عبد الرازق نے بعض مستشرقین مثلاً رینان، توفیل، گوئٹے اور لالچیا کے آراء و نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے اسلامی فلسفہ پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا تھا، مذکورہ بالا مستشرقین کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ دو گروہ میں منقسم ہیں ان میں سے ایک سامی النسل ہے اور دوسرا آریائی، انھوں نے ان دونوں میں سے ہر ایک کے عقلی مزاج کی خصوصیات کے استنباط کی کوشش کی ہے، پھر بعض کا خیال یہ ہے کہ سامی فکر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ متناسب و غیر متناسب اشیاء کو بدون ارتباط باہمی کے اکٹھا کر دیتی ہے، لیکن آریائی فکر اشیاء کے مابین باہمی ارتباط کے ذریعہ تشکیل دیتی ہے اور وہ صرف تدریجی طور پر ہی ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہوتی ہے،

ہمارے فاضل استاد ان نظریات میں بہت تفصیلی بحث کرتے تھے تاکہ یہ ثابت کریں کہ سامی اور آریائی مزاجوں کے درمیان تفریق کا مسئلہ اور وہ آراء و نظریات جن کے بعض مستشرقین دلدادہ ہیں، محض قومیت کی طرح حقیقت میں علم کی بہ نسبت زیادہ تعصبیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، پھر آپ بیان کرتے

ہیں کہ یہ تمام نظریات اسی طرح جاری رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انسان کے نفوس سے نسلی عصبیت کو مٹا دے گا،

میں اس دلنشیں گفتگو کی طرف دھیان جائے ہوئے تھا، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کس لئے ہمارے فاضل استاد ایسے رجحان کی بحث پر جو علم کی طرف منسوب ہے۔ اس قدر توجہ مبذول کرتے ہیں؟ یہ رجحان درحقیقت صرف نسلی عصبیت ہی کو اجاگر کرتا ہے،

پھر میں نے "مصر میں اسلام اور تجدید" نامی کتاب پڑھی اور مجھے معلوم ہوا کہ سید جمال الدین افغانی نے اُس دعویٰ کی مخالفت کی جب کہ رینان نے اس کو پیش کیا تھا، ادھر محمد عبدہ نے ہانوتو کے قول کی تردید کی اور اس کے لبوں پر مہر سکوت طاری کر دی، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے استاد جو امام محمد عبدہ کے شاگرد ہیں، ہمارے نفوس میں وہی روحانی چنگاری روشن کرنا چاہتے تھے جس کو آپ نے اس سے قبل اپنے استاد سے حاصل کیا تھا،

میں نے یہ کتاب دوبارہ نہایت توجہ اور غور و خوض سے پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ ہماری قریب کی تاریخ کے ایسے گوشے کو اجاگر کر رہی ہے جس کی تشکل و صورت مبہم اور دھندلے طور پر ہمارے ذہن میں ہے، میں نے دیکھا کہ یہ کتاب اس کے ساتھ ساتھ علمی بحث کے لوازم سے آراستہ ہے اور اس میں حسن ترتیب، درجہ بدرجہ افکار، اور موضوع بحث کا احاطہ، فیصلہ میں انصاف کا لحاظ اور جنسی و دینی خواہشات و جذبات سے بُعد وغیرہ یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں،

ان تمام محاسن کی وجہ سے میرے دل میں اس کتاب کو ہماری زبان میں منتقل کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ میں نے ڈاکٹر چارلس آدمس کو اور جامعہ امریکہ کو جس نے اصل انگریزی مسودہ شائع کیا ہے خط لکھا اور کتاب کے ترجمہ کی اجازت

طلب کی، جامعہ نے اجازت دیتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر آدمس نے دو امور کا مطالبہ کیا ہے،

ایک یہ کہ میں کتاب میں جو نصوص و عبارات آئی ہیں ان کو اصل عربی ماخذات و اصول سے مقابلہ کروں پھر جو کچھ اس کے اندر نقل کی فرو گذاشتیں اور محاکمہ کی غلطی پاؤں اس سے ڈاکٹر صاحب کو آگاہ کر دوں،

دوسرا امر یہ تھا کہ انھوں نے اصرار کیا ہے کہ میں عربی دانوں کے روبرو اس امر کی تصریح کر دوں کہ ڈاکٹر صاحب نے نئے طبقہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو مختصر کر دیا ہے کیونکہ بحث کے گوشوں میں سے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا ان کا منشا تھا وہ پہلو محمد عبدہ کی تعلیمات اور جدید اسکول کے مصنفین کے درمیان تعلقات کے وجود کا امکان ہے، نیز یہ کہ وہ کسی ایسی رائے سے جو ان کی نظر میں غلط ثابت ہوتی ہو عدول کرنے سے پس و پیش نہ کریں گے،

درحقیقت کتاب میں غلطیاں بہت کم ہیں، اور وہ بھی ایسے مسائل میں ہیں جو جوہر موضوع سے متعلق نہیں،

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ پروفیسر آدمس جدید مصری ارتقا و نہضت کے اصول کو چند ایسے خارجی موثرات پر منحصر کرتے ہیں جن میں ملک کو کوئی دخل نہیں چنانچہ وہ اس کے قائل ہیں کہ "مصری اصلاح کی تحریک کا پہلا جذبہ بذات خود مصر سے پیدا نہ ہوا بلکہ وہ جمال الدین کی تعلیم کا نتیجہ اور آپ کے آثار کا ایک اثر تھا" جس پر دوسرے مقام پر کہتے ہیں "مصری اصلاح کا دھارا اگرچہ نیل کی طرح سرچشموں سے ابل پڑا لیکن وہ ملک کے حدود سے متجاوز نہ کر گیا، اس کی قسمت میں تھا کہ اس کا فیضان کامل مصری نہروں میں پورا ہو جائے (ص ۲۰)

لیکن میں پروفیسر آدمس کی اس رائے پر متفق نہیں ہوں، کیونکہ مصر

اس کے علاوہ دیگر قوموں کی طرح اس کے اپنے ذاتی عناصر ہیں، اس میں وہ عوامل ہیں جو اس کو سامنے کی طرف ڈھکیل دیتے یا اس کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتے ہیں میں یہ اعتقاد کبھی نہیں رکھتا ہوں کہ کوئی زعیم و پیشوا خواہ اس کی روحانی قوت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کسی قوم کو بام ارتقا پر گام فرسا کر سکتا ہے یا اس کے اندر نہضتِ جدیدہ کی لہر دوڑا سکتا ہے تا وقتیکہ اس کو اس سے بیشتر ایسے شروط و اسباب نہ فراہم ہو جائیں جو اس کو اس کی دعوت کے قبول کرنے کے لئے مستعد و آمادہ کرتے ہیں، نشو و نما کے لئے صالح زمین کی ضرورت ہے تاکہ اصلاح کے جو بیج اس میں ڈالے گئے ہیں وہ بارآور ہوں،

مصر کی نہضت جدیدہ کے اصول کو ہم فی الواقع محمد علی پاشا کے عہد کی طرف لوٹا سکتے ہیں، کیونکہ مصر میں یورپی طرز پر مدارس قائم کئے گئے تھے جن میں حکام و عہدہ داروں کے لڑکوں کو تعلیم دی جاتی تھی، محمد علی پاشا نے یورپ کی طرف بہت سے علمی وفود بھیجے، جنھوں نے اہل مغرب کے علوم ان کے عادات و رسوم میں سے اکثر و بیشتر حصہ کا اکتساب کیا، اور ایک ایسے ملک میں جدید علمی تحریک رونما کرنا شروع کی جس میں تعلیم اس سے پیشتر دیہاتوں تک پھر یہاں سے جامعہ ازہر کے وسیع ہال تک ہی متجاوز تھی۔

عباس اول اور سعید حلمی پاشا کے عہد میں مسلسل علمی وفد روانہ کئے گئے، اس کے نتیجہ میں نئے مدارس قائم کئے گئے چنانچہ مصر میں مفکرین کے دو گروہ بن گئے، ایک گروہ قرون وسطیٰ کے مناہج تفکیر اختیار کرتا تھا اور شدت سے اس کا پابند تھا، دوسرا گروہ مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوب ہو گیا اور اس سے بڑی حد تک متاثر ہوا اس نے اپنی تفکیر، اپنے عادات و اطوار اور معاشی اسلوب میں انگریزی طرز اختیار کرنے کی کوشش کی۔

مصری ثقافت کے ماحول میں قدیم وجدید طبقہ کا ظہور ہوا، مختلف طبقات نے ان دونوں رجحانات کے میدان میں اپنی جولانی دکھانی شروع کی، چنانچہ قدیم طبقہ اپنے اثر واقتدار پر تمسک کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس میں اس کا زیادہ تر اعتماد اس دلیل وحجت پر تھا جو دین کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن جدید طبقہ زندگی اور زندگی کی نئی حاجات وضروریات کے ساتھ خود کو مطابقت کرنے کی سعی کوشش کرتا تھا۔

جب کسی ملک میں علمی ثقافتیں مختلف، نقاط نظر جداگانہ اور مناہج تفکیر گوناگون ہوا کرتے ہیں تو باہمی کشمکش ہنگامہ آرائی اور اصلاح کا خیال اور قدیم وجدید کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کا ہونا ضروری ہے یہی چیز ہم ازہر کی تاریخ میں پاتے ہیں، چنانچہ اس کی اصلاح کا خیال محمد علی پاشا کے زمانے ہی سے پایا جاتا ہے اور اسمٰعیل پاشا کے دور سے یہ خیال بارآور ہونا شروع ہوا، اس کی اصلاح کے لئے شیخ محمد عباسی مہدی نے امداد کی جو اس وقت شیخ ازہر تھے۔

جمال الدین سے روشناسی سے پہلے سادات اور نوجوانوں سے انصال سے بیشتر اور علمی، دینی، اور سیاسی دعوت سے قبل مصر میں اصلاحی تحریک موجود تھی، ارتقاد نہضت کے مقدمات ومبادی عرصۂ طویل سے شروع ہو چکے تھے، لوگوں کے دلوں میں قدیم سے کنارہ کشی اور جدید سے رغبت پیدا ہو گئی، جب جمال الدین مصر میں آئے اور نوجوان تشنگان علم آپ سے منصل ہو گئے تو آپ کو آپ نے اپنی طرف جذب کر لیا اور سب آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے ارتقاد نہضت کی آگ بھڑک رہی تھی، لیکن ابھی یہ آگ راکھ کے ڈھیر میں دبی پڑی تھی جمال الدین نے اس آگ کو ہوا دی اور اس میں اپنی روح پھونک دی، تو یہ نہضت اپنے طبعی راستے پر چل پڑی جمال الدین کو یہ فضیلت و برتری

حاصل تھی کہ آپ نے اس نہضت وارتقاء کی رفتار تیز کردی، یہ نہضت خالص مصری رنگ لئے ہوئے تھی، وہ ایسے سرچشموں میں سے نہ تھی جو ملک کے حدود سے تجاوز کرجائیں،

چارلس آدمس پہلے مصنف نہیں ہیں جنھوں نے محمد عبدہ کی زندگی اور آپ کے آثار پر خامہ فرسائی کی، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اولین شخص ہے جس نے ہمارے جدید اسکول اور ہماری نوخیز نہضت وارتقاء میں محمد عبدہ کے اثر کو تلاش کرکے یہ نئی توجیہ پیش کی۔

ہمارے مصنفین نے استاذ الامام کے متعلق جو حکم لگایا ہے اور ہماری جدید تفکیر اور موجودہ زندگی کے بارے میں آپ کے اثر کی وسعت کا جو اندازہ انھوں نے لگایا ہے اس میں بہت اختلاف ہے، لیکن جو کچھ ہو اس سے کوئی انصاف پسند مصنف و مضمون نگار ہرگز انکار نہیں کرسکتا کہ امام ہی اولین ہستی ہیں جنھوں نے مصر میں حریت فکر کے بندھن کھولے ہم حریت تفکیر اور حریت انشاپردازی میں استاذ الامام کے رہین منت ہیں،

عباس محمود

ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ
مارچ ۱۹۳۵ء

ماخذات کتاب

(ا) جمال الدین سے متعلق

تاریخ صحافۃ عربیہ : فیکونٹ فیلیپ دی طرازی - بیروت، مطبع ادبی ۱۹۱۳ء
ص ۲۹۳ - ۲۹۹

مشاہیر الشرق : جرجی زیدان - ج ۲، ص ۵۲ - ۶۱، یہ سوانح - اپریل ۹۷
کے الہلال سے ماخوذ ہے، نیز یہ رسالہ الرد علی الدہریین قاہرہ
سنہ ۱۹۲۵ء میں شایع ہوا،

العروۃ الوثقی : قاہرہ سنہ ۱۳۴۶ھ - سنہ ۱۹۲۸ء دیکھو مصطفی عبد الرازق کے
قلم سے لکھی ہوئی حیات جمال الدین کی تاریخ ص ۱ - ۱۴

القضاء و القدر: جمال الدین افغانی - دیکھو مقدمہ مطبوعہ قاہرہ

المنار : مجلدات ۱ ـــ ۲۸

انقلاب ایران: ایڈورڈ براؤن سنہ ۱۹۰۹ء - باب ۱ - انسائیکلوپیڈیا آف
اسلام از گولڈ زیہر مضمون جمال الدین افغانی

(ب) محمد عبدہ سے متعلق

المنار : مجلد ہشتم (۱۹۰۵) تاریخ حیات شیخ محمد عبدہ بقلم رشید رضا

تاریخ : تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، محمد رشید رضا نے تین جلد

میں یہ تاریخ لکھی ہے، دوسرا حصہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، یہ امام
کے مقالات و آثار پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا، اس
میں مرثیے اور تعزیتیں پائی جاتی ہیں، پہلا جز ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا
یہ حصہ امام کی زندگی کی تاریخ پر مشتمل ہے، یہ تمام تاریخ مطبع المنار
قاہرہ میں طبع ہوئی ہے۔

شاہیر: مشاہیر الشرق۔ جزء اول ص ۲۸۱ و ما بعد نیز اس کی روایت
تاریخ الصحافتہ العربیہ میں بھی پائی جاتی ہے ص ۲۸۷ - ۲۹۳

احتفال: امام محمد عبدہ کی یاد میں جو جلسہ کیا گیا تھا، اس میں وہ تقریریں
ہیں جو آپ کے جلسۂ یادگار ۱۱ر جولائی ۱۹۲۲ء میں پیش کی گئیں دیکھو
امام کی زندگی کی تاریخ پر مصطفےٰ عبد الرازق کی تقریر۔ ص ۱۰ - ۲۸
المنار نے یہ خطبہ تئیسویں جلد ص ۵۲۰ - ۵۳۰ میں نقل کیا ہے،

سیاستہ الاسبوعیہ: عدد ۴ جون ۱۹۲۷ء۔ مقالہ بقلم مصطفیٰ عبد الرازق۔
عروۃ الوثقیٰ: قاہرہ ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء ص ۱۵ — ۲۲ تاریخ حیات محمد
عبدہ بقلم مصطفےٰ عبد الرازق۔

مصر کی خفیہ تاریخ: ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ۔ لندن ۱۹۰۷ء نیو یارک ۱۹۲۲ء
مقالات: کرادی واکس

مصر جدید: کرومر

ادب عربی کا عصر مطالعہ: گب۔ لندن انسٹی ٹیوٹ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء اس کے علاوہ گولڈزیہر، ارمان
کیمبری۔ ایچ لامنس مثیل وغیرہ مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(ج) تصنیفات محمد عبدہ

رسالۂ واردات : قاہرہ ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۴ء، دوبارہ تاریخ الاستاذ امام ج ص ۱ - ۲۵ میں شایع ہوا۔

حاشیہ علی شرح الدوانی للعقائد العضدیہ } قاہرہ ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۶ء - دوبارہ قاہرہ میں ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں طبع کیا گیا۔

الرد علی الدہریین اس کو جمال الدین افغانی نے فارسی میں لکھا اور محمد عبدہ نے عربی میں منتقل کیا، پہلی مرتبہ بیروت میں ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۶ء میں شایع ہوئی، دوبارہ ۱۳۱۲ء میں قاہرہ میں اور اس کے بعد کئی مرتبہ شائع ہوئی اور آخری بار ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوئی۔

شرح نہج البلاغہ : اولاً بیروت ۱۳۰۲ھ میں شایع ہوئی اور قاہرہ میں بھی کئی مرتبہ طبع

شرح مقامات بدیع الزمان الہمدانی : بیروت ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء

رسالۃ التوحید : پہلی مرتبہ قاہرہ میں ۱۳۱۵ھ میں دوبارہ رشید رضا کی تعلیقات کے ساتھ ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی اور پانچواں اڈیشن ۱۳۴۶ھ میں طبع ہوا۔

شرح کتاب البصائر النصیریۃ فی علم المنطق } تصنیف قاضی زاہد زین الدین عمر بن سہلان الساوی، پہلی مرتبہ قاہرہ ۱۳۱۶ھ میں محمد عبدہ کی تعلیقات کے ساتھ طبع ہوئی

حاکم شرعیہ کی اصلاح میں بیان : قاہرہ ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۰ء نیز المنار ج ۲ میں بھی شائع ہوا

اسلام اور اس کے } مسلسل مقالات کا ایک سلسلہ جن کو المؤید ۱۹۰۰ء میں

...جینوں کی تردید } میو ہانو کے مقالات کی تردید میں جس کو جنرل دی پاری نے نشر کیا تھا اور جس کو فرانسیسی میں محمد باشا ظلعت حرب نے ترجمہ کیا تھا شایع ہوئے۔

دوبارہ عربی میں محمد عبدہ کے دوسرے مقالات کیساتھ ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوا، اور کئی مرتبہ طبع ہوا اور آخری اڈیشن ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوا۔

...لام والنصرانیۃ مع ...المدینۃ } مقالات کا ایک سلسلہ ہے جو اولاً الاہرام ۱۹۰۱ء میں فرح انطون کے مقالات کی تردید میں ظہور پذیر ہوا، پھر قاہرہ میں ۱۳۲۰ھ میں شایع کیا گیا، تیسرا اڈیشن ۱۳۴۱ھ میں ظاہر ہوا۔

...ص لابن سیدہ : سترہ جلدوں میں ہے، جس کو محمد عبدہ نے شیخ محمد شنقیطی اور دیگر مددگاروں کی مدد میں قاہرہ میں ۱۳۱۶ھ میں شایع کیا،

نیز محمد عبدہ نے جرجانی کی اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز بھی طبع کی۔

...سورۃ الفاتحہ : قاہرہ ۱۳۲۳ھ دوسرا اڈیشن ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوا،

...سورۃ العصر : اولاً المنار میں شایع ہوئی پھر قاہرہ میں ۱۳۲۱ھ میں اور اس کے بعد کئی مرتبہ طبع ہوئی۔

...پارۂ عم : اولاً المنار میں پھر انفرادی طور پر قاہرہ میں ۱۳۲۲ھ نشر کی گئی۔

...القرآن الحکیم : یہ تفسیر المنار سے موسوم ہے۔ محمد عبدہ قرآن کی ایک کامل تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن صرف چوتھی سورت کی ۱۲۵ ویں آیت کی تفسیر تک پہنچے تھے کہ انتقال کر گئے۔

اس کے بعد رشید رضا نے تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا اور سورۂ توبہ (آیت ۹۳ سورہ ۹) تک پہنچے، اس تفسیر کے دس حصے شایع ہوئے، آخری حصہ ۱۳۵۰ھ میں طبع ہوا پہلا جز بھی نومبر ۱۹۲۷ء میں شائع کر دیا گیا۔

محمد عبدہ کی موجودہ تصنیفات کے ساتھ ساتھ محمد رشید رضا کہتے ہیں کہ اور بھی آپ کی بہت سی کتابیں ہیں جو بعد میں طبع نہیں کی گئیں، وہ یہ ہیں وحدۃ الوجود میں ایک رسالہ، تاریخ اسماعیل باشا، فلسفۃ الاجتماع والتاریخ یہ کتاب محاضرات مشتمل ہے جو مقدمہ ابن خلدون کے متعلق مدرسہ دار العلوم میں ۱۸۷۸ء میں دئے جب آپ مدرسہ سے کنارہ کش ہو گئے اور خدیوی نے اپنے دیہات میں رہنا آپ کے لئے ناپسند کیا تو اس دوران میں اس کتاب کا قلمی نسخہ ضایع ہو گیا اس کے علاوہ نظام التربیۃ المصریہ اور تاریخ اسباب الثورۃ العرابیہ آپ کی تصانیف میں سے ہیں، آخر الذکر کتاب کا ایک حصہ تاریخ الاستاذ الامام ج ا ص ۵۹ ا ما بعد میں نشر کیا گیا،

اس کے علاوہ محمد عبدہ کے اور بہت سے مقالات ہیں جو الاہرام، الوقائع المصریہ، العروۃ الوثقیٰ، ثمرات الفنون، المؤید اور المنار میں شائع ہوئے جن میں سے کچھ اقتباسات دوسرے، تیسرے اور چوتھے باب میں ہم نے پیش کئے ہیں، اور ان میں سے اہم مقالات کو رشید رضا نے تاریخ الاستاذ الامام کے دوسرے حصہ میں طبع کیا ہے۔

محمد عبدہ

اور

پان اسلامزم

مرتبہ

حسن الاعظمی (من علماء الازہر مصر)
سابق پروفیسر مصری یونیورسٹی قاہرہ

فاران لمیٹڈ۔ کراچی